جلد اوّل

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ایم۔اے۔، پی۔ایچ۔ڈی

اثراتِ شبلی

(جلد اول)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اثراتِ شبلی

(جلد اول)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ اعظم گڑھ

ASRAT-E-SHIBLI.VOL-1
by: Mohammad Ilyas Azmi
Frist edition Sept. 2022
azmi408@gmail.com
+919838573645
Page: 272. Rs: 400/-

ISBN 978-81-955985-3-3

○ کتاب : اثرات شبلی۔جلد اول
○ مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
○ ناشر : مصنف
○ مطبع : اصیلہ پرنٹرس دہلی

ملنے کے پتے

• مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی۔۶
• دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱

انتساب

ڈاکٹر دبیر احمد

صدر شعبہ اردو مولانا آزاد کالج کولکاتا

کی نذر

ترتیب

اثرات شبلی

•••

دیباچہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق استاد فلسفہ پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] نے اپنی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام (The Preching of Islam) کے دیباچے میں لکھا ہے کہ

> ''میں اپنے پیارے دوست شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کا خاص طور پر احسان مند ہوں جنھوں نے اپنے قدیم اسلامی تاریخ کے خزانہ علم سے متواتر مہربانیوں کے ساتھ ہمیشہ میری مدد فرمائی۔ اگر وہ اپنے اس وسیع علم سے فیاضی کے ساتھ میری مدد نہ کرتے تو اس کتاب کے اکثر حصوں میں جو بیش قیمت واقعات درج ہیں ان سے میں لاعلم رہ جاتا۔''

پروفیسر آرنلڈ کی علمی مدد کا یہ واقعہ علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے قیام علی گڑھ یعنی ابتدائی دور کا ہے۔ اس زمانہ میں یہ دونوں اہل علم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے اور افادہ و استفادہ بھی کیا۔ علامہ فرماتے ہیں۔ ع

آرنلڈ آں کہ رفیق است وہم استاد مرا

پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ نے علامہ شبلی سے اسلامی علوم وفنون کے بارے میں واقفیت حاصل کی اور علامہ شبلی نے ان سے فرنچ زبان سیکھی۔ نیز اسلام کے متعلق یورپ کے خیالات بالخصوص مستشرقین کے افکار ونظریات اور اسلام پر ان کے اعتراضات سے آگاہی حاصل کی۔

ایک آرنلڈ ہی کیا اس دور میں علامہ شبلی نے تصنیف وتالیف کے لئے ایم اے، او، کالج علی گڑھ کے طلبہ کے علاوہ متعدد اہل قلم اور مصنفین کی علمی مدد اور رہنمائی کی۔ ''نظام الملک طوسی''

کے مصنف مولوی عبدالرزاق کان پوری [۱۸۶۲-۱۹۴۸ء] نے اپنی مشہور کتاب ''البرامکہ'' لکھنے میں علامہ شبلی سے مدد لی۔ اوراسی بناپر کتاب کا انتساب علامہ کے نام کیا ہے۔

اسی زمانہ میں علامہ شبلی نے مولوی سید امجد علی اشہری کو میر انیس کی سوانح لکھنے میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ پھر جیسے جیسے علامہ شبلی کی علمی وادبی سرگرمیاں بڑھتی گئیں، اہل علم کے تعاون کا ان کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا گیا۔ پہلے علی گڑھ، پھر حیدرآباد اور آخر میں ندوۃ العلما میں خاص طور پر انھوں نے طلبہ کی علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے لئے تربیت اور رہنمائی کی۔ حتیٰ کے مواد کی فراہمی کا کام بھی انجام دیا۔ طلبہ ہی نہیں بعض معاصرین اور بزرگوں کے ساتھ بھی ان کا یہ علمی رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں [۱۸۶۶-۱۹۳۶ء] کی بھی کتاب لکھنے میں علامہ نے تعاون کیا۔ اس کا ذکر خود نواب صاحب نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اسی طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ [۱۹۱۳-۱۹۹۹ء] کے والد مولانا سید عبدالحی حسنیؒ [م: ۱۹۲۳ء] کی مشہور زمانہ کتاب ''نـزهة الخـواطـر'' لکھنے میں ان کے صائب مشورے کا دخل ہے۔ علاوہ ازیں علامہ اقبال سے خواجہ سید رشید الدین مودودی تک نہ جانے کتنے مصنّفین کی زبان کی انہوں نے اصلاح کی۔ غرض متعدد کتب ورسائل اور مختلف علوم وفنون کی کتب کی ترتیب وتدوین اور اشاعت میں انہوں نے اہل قلم کے تعاون کے ذریعہ تصنیف وتالیف کے فن کے فروغ میں عدیم النظیر کارنامہ انجام دیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے فیض تربیت سے ملک میں متعدد اہل علم، ادیب و انشاپرداز اور محقق ومصنف کے بلند رتبے پر فائز ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دور کا آسمان علم وادب علامہ مرحوم کی بدولت منور ہے۔

علامہ شبلی کی اس منفرد کاوش کا ذکر واعتراف بے شمار اہل قلم نے اپنی کتابوں، دیباچوں، مقدموں اور مکاتیب میں کیا ہے۔ راقم کو ''شبلی: خودنوشتوں میں'' کے زمانہ تصنیف میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اثرات شبلی کا ایک نیا مرقع سامنے آسکتا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ زیرنظر کتاب میں اس نوع کے نہایت اہم واقعات آگئے ہیں۔ ان میں بہت سی باتیں ضخیم حیات شبلی میں اضافہ ہیں۔

علامہ شبلی کی علمی زندگی کا یہ محض ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ وہ ہے جو ''المامون'' کے دیباچہ

میں سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے مقدمہ سے سامنے آتا ہے۔اس سلسلہ کا آغاز سرسید کے اس دیباچہ سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۸۸۹ء میں ''المامون'' کے دوسرے اڈیشن پر لکھا ہے اور جس میں علامہ شبلی کی مورخانہ بصیرت، کمال تاریخ نویسی، اسلوب نگارش کی انہوں نے ایسی تحسین وستائش کی ہے کہ ہماری ادبی تاریخ میں اس کی دوسری مثال شاید ہی آپ کو ملے۔اس نوع کے مقدموں اور دیباچوں کے متنوع مباحث اس کتاب میں آگئے ہیں، جن میں کارنامہ شبلی کی داد وتحسین ہے۔ان احوال وواقعات کا احاطہ اگرچہ نہایت مشکل اور صبر آزما کام تھا، تاہم راقم الحروف نے تلاش وتفحص کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور بلا مبالغہ مختلف موضوعات کی سیکڑوں کتابوں سے یہ مرقع تیار کیا ہے۔

علامہ شبلی سے متعلق اس کتاب میں جن اندراجات کا جائزہ شامل ہے، ان کا تعلق علم و ادب کے مختلف موضوعات سے ہے۔تعجب ہوتا ہے کہ گذشتہ صدی میں علامہ شبلی کی علمی وادبی اور تاریخی تصانیف اور ان کی فکر ونظر کا جادو کس کس کے سر چڑھ کر بولا اور اس کے کیسے کیسے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔اس کے بہت سے اہم اور نادر واقعات اس کتاب میں آگئے ہیں۔مولانا عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر ظفر حسین خاں کا موضوع فلسفہ تھا۔علامہ شبلی سے دونوں کس طرح اور کس درجہ متاثر ہوئے اور پھر کیسے کیسے نمایاں کارنامے انجام دئے، اس کی ایک جھلک بھی اس کتاب میں آگئی ہے۔

جن اہل قلم کے دیباچوں کا اقتباس یا انتخاب کیا گیا ہے، ان کا اور ان کی کتابوں کا اختصار سے تعارف بھی کرایا گیا ہے۔اس سے اس تصنیف میں یہ بڑی اہم خوبی پیدا ہوگئی ہے کہ ذکر شبلی کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی چند بہترین کتابوں اور ان کے مصنفین کا تعارف بھی ان اوراق میں آگیا ہے۔

یہ کتاب دراصل علامہ شبلی کے ان اثرات کی داستان ہے جن کا ذکر مصنفین کے نوک قلم پر آگیا ہے۔ابھی ان افکار وخیالات اور اثرات شبلی کا مطالعہ بہر حال باقی ہے جن کا تعلق فکر ونظر کے مستعار لینے سے ہے۔علامہ شبلی کے بعد کے اہل قلم، مصنفین اور دانشوروں کی جو نسل میدان علم وادب میں سرگرم ہوئی اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ علم وادب کی خدمات انجام دیں اس میں

ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جس نے علامہ شبلی کے اثرات قبول کئے اور ان کے افکار کی توسیع و ترویج اور اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔

بعض لوگوں نے علامہ شبلی کو ہندوستان کا شیخ محمد عبدہ لکھا ہے۔ پان اسلام ازم کا نمائندہ تو عام طور پر قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح علامہ شبلی کے بعد وجود میں آنے والی بعض مذہبی و سیاسی جماعتیں جمعیۃ علما، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت وغیرہ کے بعض افکار و خیالات بالخصوص ان کے سیاسی نظریات علامہ شبلی ہی سے مستعار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے تلامذہ و منتسبین بالخصوص علی برادران، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی وغیرہ پر علامہ شبلی کے جو تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی اثرات مرتب ہوئے، ان کا جائزہ عہد حاضر کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اختصار سے ان کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ اثرات شبلی کے اس مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ شبلی جیسے مصلح و مفکر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں ان کے اثرات جریدۂ عالم پر ثبت رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب علامہ شبلی اور فکر شبلی کی تفہیم کے ساتھ ساتھ جہان شبلی کی وسعت و شوکت سے بھی قدردانان شبلی کو آشنا کرے گی۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے اور کل ۲۰۹ شخصیات کے دیباچوں اور مقدموں کا مطالعہ و جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں ۱۰۵ اور دوسری جلد میں ۱۰۴ شخصیات کے مقدمات کے حوالہ سے بحث و تحقیق ہے۔ علامہ شبلی سے معاندانہ رویہ رکھنے والے اہل قلم کے دیباچوں کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ اس سلسلہ کے مشاہیر منشی محمد امین زبیری [۱۸۷۰ - ۱۹۵۸ء] اور بابائے اردو مولوی عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] کے مقدمات نے ایک زمانہ میں شبلی شکنی میں بڑی شہرت حاصل کی تھی اور چونکہ اس زمانہ میں تلامذہ شبلی نے ان سے معرکہ آرائی بوجوہ مناسب خیال نہیں کی اور ان کے جوابات نہیں دیئے، اس لئے بعض لوگوں کو وہ ناقابل تردید معلوم ہونے لگے تھے۔ اب ایک صدی بعد ان کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کر دیا گیا ہے۔ بلکہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ان تمام دیباچوں کا مطالعہ و جائزہ اس کتاب میں آ گیا ہے، جس میں انہوں نے علامہ شبلی کی تنقید یا تنقیص کی تھی۔

علاوہ ازیں علامہ شبلی کے بعض احباب بالخصوص تلامذہ کے دیباچوں سے افکار و اثرات

شبلی کے متعدد اہم اور نئے مباحث سامنے آتے ہیں، جن کا ذکر شاید کہیں اور نہ ملے۔ ان سے علامہ شبلی کے مستقبل کے بعض علمی منصوبوں کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ عصر حاضر میں ان کی معنویت پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے، جس سے علامہ شبلی کے بلند مقام تحقیق وتدقیق کی حیثیت بھی سامنے آجاتی ہے۔ اردو کے تمام ممتاز نقاد چاہے وہ تاثراتی تنقید کے نقاد ہوں یا جمالیاتی، عملی، یا نظری تنقید کے نقاد ہوں، اس کتاب میں ان سب کے خیالات کی ایک کہکشاں آپ کو دکھائی دے گی۔ اس سے یہ تحقیقی مقالہ نہ صرف اثرات شبلی بلکہ افکار شبلی کی بھی ایک کتاب ہوگیا ہے۔

علامہ شبلی کا ایک بڑا عظیم الشان کارنامہ انجمن ترقی اردو کی تاسیسی خدمت ہے۔ ناچیز نے ''علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو'' کے عنوان سے ایک مفصل کتاب لکھی ہے جسے مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا نے ۲۰۲۱ء میں شائع کیا ہے۔ جو میرے نہایت مخلص کرم فرما اور اردو کے ایک بڑے خدمت گذار ڈاکٹر دبیر احمد صاحب صدر شعبہ اردو مولانا آزاد کالج کولکاتا کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ ''اثرات شبلی'' ان کے نام معنون کرتے ہوئے خوشی محسوس ہورہی ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اس کتاب کی تالیف وتصنیف میں میرے بچوں خاص طور پر محمد علی عادل نے جو بی ایس سی (میتھ) تھرڈ ایر کا طالب علم ہے، بڑی سعادت مندی سے ذاتی کتب خانہ سے کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر فراہم کرتا رہا۔ میں اس کے اور اس کے تمام بھائی بہنوں کے روشن مستقبل کے لئے خاص طور پر دعا گو ہوں۔ اللہ تعالی قبول فرمائے۔

ناچیز
محمد الیاس الاعظمی
ادبی دائرہ اعظم گڑھ

۲۰/اگست ۲۰۲۲ء

اثرات شبلی

اردو کے عناصر اربعہ میں سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] پہلے شخص ہیں جنھوں نے علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی تصنیفی میدان میں سرپرستی کی۔ اور ایم اے او کالج علی گڑھ کی جانب سے ان کی کتابیں شائع کیں اوران پر حوصلہ افزا ریویو اور مقدمے لکھے۔ اس لئے اثرات شبلی کا آغاز انھی کے ذکر سے کیا جاتا ہے۔

---

(۱)

سرسید احمد خاں

[۱۸۱۷-۱۸۹۸ء]

سرسید احمد خاں کی حیثیت علامہ شبلی کے ایک بڑے محسن اور مربی کی ہے۔ انھوں نے اولاً علامہ شبلی کے ذوق علم ومطالعہ کی آبیاری کی۔ اپنے قیمتی کتب خانہ سے استفادہ کی عام اجازت دی۔ علامہ شبلی کا علی گڑھ میں تقرر عربی وفارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ہوا تھا، مگر سرسید نے کالج میں ان سے درس قرآن کا سلسلہ شروع کرایا۔ علامہ شبلی کا پہلا مقالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' انھیں سرسید نے لکھوایا اوراس کی اپنے احباب سے تحسین وستائش کی اور اسے مدرسۃ العلوم کی طرف سے شائع کیا۔ ان کے تاریخی مقالات کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ وغیرہ کے سرسید بے حد مداح تھے۔ اور سرسید نے جب صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی قائم کیا تو علامہ شبلی کے ان مقالات کواس سلسلہ میں شامل کیا۔ المامون کو انھوں نے ۱۸۸۷ء میں مدرسۃ العلوم کی طرف سے

شائع کیا اور اس کے دوسرے ایڈیشن پر ایسا شاندار اور وقیع مقدمہ لکھا اور اپنے سے چالیس سال چھوٹے شخص یعنی علامہ شبلی کی ایسی تحسین وستائش کی کہ ہمارے ذخیرہ ادب میں اس کی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔ یہاں اس مقدمے کے تین مختصر اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جس سے المامون کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ المامون میں علامہ شبلی نے حوالوں کا کس درجہ اہتمام کیا ہے، اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس کا حوالہ معتبر مآخذ سے نہ دیا ہو، ہر ایک جزئی بات پر بھی اس کتاب کا جس سے وہ بات لی گئی ہے حوالہ دیا ہے۔ اس کے حاشیوں پر جس قدر حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے ہزاروں ورق الٹنے پڑے ہوں گے۔'' (المامون دیباچہ ص ۳)

دوسری جگہ علامہ شبلی کی مورخانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے لائق مصنف نے اس بات کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بھی بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے جو خوب صورت ہے خوب صورت ہے۔ جو بھونڈی ہے بھونڈی۔ نہ خوب صورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا اور نہ بھونڈے پن کو بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔'' (ایضاً ص ۲)

زبان وبیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف وشستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔'' (المامون دیباچہ ص ۳)

علامہ شبلی اور الفاروق پر سبقت کی غرض سے قاضی سراج الدین نے سیرۃ الفاروق لکھی اور شائع کیا تو سرسید نے اسے ناپسندیدہ طرز عمل قرار دیا اور اس کے خلاف ایک تحریر لکھی، جس میں اور باتوں کے سوا یہ بات بھی لکھی ہے کہ

”اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے، المامون، سیرۃ النعمان، کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں، اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہیں کہ ”فأتو بسورة من مثله“ تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔ جزیہ کا ایسا بے جا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آج تک کسی نے ایسی عمدگی سے حل نہیں کیا تھا، ان جره الاعلى الله بایں ہمہ انہوں نے مثل علمائے متقدمین باخدا الذین لا ینظرون الی الدنیا و حطامها بل ینظرون الی رحمة الله و برکاته و الی حالة القوم و اصلاحها، کوئی ذاتی فائدہ ان کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا بلکہ بالکلیہ مدرسۃ العلوم کو دے دیا اور جب ان کی حالت معاش پر نظر کی جاوے تو ان کی یہ فیاضی بھی بہت زیادہ اور اعلیٰ درجہ کی باوقعت ہو جاتی ہے، ذالک فضل الله یؤتیه من یشاء اور جب ایسے شخص نے جو کیا بحیثیت علم اور کیا بلحاظ عمدگی تالیف اور کیا بہ نظر طریقۂ ترتیب مضامین میں یادگار سلف ہے الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور بہت کچھ اس کا سامان بھی جمع کیا تھا، جس کا جمع کرنا نہ آسان کام ہے، نہ ہر ایک شخص کا کام ہے، ہنوز بہت کچھ جمع کرنا باقی ہے، تو ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب کو بلاشبہ مناسب نہ تھا کہ اسی مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے، بلکہ اس رحمت کے منتظر رہتے جو خدا کو مولوی شبلی کے ہاتھ سے ملک کو پہنچانی تھی۔

ہیروز آف اسلام میں حضرت عمرؓ کی لائف کا لکھنا ایک بہت بڑا نازک کام ہے، ممکن ہے کہ ان کی لائف اس طرح لکھی جاوے جو انسانوں کے لیے باعث رحمت ہو، یا اس طرح پر لکھی جاوے کہ باعث آفت ہو، یا اس طرح پر پوری لکھی جاوے کہ دونوں فریق سنی و شیعہ کو بہ جز گمراہی کے اور کچھ حاصل نہ ہو۔

سب سے مقدم یہ بات ہے کہ اول اس کا لکھنے والا شیعہ اور سنی دونوں مذہبوں کی قید سے اپنے تئیں آزاد سمجھے اور سچا ہسٹورین بن کر ان کی لائف لکھے یا

یہ کرے کہ ان امور کو جو دونوں فریق میں متنازعہ فیہ ہیں مطلق نہ چھیڑے اور ان واقعات اور حالات کو اور ان کی اس خصلت و انتظامی قوت کو اور اس برکت کو لکھے جو ان کے زمانہ خلافت میں اسلامی دنیا کو پہنچی جن سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔

مشکل یہ ہے کہ کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہے کہ اس کے ہر ایک فعل کو دو پہلو نیک اور بد سے تعبیر نہ کیا جاسکے، یہ مشکل اس وقت زیادہ ہو جاتی ہے جب کہ کسی اکابر دین کی جیسے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں، لائف لکھی جاوے، پس حضرت عمرؓ کا لائف لکھنا ایسا آسان کام نہیں تھا، جیسا کہ ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب نے سمجھا، مگر ہم کو افسوس ہوتا ہے، جب بھلائی کا وہ خیال ظاہر کرتے ہیں بیشک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے غلطی کی جو کام ان کو نہ کرنا چاہئے تھا انہوں نے کیا بلکہ وہ کام ان کے قابو سے باہر تھا، بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے مخدوم وحید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر ہے، مگر کسی بدنیتی یا طمع نفسانی کا الزام جو لوگ منشی سراج الدین احمد کی نسبت لگاتے ہیں، نہ ہم اس کو پسند کرتے ہیں اور نہ درست سمجھتے ہیں، فرض کرو کہ ایک مضمون پر ایک شخص نے کتاب کا ارادہ کیا، اس مضمون پر دوسرے شخص نے بھی کتاب لکھی، اس میں نقصان کیا ہوا، بلکہ جب دونوں کتابیں موجود ہوں گی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا اور یہ صادق آوے گا، **فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الأخر** یہ سمجھنا کہ منشی سراج الدین کے سیرۃ الفاروق تحریر کرنے سے مولوی شبلی بے دل ہو گئے ہیں، اب نہ وہ ہیروز آف اسلام لکھیں گے اور نہ الفاروق، محض غلط خیال ہے، اگر اہل ملک مولوی شبلی کی تصانیف کو سمجھتے ہوں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی، بس ان کو کیا پرواہ ہے کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہے۔

مگر ہم مولوی شبلی کی اس رائے کو کہ بزرگان دین کو بھی ہیروز آف اسلام میں داخل کر کے ان کی لائف لکھیں، ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ ان سے

متفق ہیں، وہ لوگ فادر آف اسلام ہیں، نہ ہیروز آف اسلام اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں، ہم مولوی شبلی سے اصرار کر رہے ہیں کہ اپنا سفر نامہ ختم کرنے کے بعد ''الغزالی'' یعنی لائف امام غزالی کی لکھ دیں، جو نہایت دلچسپ اور بے حد مفید ہوگی، خدا ان کو توفیق دے کہ ہماری بات کو مانیں، اس کے بعد جو خدا کو منظور ہو وہ کریں لیکن اگر اس کے بھی انہوں نے الفاروق لکھی تو ہم اس وقت ان کو کہیں گے جو کہیں گے۔'' (حیات شبلی ۲۶۴-۲۶۶)

دراصل سر سید کی ذات گرامی سے محض علامہ شبلی ہی متاثر نہ تھے بلکہ خود علامہ شبلی کے علم و فضل اور ان کے تصنیفی کارناموں سے سر سید احمد خاں بھی بہت متاثر ہوئے۔ افادہ و استفادہ کی یہ داستانیں ہمارے دور میں مفقود ہیں۔

---

(۲)

عزیزؔ لکھنوی

[۱۸۳۷-۱۹۱۵ء]

خواجہ عزیز الدین عزیزؔ لکھنوی سابق پروفیسر کیننگ کالج لکھنو اردو و فارسی کے نہایت اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ مثنوی قیصر نامہ اور کلیات عزیز ان کی دو مشہور کاوشیں اور یادگاریں ہیں۔ علامہ شبلی سے ان کے بڑے گہرے اور مخلصانہ مراسم تھے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''مولانا کو ان کی خدمت میں عزیزانہ نیاز حاصل تھا۔ فارسی مذاق کی یک جہتی دونوں میں رشتہ اتحاد تھا۔ اکثر مولانا شبلی ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے گھر قیام بھی کرتے۔ مکاتیب شبلی میں خواجہ صاحب کا اکثر خطوں میں ذکر ہے۔'' (مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۳۲۷)

کلیات عزیز کا مقدمہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۴-۱۹۵۰ء] کے قلم سے ہے۔ انہوں نے اور باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ

''لکھنو کی سبزی منڈی میں خواجہ صاحب کی بارہ دری گویا خیابان شیراز تھی۔

انسان وہاں پہنچتا تو حافظ وسعدی کے کمال کی مہک پاتا۔رونق دوبالا ہوجاتی جب علامہ شبلی بھی وہاں ہوتے۔'' (کلیات عزیز،مقدمہ،ص:۲)

دونوں کے درمیان اس قدر گہرے مراسم تھے کہ ایک بار سید ظفر الملک علوی نے ماہنامہ الناظر لکھنو میں علامہ شبلی کو ان کا شاگرد لکھ دیا تھا،مگر علامہ شبلی نے اس کی تردید کی ہے۔

مولانا شروانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عزیز لکھنوی کے ''احباب کا دائرہ وسیع تھا۔مخصوص احباب پر دل سے فدا تھے۔علامہ شبلی کی وفات کے بعد پہلی ملاقات میں جب مرحوم کا ذکر مجھ سے فرمایا تو بایں ہمہ تمکیں آواز گلوگیر تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری۔(ایضاً،ص:۳)

---

(۳)

نواب محسن الملک

[۱۸۳۷-۱۹۰۷ء]

نواب محسن الملک اگرچہ عمر میں علامہ شبلی نعمانی سے بیس سال بڑے تھے،لیکن دونوں کے درمیان بڑے گہرے اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔اور کمال یہ ہے کہ تمام سرد وگرم کے باوجود ہمیشہ قائم رہے۔نواب صاحب نے علامہ شبلی کی بڑی دلجوئی کی۔وہ بیمار ہوئے تو چاہے وہ لکھنو رہے ہوں یا اعظم گڑھ عیادت کے لئے آئے۔انگریزوں سے بدگمانی ہوئی تو اسے بھی نواب محسن الملک ہی نے دور کیا۔دونوں کے وسیع تعلقات پر ناچیز نے ایک تفصیلی مقالہ لکھا ہے جو پہلے ماہنامہ معارف میں شائع ہوا۔اور اب ناچیز کے مجموعہ مقالات ''نقوش شبلی'' میں شامل ہے۔اسے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔البتہ یہاں موضوع کی مناسبت سے علامہ شبلی کے بارے میں نواب محسن الملک کے تاثرات نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۸۹۴ء میں علامہ شبلی کو شمس العلما کا خطاب ملا۔چنانچہ مبارکباد اور تہنیت کے لئے ایم اے او کالج علی گڑھ میں جلسہ منعقد ہوا،جس میں کالج کے تمام سربرآوردہ اشخاص سرسید احمد خاں،سید محمود،نواب محسن الملک،مولانا حالی،نواب مزمل اللہ خاں،پروفیسر آرنلڈ،جسٹس کرامت

حسین وغیرہ نے شرکت کی ۔اس جلسہ کی صدارت نواب محسن الملک نے فرمائی ۔ان کی صدارتی تقریر اور جلسہ کی کارروائی انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے ۔ مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴ - ۱۹۵۳ء] نے اسے ''حیات شبلی'' میں نقل کیا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ دونوں کے درمیان انتہائی گہرے دوستانہ اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔یہ خطبہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں علامہ شبلی کے بارے میں کالج کے سب سے بڑے محسن کے کیا خیالات تھے ۔نواب محسن الملک نے اپنی صدارتی تقریر کے آغاز میں کہا کہ

> ''صاحبو!اس وقت اس جلسہ میں دو قسم کے لوگ شریک ہیں ۔ایک طالب علم جن کو مولانا شبلی صاحب سے شاگردی کا فخر حاصل ہے ۔دوسرے اور احباب جن کو مولوی صاحب موصوف کی دوستی کی عزت حاصل ہے ۔ میں اگرچہ بہ ظاہر دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوں مگر اے صاحبو!در حقیقت میں پہلے طبقہ میں داخل ہوں.........عزیزو! مولانا شبلی صاحب صرف تمہارے ہی استاد نہیں ہیں بلکہ در حقیقت مجھ پر بھی ان کو استادی کا حق ہے۔اگر تم نے چند قاعدے صرف ونحو کے ان سے سیکھے یا چند ابتدائی کتابیں ان سے پڑھی ہیں تو میں نے ان کی تصنیف و تالیف اور تقریر وتحریر سے بڑے فائدے حاصل کیے ہیں۔کوئی روز ایسا نہیں ہوتا کہ ان کی صحبت سے کسی نہ کسی قسم کا علمی فائدہ مجھے نہ ہوتا ہو۔یا ان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ میری معلومات میں ترقی نہ ہوتی ہو۔اس لئے اے میرے عزیز طالب علمو! نہ صرف بہ حیثیت ایک دوست ہونے کے بلکہ بحیثیت ایک طالب علم ہونے کے میں اس جلسہ میں شریک ہوا ہوں اور میں مولانا شبلی صاحب کو اس معزز خطاب کے پانے پر جو گورنمنٹ نے ان کو دیا ہے، مبارک باد دیتا ہوں۔''
>
> (حیات شبلی، ص: ۲۶۹-۲۷۰)

بعد ازاں نواب صاحب نے علامہ شبلی کو شمس العلما کا خطاب ملنے پر پہلے حکومت کو، پھر کالج کو اور آخر میں قوم کو مبارک باد پیش کی ۔ان کا خیال تھا کہ

''مولانا کو مبارک باد دینا تو ایک امر رسمی اور صرف رسم ظاہری کی تکمیل ہے۔ وہ فی ذاتہ ہمیشہ سے علم کے آفتاب تھے اور گورنمنٹ ان کو خطاب دیتی یا نہ دیتی وہ سب کے نزدیک شمس العلما تھے۔'' (حیات شبلی، ص: ۲۷۰)

علامہ شبلی کی ذاتی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''صاحبو! مولانا شبلی صاحب کی ذاتی خوبیوں اور ان کے علمی کمالات کا ذکر کرنا فضول ہے جن کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہے وہ ان کے ان صفات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو خدا نے کوٹ کوٹ کر ان میں بھر دیئے ہیں۔''

(حیات شبلی، ص: ۲۷۰-۲۷۱)

پھر نواب صاحب نے علامہ شبلی کے علم و فضل، ان کی تصنیفات و تالیفات کی عظمت، علوئے مقام و مرتبہ اور عظیم الشان خدمات کا تذکرہ تفصیل سے کیا اور کہا کہ

''جن کو ان کی تالیفات و تصنیفات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نظر کیسی غائر اور ان کا علم کیسا وسیع، ان کے خیالات کیسے بلند، ان کا ذہن کیسا تیز، ان کی تحریر کیسی پر زور، ان کا بیان کیسا صاف اور ان کی تحقیق کیسی عالمانہ ہے، وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اپنی تالیفات میں فصاحت بیان اور سلاست عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ، استعارہ اور عبارت آرائی اور تصنع کے بغیر بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا۔ اور واقعات تاریخی کے تحقیق کرنے اور محققانہ طور پر واقعات اور معاملات پر رائے دینے اور نتائج کے اسباب بیان کرنے اور اخبار و روایات کے صدق و کذب کے دریافت کرنے کا راستہ بتایا اور ایسے زمانہ میں جب کہ ہماری قوم کا مذاق بگڑا ہوا ہے اور ایسے وقت میں جب کہ سوائے افسانوں اور ناولوں کے کسی اور قسم کی کتابوں کی قدر نہیں ہے، ہمارے مولانا منجملہ ان دو تین مصنفین کے ہیں جن کی تالیفات کی نہایت قدر کی

گئی اور جن کو قوم نے نہایت شوق سے دیکھا اور جس سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور جس نے ان کے دلوں میں ایک نیا مذاق پیدا کیا اور جس نے مشاہیر روزگار کے حالات زندگی کے لکھنے کا طریقہ اور اس کا مقصد بتایا اور ہمارے مردہ لٹریچر میں بلکہ ہمارے مردہ خیالات میں ایک نئی جان ڈال دی۔
فللہ درہ وعفی اللہ اجرہ . (حیات شبلی،ص:۲۷۱)

علامہ شبلی نے اپنی تصنیفات مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون اور سیرۃ النعمان کے علاوہ علی گڑھ میں محققانہ تاریخی مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کے تحت انہوں نے الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الذمیین وغیرہ تحقیقی مقالات لکھے تھے۔اس تاریخی سلسلہ نے بے حد مقبولیت پائی۔سرسید بھی ان تحقیقات کے بے حد مداح تھے۔ چنانچہ انہوں نے تصحیح اغلاط تاریخی کا ایک صیغہ قائم کر کے علامہ شبلی کو اس کا سکریٹری مقرر کیا اور ان کے تاریخی مقالات اس میں شامل کئے۔(حیات شبلی،ص:۲۰۶) نواب محسن الملک بھی ان تحقیقات کے بے حد مداح تھے اور انہیں خدائے ذوالجلال کی رضامندی کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔وہ فرماتے ہیں:

”صاحبو! ہمارے دوست مولانا شبلی صاحب نے نہ صرف ہم مسلمانوں پر اپنی عمدہ تالیفات سے احسان کیا ہے بلکہ درحقیقت اسلام بھی ان کا ممنون ہے اور خدائے ذوالجلال کی رضامندی حاصل کرنے کا بھی انہوں نے نہایت عمدہ کام کیا ہے۔ ان چند اعتراضوں کا دور کرنا جو مذہب اسلام کے مخالف ہمارے مذہب پر کرتے تھے اور جن سے ہمارا مذہب، انسانیت، انصاف، علم اور تہذیب کے مخالف خیال کیا جاتا تھا، وہ جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ کا جلانا تھا کہ برسوں سے یہ الزام ہم پر لگایا جاتا ہے اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، لوگوں نے جزیہ کو کفر کا ٹیکس قرار دے رکھا تھا اور اسکندریہ کے کتب خانہ کو جلانے سے پیشوایانِ اسلام کو علم کا دشمن مشہور کر دیا تھا۔اس ذی ہمت، عالی دماغ محقق نے جو مدرسۃ العلوم کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا، حکیمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ان دونوں چیزوں کی حقیقت ظاہر کرنے میں اپنی تحقیق کی ایک عجیب خداداد قوت ظاہر کی اور چند

اوراق کے لکھنے اور مشتہر کرنے سے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا اور یورپ کے بڑے بڑے محققوں کی آنکھوں پر سے غلطی کا پردہ اٹھا دیا اور ان دونوں اعتراضوں کو اس خوبی سے مذہب اسلام پر سے دور کر دیا کہ تمام دنیا حیران رہ گئی۔ حقیقت میں یہ کام ہمارے مولانا نے ایسا کیا ہے کہ خود اسلام اس کی داد دیتا ہے اور خدا اس پر آفریں کرتا ہے۔'' (حیات شبلی، ص:۲۷۱-۲۷۲)

علامہ شبلی کی مذکورہ علمی تحقیقات کو نواب صاحب ان کی فضیلت اور شمس العلما ہونے کے لئے کافی قرار دیتے ہیں:

''میرے نزدیک صرف وہ چند صفحے جو میرے معزز دوست نے جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ پر لکھے ہیں، ایسے ہیں کہ اگر کوئی کام مسلمانوں کے فائدہ کا انہوں نے نہ کیا ہوتا اور سوائے ان کے کوئی دوسری تحریر ان کی نہ ہوتی تو وہی چند صفحے ان کی فضیلت، لیاقت اور علم پر شاہد اور مسلمانوں کے فخر اور عزت کے لئے کافی اور ان کے شمس العلما ہونے کے شاہد تھے۔'' (حیات شبلی، ص:۲۷۲)

نواب محسن الملک کے ان خیالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ علامہ شبلی نعمانی سے کس درجہ متاثر تھے۔

---

(۴)

حکیم بدرالدین دہلوی

[۱۸۴۰-۱۹۱۳ء]

حکیم بدرالدین خاں دہلوی کا شمار نامور اطبا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے امتحان الاطبا لکافتہ الاطبا کا بدرالدجیٰ کے نام سے ترجمہ کیا جو مئی ۱۹۰۰ء میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ امتحان الاطبا ۶۸۸ ہجری سے قبل کی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف عبدالعزیز بن علی متطبب ہیں۔ اس کا مخطوطہ حکیم بدرالدین دہلوی کو ان کے استاذ حکیم احسن اللہ دہلوی سے ملا تھا اور ناقص الآخر تھا۔ اس پر

سلاطین مغلیہ کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ گویا یہ مخطوطہ شاہی کتب خانہ میں رہ چکا تھا۔ اس کی تکمیل کے لئے انھوں نے اہل علم سے رجوع کیا۔ ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں اشتہارات دیئے، مگر دوسرے نسخے کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اس کے بعد ان کی دہلی میں علامہ شبلی سے ملاقات ہوئی۔ چنانچہ اس مخطوطہ سلسلہ میں ان سے گفتگو ہوئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

"اتفاقاً جناب شمس العلما مولوی شبلی صاحب نعمانی ...... کسی تقریب میں دہلی آئے۔ میں نے ان سے کتاب مذکور کا تذکرہ کیا۔ مولوی صاحب موصوف نے باوجود وسعت نظر اور غیر محدود واقفیت کے کتاب سے اپنی عدم واقفیت ظاہر فرمائی۔ ہاں اس کے ساتھ وعدہ فرمایا اگر کہیں نگاہ پڑی تو ضرور اطلاع دوں گا۔ اس کے چند دن بعد مولوی صاحب کو سفر بیروت و مصر و قسطنطنیہ درپیش ہوا اور وہاں ان کے علم و فضل نے کتابوں کی سیر کرائی۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ خدیو (مصر) کے کتب خانے میں انھوں نے دیکھا اور اپنی یادداشت کے لئے کتب خانے کے کمرے اور الماری، کتاب کے نمبر .... پاکٹ بک میں نوٹ کر لئے .... جب وہ مع الخیر ہندوستان واپس آئے تو یہ نوید مجھے سنائی اور نمبر مجھے بھیج دیئے۔ میں نے ان نمبروں کے ذریعہ مہتمم کتب خانہ خدیو سے تحریرات کا سلسلہ جاری کیا۔ .... غرض میری یہ سعی بھی مشکور نہ ہوئی۔ میں نے مکرر شمس العلما موصوف کو تکلیف دی۔ انھوں نے اپنی علم دوستی و اخلاق عمیم سے مزید تکلیف گوارا کر کے اپنے توسط سے میری کتاب مصر بھجوادی اور مسمی جرجی زیدان کسی اپنے دوست فاضل یورپین کی معرفت کتب خانہ خدیو کے نسخے سے اس کے گم شدہ اوراق کو بہ احتیاط نقل و مقابلہ معرفت احمد ابراہیم کرا کے مجھے چند روز میں واپس منگادی۔"

(امتحان الاطبا لکافتہ الاطباء، ص: ٣٠٦، بحوالہ اسلام اور عصر جدید شبلی نمبر، ص: ٢٠)

اس سے علامہ شبلی کی علم دوستی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے طلبہ کی علمی رہنمائی کرتے رہتے تھے بلکہ ملک کے دوسرے اہل علم و قلم کا بھی علمی تعاون کرنے سے گریز نہیں

کرتے تھے۔اور یہ بھی کہ ان کاموں کے لئے اہل علم کی نگاہیں انہی کی طرف اٹھتی تھیں۔

---

(۵)

نواب وقار الملک

[۱۸۴۱-۱۹۱۷ء]

نواب وقار الملک علی گڑھ تحریک کے چند بنیادی لوگوں میں سے ایک ہیں۔علامہ شبلی سے گہرے مراسم تھے۔خط وکتابت بھی رہی۔مکتوبات شبلی میں ان کے نام چند خطوط شامل ہیں۔ مکتوب الیہ کی حیثیت سے ناچیز نے اپنی کتاب ''شبلی کے مکتوب الیہ'' میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ البتہ دونوں میں نظریاتی اختلاف تھا۔نواب صاحب مسلم لیگ کے بانیوں میں ہیں اور علامہ شبلی مخالفین میں۔ایک موقع ایسا بھی آیا تھا کہ دونوں نے ایک دوسرے کی مخالفت بھی کی۔لیکن ہمارے بزرگ اس قدر اعلیٰ ظرف تھے کہ ان باتوں کا اثر ذاتی تعلقات پر نہیں پڑتا تھا۔چنانچہ اس کے بعد نواب صاحب نے اپنے بیٹے یا پوتے کو ندوہ میں داخل کیا اور اس کی تمام تر ذمہ داری علامہ کو سونپی۔اس سلسلہ میں جو خط وکتابت ہوئی ہے وہ مکتوبات شبلی میں محفوظ ہے۔

نواب صاحب نے علی گڑھ کے گل سرسبد مولوی عزیز مرزا جو علی گڑھ کالج کے پہلے بیچ کے طالب علم تھے اور بعد میں حیدرآباد میں سیشن جج ہوئے،ان کے علمی وادبی مضامین کے مجموعہ ''خیالات عزیز'' مرتبہ منشی دیانرائن نگم پر مقدمہ لکھا ہے۔اور واقعہ یہ ہے کہ بڑا شاندار مقدمہ ہے۔ اس میں مولوی عزیز مرزا کی شخصیت اور کل خدمات کا ذکر آ گیا ہے۔اس میں ایک مقام پر علامہ شبلی نعمانی کا بھی ذکر آیا ہے۔اس کا یہاں ذکر ضروری معلوم ہوا۔انہوں نے لکھا ہے کہ'' مولوی (عزیز مرزا) صاحب نے علوم شرقیہ کی تعلیم کا ایک نصاب سرکاری طور پر شمس العلما مولانا شبلی نعمانی سے مرتب کرایا اور اس پر غور کرنے کے لئے ایک ایسی زبردست کمیٹی قائم کی،جس میں ہندوستان کے منتخب صاحبان علم وفضل شریک تھے اور طے ہو گیا تھا کہ مدرسہ دارالعلوم کی حیثیت اعلیٰ درجے کی مشرقی یونیورسٹی کی بنا دی جائے اور ہندوستان کے تمام مشرقی مدارس اس سے

افیلیٹ کر لئے جائیں۔" (خیالات عزیز،ص:٦)

یہ سب کچھ ہوا اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد وجود میں آئی۔اور اس نے بڑے شان سے تعلیمی خدمات انجام دیں۔مگر آہ! ہمارے سامنے ہی جامعہ عثمانیہ مرحوم بھی ہوگئی۔اس کے دارالترجمہ کی شاندار اور نایاب کتابیں ردی میں فروخت ہوئیں۔اس کی پرشکوہ عمارتیں حسرت وعبرت کا عجب تاثر دلوں میں پیدا کرتی ہیں۔بس تڑپ کر رہ جایئے۔اور غور کیجئے کہ ثریا نے ہمیں آسماں سے زمیں پہ کس طرح دے مارا۔

---

(٦)

مولانا سید امجد علی اشہری

[۱۸۵۲-۱۹۱۰ء]

مولانا سید امجد علی اشہری بڑے اہل علم وفضل اور صاحب تصانیف کثیرہ بزرگ گذرے ہیں۔ایک درجن سے زاید علمی وادبی اور سوانحی کتب ان کے قلم سے نکل کر مقبول ہوئیں۔ان میں ایک میر انیس کی سوانح عمری "حیات انیس" بھی ہے جو اپنے موضوع کی انتہائی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔اس کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی سے مصنف کے گہرے اور بے تکلفانہ مراسم تھے اور یہ بھی کہ "حیات انیس" لکھنے کا مشورہ علامہ شبلی ہی نے انہیں دیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں جس سال مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے مشہور بانی سرسید احمد خان بہادر کا انتقال ہوا راقم کو نواب محسن الملک بہادر کی خدمت میں علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا جو سرسید کی کوٹھی میں فروکش تھے۔اس کوٹھی کے عالی شان کمرے میں سرسید کا کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی کے سپرد تھا۔میں اکثر جی بہلانے کو وہاں جابیٹھتا۔ایک روز علامہ شبلی نے مجھ سے کہا کہ اردو میں میر انیس کا درجہ ایسا ہے جیسے فارسی میں فردوسی کا درجہ۔تمام ملک میں اس کے کلام

کی داد دی جاتی ہے۔ ہندو مسلمان ان کے ادائے کلام کے شیفتہ اور سنی و شیعہ ان کے طرز بیان کے فریفتہ ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ ان کے حالات زندگی پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اگر تم سے ہو سکے تو یہ کام کرنے کا ہے۔ میں بھی کچھ مدد دوں گا۔" (حیات انیس، ص:۱-۲)

آگے مزید لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی صاحب نے کچھ مدد دینے کا وعدہ فرمایا تھا وہ خود "موازنہ انیس و دبیر" لکھنے پر آمادہ ہو گئے اور میں نے انیس کے متعلق حالات جمع کرنے کا لگا لگا دیا تھا اور ان کے اقتباس کلام کو متفرق اوراق پر لکھتا رہا، جس سے کچھ مواد جمع ہو گیا۔ اس کا ذکر مولانا شبلی صاحب سکریٹری صیغہ ترقی اردو نے اپنی رپورٹ میں کر دیا۔" (حیات انیس، ص:۴-۵)

انجمن ترقی اردو کی رپورٹ میں علامہ شبلی نے مولوی امجد علی اشہری کے بجائے ان کے صاحبزادے مولوی منظر علی اشہری کے "حیات انیس" لکھنے کا ذکر کیا ہے اور ساتھ میں ان کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ بہت کچھ مدد دے رہے ہیں، اس لئے امید ہے کہ کتاب اچھی لکھی جائے گی۔ علامہ شبلی کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ مولانا امجد علی اشہری بڑے قابل شخص ہیں اس لئے حیات انیس ایک عمدہ کتاب ہوگی، مگر یہ کتاب ان کے عہد نظامت انجمن ترقی اردو میں نہ لکھی جا سکی۔ علامہ شبلی کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۷-۱۹۵۰ء] انجمن کے سکریٹری مقرر ہوئے تو انہوں نے بھی حیات انیس کے لئے مولانا امجد علی اشہری سے بارہا تقاضا کیا۔ تاہم ۱۹۰۷ء میں جب حیات انیس مکمل ہوئی تو انجمن کے سکریٹری مولانا شروانی ہی تھے باوجود اس کے وہ انجمن کی بجائے مطبع آگرہ اخبار آگرہ کی جانب سے شائع ہوئی۔ بہر حال علامہ شبلی کی بدولت نہ صرف اردو کا پہلا موازنہ "موازنہ انیس و دبیر" وجود میں آیا بلکہ حیات انیس بھی انہی کی توجہ کا نتیجہ ہے۔

مولانا سید امجد علی اشہری کی ایک اور کتاب "ایشیائی شاعری" شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب انہوں نے توسیع ذخیرہ معلومات اردو کے تحت لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"آخر کار مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ہندو ہندی کی اشاعت میں سرگرم ہیں اور

ہندی اردو کو دبانا اور اس کی فصاحتوں کو بگاڑنا چاہتی ہے تو اردو کی حفاظت کا سامان کیا اور مسلمانوں کے اجلاس محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس دہلی ۱۹۰۳ء (زمانہ دربار شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ملکہ) میں ایک خاص کمیٹی اردو کی حفاظت کے لئے بنائی اور مولانا شبلی نعمانی سابق پروفیسر عربی مدرسۃ العلوم علی گڑھ حال ناظم دینیات حیدر آباد اس کے سکریٹری قرار پائے۔اور ضروری علوم و فنون کی تدوین پر خیالات رجوع ہوئے۔ازاں جملہ یہ کتاب بھی توسیع ذخیرہ معلومات اردو کی غرض سے پیش کی جاتی ہے۔'' (ایشیائی شاعری،ص:۲)

---

(۷)

نواب جیون یار جنگ

[***]

ڈاکٹر سید علی بلگرامی کا ترجمہ تمدن عرب بہت مشہور ہے۔اس کا دیباچہ نواب جیون یار جنگ بہادر بی اے منصرم چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدر آباد دکن نے لکھا ہے۔اس میں یہ بات آئی ہے کہ

''۱۹۰۱ء میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کو یہ خدمت (نظامت سررشتہ علوم وفنون) ملی یہ سررشتہ ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۴ء تک قریباً دس سال قائم رہا۔اس عرصہ میں حسب ذیل دس کتابیں شائع ہوئیں۔ان میں سے پہلی پانچ کتابوں کی ڈاکٹر سید علی نے نگرانی کی۔

(۱) سیاحت نامہ موسیو ٹیورنیر،آگرہ ۱۸۹۶ء(۲) سیاحت نامہ موسیو تھیونو،آگرہ ۱۸۹۷ء(۳) تاریخ دکن جلد اول،آگرہ ۱۸۹۷ء(۴) تاریخ دکن جلد دوم،آگرہ ۱۹۰۰ء(۵) نظام اکبری،حیدر آباد ۱۹۰۱ء(۶) الغزالی،کان پور ۱۹۰۲ء(۷) علم الکلام،آگرہ ۱۹۰۲ء(۸) تاریخ دکن جلد سوم،آگرہ ۱۹۰۳ء(۹)

الکلام، کان پور۱۹۰۴ء (۱۰) موازنہ انیس ودبیر، آگرہ۱۹۰۴ء

(تمدن عرب، ص:۸)

سر رشتہ علوم وفنون کی اشاعتی سرگرمیوں کی تفصیلات بعض اور کتابوں میں بھی درج ہیں۔
یہ بھی سچ ہے کہ علامہ شبلی کے مستعفی ہو جانے کے بعد یہ ادارہ ختم کر دیا گیا تھا۔ مگر علامہ شبلی کی مشہور کتاب ''موازنہ انیس ودبیر'' یہاں سے کبھی شائع نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کا جو مسودہ علامہ نے تیار کیا تھا وہ عرصہ تک وہاں پڑا رہا اور علامہ شبلی کے بار بار کے تقاضہ کے باوجود انہیں نہیں دیا گیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اپنے قیام لکھنو کے زمانہ میں اسے دوبارہ لکھا اور ۱۹۰۷ء میں قومی پریس لکھنو سے طبع کرایا۔ تعجب تو اس بات پر بھی ہے کہ نواب جیون یار جنگ نے اس کا سنہ طباعت بھی درج کیا ہے۔

---

(۸)

احسن اللہ خاں ثاقب

[۱۸۵۳-۱۹۳۵ء]

مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب علم وفن کے قدیم مرکز بدایوں کے رہنے والے تھے۔ تیرہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شرح حسن وعشق، عالی شیرازی، گوہرین نامہ، آتش بے دود اور خطوط امیر مینائی ان کی ادبی وشعری یادگاریں ہیں۔ ایک عرصہ تک مجلّہ ''قند پارسی'' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ فارسی زبان پر انہیں بے پناہ دسترس حاصل تھی، اس میں وہ نہ صرف نثر اچھی لکھتے تھے بلکہ داد سخن بھی دیتے تھے۔

انہیں علامہ شبلی سے خاص انس تھا، بلکہ دونوں ایک دوسرے کے مداح اور قدرداں تھے۔ ان کے درمیان خط وکتابت بھی رہی۔ (شبلی کے مکتوب الیہ، ص:۴۷)

مکتوبات کی جمع وتدوین کے بارے میں ثاقب نے علامہ شبلی کی ایک بڑی اہم بات مکاتیب امیر مینائی کے دیباچہ میں لکھی ہے۔ لکھتے ہیں:

”میرا قصد تھا کہ صرف وہ خطوط کتابی حیثیت میں شائع کیے جائیں کہ جن میں کہ ادب کی رنگینی ہو یا فن شعر کے متعلق کوئی نکتہ بحث یا کوئی بات ہو، مگر شمس العلماء مخدومی حضرت مولانا شبلی نعمانی دامت افاضتھم نے فرمایا کہ نہیں تمام تحریریں جو مل سکیں بلا ترک حذف درج کی جائیں، کیونکہ مصنف کے فقرے فقرے اور لفظ لفظ سے اس کے حالات، خیالات، ذکاوت اور طبیعت کا پتہ لگتا ہے۔ پھر ایسے خط جن میں انشا کی رنگینی یا بحث فن ہو بہت کم مل سکے، پس جو مکاتیب استاد مرحوم کے مجھ کو بہم پہنچے ہیں وہ سب شائع کیے جاتے ہیں۔“

(مکاتیب امیر مینائی، ص:۱۰)

کاش علامہ شبلی کا یہ اصول مولانا سید سلیمان ندوی کے پیش نظر رہا ہوتا تو سیکڑوں خطوط ضائع ہونے سے بچ جاتے۔ اور آج محفوظ رہتے۔

مکاتیب شبلی حصہ اول کے مفصل دیباچہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے صراحت کی ہے کہ مکاتیب شبلی کی ترتیب وتدوین کا جب اعلان ہوا تو ہر طرف سے خطوط کی بارش ہونے لگی۔ اور یہ کہ مکاتیب شبلی علامہ شبلی کے خطوط کا ایک انتخاب ہے۔

---

(۹)

سید نظیر الحسن فوق

[۱۸۵۶-۱۹۴۸ء]

خان بہادر چودھری سید نظیر الحسن فوق لکھنوی، مہابن ضلع متھرا کے رئیس تھے۔ اردو زبان کے ایک بڑے ادیب ونقاد اور سوانح نگار تھے۔ علامہ شبلی نعمانی کی مشہور زمانہ کتاب ”موازنہ انیس ودبیر“ کے جواب میں انہوں نے نہایت شاندار کتاب ”المیزان“ لکھی ہے۔ اس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

”یہ کتاب مولوی شبلی صاحب کی کتاب ’موازنہ انیس ودبیر‘ کا لفظ بہ لفظ جواب

ہے۔ اگرچہ ہم نے جواب دیتے وقت مولوی صاحب کی پوری عبارت نقل کردی ہے، لیکن اگر موازنہ کو سامنے رکھ کر پہلے ان کے مضمون کو پڑھ لیا جائے اور پھر ہماری تحریر دیکھی جائے تو غالباً زیادہ لطف حاصل ہوگا۔ اور انصاف کا موقع ہاتھ آئے گا۔'' (المیزان، ص:۱)

''ہماری کتاب پڑھتے وقت ناظرین یہ امر ملحوظ خاطر رکھیں کہ گو ہم یہ کتاب مرزا صاحب کے دفع الزام کے واسطے لکھ رہے ہیں، لیکن میر صاحب اعلی اللہ مقامہ کی نسبت جن کا اعتقاد ہم کو مولوی شبلی صاحب سے بہت زیادہ ہے، کوئی خلاف ادب لفظ نہیں لکھا، جن مقامات پر مولوی شبلی صاحب نے مرزا صاحب پر اعتراضات کیے ہیں کہ انہوں نے فلاں مضمون یا فلاں لفظ خلاف بلاغت و فصاحت لکھا ہے۔ اس کے جواب میں ہم نے اسی قسم کے اشعار میر صاحب مرحوم کے درج کیے ہیں۔ اس سے خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہے کہ میر صاحب پر کوئی اعتراض کیا جاتا ہے، بلکہ مرزا صاحب پر جو اعتراض کیا گیا ہے اس کے رفع کرنے کی غرض سے میر صاحب کے کلام سے استناد کیا ہے، یعنی از بسکہ میر صاحب نے بھی ایسا لکھا ہے اس لئے صحیح ہے۔ اور یہ لفظ مولوی شبلی صاحب کے نزدیک قابل اعتراض نہ ہونا چاہئے تھا، غالباً مولوی صاحب کے ساکت کرنے کے واسطے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ میر صاحب کا کلام بطور سند پیش کیا جائے۔'' (المیزان، ص:۲-۳)

المیزان علامہ شبلی کی زندگی [۱۹۱۴ء] ہی میں شائع ہوئی تھی۔ چودھری سید نظیر الحسن فوق رضوی نے 'المیزان' علامہ شبلی نعمانی کی خدمت میں بھیجی تو اس کے جواب میں انہوں نے ان کی اس کاوش کی زبردست داد دی اور لکھا کہ

''آپ نے نہایت متانت و سنجیدگی سے کتاب کا جواب لکھا ہے جو اس زمانے میں نہایت غنیمت ہے۔ آج مجھ کو موازنہ کی قدر ہوئی کیوں کہ اس بہانے اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ اور ایک باکمال (دبیر) کے جوہر اچھی طرح کھلے۔

آپ کی عنایت کا مشکور اور طرز تحریر کا مداح ہوں۔"

(مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص:۳۲۷)

---

(۱۰)

مولانا عبدالرؤف داناپوری

[۱۸۵۶-۱۹۴۸ء]

مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری ایک سیرت نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اور بلاشبہ ان کی کتاب "اصح السیر" بہت مشہور ہے۔ اس کے مقدمہ میں جا بجا علامہ شبلی اور ان کے نظریہ سیرت نگاری کا ذکر آیا ہے۔ کہیں نقد ہے، کہیں طنز ہے اور کہیں اختلاف رائے۔ اس کی ایک دو مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

بحیرہ کے واقعہ کے سلسلہ میں سب جانتے ہیں کہ سیرت نگاروں میں اختلاف رائے ہے۔ البتہ اختلافات کی نوعیت جدا جدا ہے۔ صاحب 'اصح السیر' نے واقعہ پر حاشیہ میں لکھا ہے کہ

> "مولانا شبلی نے اس روایت پر دو اعتراضات کیے ہیں۔ اول یہ کہ عبدالرحمٰن ابن غزوان اس کے ایک راوی ہیں جو مجروح ہیں حالانکہ عبدالرحمٰن مذکور صحیح بخاری کے رواۃ میں سے ہیں۔ دوئم یہ کہ ابو موسیٰ اشعریؓ اس کے آخری راوی ہیں، وہ واقعہ کے وقت موجود نہ تھے اور انہوں نے یہ بتایا نہیں کہ کس سے سنا، نہ بتایا مگر بلا تحقیق غلط بیانی کا تو ان سے قرینہ نہیں ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہوگا۔ صحابہ کا بیان حجت ہے۔" واللہ اعلم ۱۲ منہ (اصح السیر مقدمہ ص:۱۷)

مولانا داناپوری کا خیال ہے کہ علامہ شبلی درایت کے مفہوم سے واقف نہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض اہل قلم نے علامہ شبلی کے نقطہ نظر سے کسی واقعہ کی تحقیق کی ہے تو وہ اصل نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں اور وہ غلطی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ایسے لوگ جو بدعات اور رسوم و رواج کے احاطہ کے اندر صاحب تمیز ہوئے ان

کی حالت اس کے برعکس ہے۔ ان کی عقل انہیں احادیث کو قبول کرتی ہے جو رواج کے موافق ہو، گو سنداً موضوع ہو اور جو اس کے خلاف وہ قابل رد ہے گو سنداً صحیح ہو۔

ان لوگوں کو جناب مولانا شبلی کے ایک بیان سے بڑی مدد ملی۔ مولانا شبلی کی نسبت یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ وہ ہر شخص کو اختیار دیں گے کہ کسی روایت کا محض اس بنا پر انکار کر دے کہ وہ اس کو عقل کے خلاف سمجھتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے بیان سے یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے۔

مولانا سیرت میں بھی اور اپنی دوسری تصنیفات میں بھی بسط و تفصیل سے لکھتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک احادیث کو پرکھنے کا ایک اصول درایت بھی ہے۔ جس طرح قرآن کریم کے خلاف کوئی روایت ہو تو رد کر دی جائے گی۔ اور یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس کی سند کیسی ہے۔ اسی طرح جو روایت عقل کے خلاف ہو وہ بھی رد کر دی جائے گی سند دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

یہ مولانا (شبلی) کی تحریر کا خلاصہ ہے۔ مولانا سے تسامح یہ ہوا کہ وہ روایت اور عقل کو ایک چیز سمجھتے ہیں۔ دوئم درایت کو اسناد پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اور کسی محدث کا یہ مسلک نہیں ہے۔ بلکہ صریح البطلان ہے۔" (اصح السیر، ص:۱۹-۲۰)

یہ اور اس طرح کے بعض اور بھی نقد و انتقاد مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوریؒ اور بعض دوسرے علماء نے بھی کئے ہیں، جن کے بعض اہل علم نے تحقیقی جوابات بھی لکھے ہیں۔ ان مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور ڈاکٹر محمد عارف عمری قابل ذکر ہیں۔

مولانا داناپوری نے اپنے مقدمہ میں کئی جگہ علامہ شبلی پر نقد کیا ہے اور کمزوریاں دکھائی ہیں۔ لیکن یہ بات اور زیادہ اہم ہے کہ کسی ایک مقام پر بھی علامہ شبلی یا ان کی سیرت نبوی کی تعریف و تحسین میں ایک جملہ بھی ان کے قلم سے نہیں نکلا ہے۔

---

(۱۱)

سید محمد حسن بلگرامی

[۱۸۵۶-۱۹۱۵ء]

سید محمد حسن بلگرامی علامہ شبلی کے احباب میں تھے۔ وہ پیدا اگرچہ قصبہ بلگرام اتر پردیش میں ہوئے مگر زندگی کا بیشتر حصہ حیدرآباد میں گذرا۔ وہ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ شعروادب کا بڑا عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ خاص طور پر نثر بڑی عمدہ اور انشا پردازانہ لکھتے تھے۔ ایسی نثر لکھنے والے آج مفقود ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"پہلے میرا خیال تھا کہ اپنی ناچیز تالیف ملت ایران کے نام معنون کروں جن کی بہادری و جواں مردی، شجاعت و دلیری، جاں بازی وحب الوطنی اپنے ملک کو بار بار تباہی سے بچا چکی ہے۔ سکندر کے حملے کا سیلاب اور اس کے بعد ایران پر بڑے بڑے دھاوے ہوئے، یونانیوں، عربوں، کوہستانیوں، منگولیوں، تاتاریوں، ترکوں اور افغانوں کے پے درپے حملوں نے سارے ملک کو تاخت و تاراج کر ڈالا، کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ملک پھر کبھی زندہ ہوگا، مگر ملت ایران کی دانش مندی اور جذبہ جاں نثاری نے اس پیکر مردہ میں پھر ایک تازہ روح پھونک دی۔" (کارنامہ پہلوی، ص:۱)

اپنی کتاب کارنامہ پہلوی کے دیباچہ میں فاضل مصنف نے یورپ کے ذوق تحقیق کا جہاں ذکر کیا ہے، وہاں علامہ شبلی کا یہ اقتباس بھی نقل کیا ہے کہ

"یورپ قصیدہ نہیں لکھ سکتا، لیکن مرثیہ کہنے میں اس کو کمال حاصل ہے۔ وہ کبھی کسی زندہ قوم کی تعریف نہ کرے گا، لیکن جو قوم فنا ہو چکی ہو اس کے علوم وفنون، فلسفہ، مذہب، تمدن، تہذیب پر بہترین کتاب لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرے گا۔"

(کارنامہ پہلوی، ص:۳)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ علامہ شبلی کے افکار نظریات پر کس درجہ گہری نگاہ

رکھتے تھے۔

سید محمد حسن بلگرامی کی علم وادب پر گہری نگاہ تو تھی ہی وہ ایک مصنف بھی تھے۔ کارنامہ پہلوی کا ذکر آچکا ہے۔اس کے علاوہ خیابان عرفان، رباعیات انیس، دبدبہ امیری وغیرہ ان کی یادگاریں ہیں۔ایک کتاب قاآنی پر بھی ہے، جو راقم کی نظر سے نہیں گذری۔ان کتابوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اردو بلکہ فارسی ادب پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔

---

(۱۲)

نواب سلطان جہاں بیگم

[۱۸۵۸-۱۹۳۰ء]

نواب سلطان جہاں بیگم چوتھی فرمانروائے بھوپال مذہب وملت کی خدمت میں خواتین اسلام میں بلند رتبہ اور بلند حیثیت کی مالک ہیں۔ مذہب، علم وادب اور علماء وادبا کی بڑی قدرداں تھیں اور بڑی ہی نیک اور پاکیزہ مزاج اور باپردہ خاتون تھیں۔ علامہ شبلی کی انھوں نے بڑی قدردانی کی۔علامہ نے سیرت نبویؐ کی تالیف کے لئے جب قوم سے تعاون کا اعلان کیا تو انھوں نے سیرت کے تمام اخراجات کا ذمہ اپنے سر لے کر انھیں سارے آستانوں سے بے نیاز کردیا تھا۔علامہ شبلی نے اسی موقع پر یہ قطعہ کیا تھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف وتنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے وفات پائی تو بیگم سلطان جہاں نے فرمایا کہ فقیرے بے نوا

تو چل بسا، اب سلطان کی باری ہے۔(حیات شبلی، ص:۷۳۵)

علامہ شبلی نے ان سے کئی بار ملاقات کی اور ہر بار ان کے بلند اخلاق و کردار سے متاثر ہوئے۔ ایک ملاقات کا ذکر ماہنامہ الندوہ میں بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے اور آج جب میں نے ان کی متعدد تصنیفات دیکھیں تو میں حیرت زدہ رہ گیا کہ حکمرانی کے ساتھ علوم اسلامی اور جدید علوم سے وہ کس درجہ بہرہ ور تھیں اور کتنی عمدہ نثر لکھتی ہیں۔ ان کے قلم سے ایک درجن سے زیادہ بڑی معلوم افزا کتابیں نکلی ہیں۔ اختر اقبال، گوہر اقبال، بچوں کی پرورش، تربیت اطفال، تزک سلطانی، حیات شاہ جہانی، حیات قدسی، خطبات سلطانی، باغ بانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک کتاب عفت المسلمات [مطبوعہ:۱۹۱۸ء] ہے جو آج بھی پردہ اور عفت و عصمت کے موضوع پر خواتین کے لئے بے حد مفید کتاب ہے۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے اس میں اپنی ذاتی رائے کو بہت ہی کم دخل دیا ہے۔ قرآن وحدیث کو درج کرنے کے بعد مشاہیر علماء کی جو رائیں ہیں وہ نقل کی ہیں۔ اور پھر انھوں نے قدیم علماء میں شاہ ولی اللہ اور بحر العلوم اور جدید علماء میں مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کی رائیں نقل کی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

> ''روشن خیال اور جدید طبقہ میں مولانا شبلی اور مولانا نذیر احمد نہایت ممتاز اور مستند ہیں اور جدید تعلیم یافتہ گروہ میں ان کا تبحر علمی مستند ہے۔''
>
> (عفت المسلمات، ص:۱-۲، سلطان جہاں بیگم شمسی مشین پریس آگرہ ۱۹۱۸ء)

اس کتاب میں انھوں نے کئی جگہ علامہ شبلی کے اقتباسات نقل کئے ہیں اور جا بجا ان کی کتابوں کے حوالے دئے ہیں۔

علامہ شبلی نے جب سیرۃ النبیؐ کا آغاز کیا تو علماء کا ایک طبقہ بہت ناراض ہوا اور اس نے علامہ شبلی کی تکفیر کے فتاوے تیار کر کے بھوپال بھیجے اور کوشش کی کہ بیگم صاحبہ اپنا تعاون بند کر دیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کا سبب کیا تھا؟ کہیں کسی نے لکھا نہیں ہے، لیکن عفت المسلمات کے دیباچے سے اندازہ ہوا کہ خود بیگم بھوپال بڑی پڑھی لکھی اور روشن خیال خاتون تھیں اور وہ علامہ شبلی کو بھی روشن خیال اور ان کے تبحر علمی کی قائل تھیں اسی وجہ سے فتاوے بے اثر رہے۔ اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ مولویوں کی محض معاندانہ روش ہے۔

بیگم سلطان جہاں کی سیرت اور علامہ شبلی سے دلچسپی کا مظہر رسالہ بدء الاسلام کا اردو ترجمہ بھی ہے جو انھوں نے میمونہ سلطان شاہ بانو سے کرا کے شائع کیا۔ وہ خود سیرت پاک پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ انھوں نے لیڈیز کلب بھوپال میں سیرت پر جو خطبات دیئے تھے، ان کا ایک مجموعہ سیرت مصطفیٰ کے نام سے ۱۹۱۹ء میں شائع کیا۔ اس کے دیباچہ سے نہ صرف سیرت نبویؐ سے گہرے شغف اور علامہ شبلی سے ان کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کس درجہ شیفتگی تھی۔ وہ سیرت مصطفیٰ کے دیباچہ میں لکھتی ہیں:

> ''اس ریاست کی ایک صدی سے مذہبی خدمات اور اشاعت علوم دینی میں امتیازی حیثیت رہی ہے اور اس امتیازی حیثیت کو فرماں روا بیگمات نے ہی قائم کیا ہے، لیکن چوں کہ اس زمانہ میں ان تمام مذہبی خدمات میں جو اشاعت علوم سے متعلق ہیں، سیرت نبویؐ کی اشاعت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس لئے میں نے اپنے عہد میں اس خدمت کو سب سے مقدم رکھا ہے۔
>
> میں نے میمونہ سطان شاہ بانو سلمہا سے مولانا شبلی مرحوم کی کتاب بدء الاسلام کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کرایا اور مختصر سوانح عمری بھی لکھوائی جو اسکول کے طالب علموں کو بطور درس کتاب پڑھانی چاہئے۔ شاہ بانو سلمہا نے اس کام کو نہایت قابلیت سے انجام دیا اور ذکر مبارک بہت اچھی کتاب انھوں نے لکھی۔ یہ کتاب متعدد اسلامی مدارس میں بطور نصاب داخل کر لی گئی ہے۔ اسی طرح جب میں نے مولانا شبلی مرحوم کی ایک اپیل دیکھی جو سیرت نبویؐ کی تالیف کے متعلق تھی تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ چوں کہ میں حضور سرور کائنات کی ایک مستند اور مبسوط سوانح عمری کی ضرورت کو خود محسوس کرتی تھی اور مجھے اطمینان تھا کہ مولانا شبلی مرحوم نہایت قابلیت سے اس کام کو انجام دے سکتے ہیں اس لئے میں نے اس سیرت کی تالیف کے مصارف کی منظوری دیدی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی ایک جلد چھپ کر شائع ہوگئی ہے۔ جب تمام جلدیں مکمل ہو کر شائع ہو جائیں گی تو میں اس کو اپنی زندگی کا باعث فخر کام سمجھوں گی۔'' (سیرت مصطفیٰ، ص: ب-ج)

(۱۳)

مولوی عبدالحلیم شرؔر

[۱۸۶۰-۱۹۲۶ء]

مولوی عبدالحلیم شرر علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے اور دونوں بزرگوں میں گوناگوں تعلقات تھے۔اس کی داستان کسی قدر خود مولوی عبدالحلیم شرؔر نے علامہ شبلی پر اپنے وفیاتی مضمون میں بیان کردی ہے۔ان کے روابط پر پروفیسر علی احمد فاطمی الہ آباد یونیورسٹی نے بڑا شاندار مضمون لکھا ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ماضی میں علامہ شبلی سے متعلق مولوی عبدالحلیم شرر کے بعض بیانوں پر بڑی لے دے مچی تھی۔اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔یہاں بس یہ عرض کردینا کافی ہوگا کہ دونوں کے مسالک الگ الگ تھے۔اور مولوی عبدالحلیم شرر کے مسلک کے خلاف علامہ ایام شباب میں تیغ بے نیام تھے۔

علامہ شبلی کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ تصنیف وتالیف کے لئے وہ اہل علم کی بڑی مدد کیا کرتے تھے۔اس کے متعدد واقعات زیر نظر کتاب میں بھی آئے ہیں۔مولوی عبدالحلیم شرر نے بھی اپنی کتاب ''ابوبکر شبلی'' کے دیباچہ میں اعتراف کیا ہے کہ علامہ شبلی اور بعض دوسرے احباب نے کتابوں سے ان کی مدد کی۔(ابوبکر شبلی،ص:۲)

---

(۱۴)

مولوی مسعود علی محوؔی

[۱۸۶۱-۱۹۵۳ء]

مولوی مسعود علی محوی سابق سشن جج عدالت عالیہ ریاست حیدرآباد دکن، دہلی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔پھر اعلی تعلیم کے لئے علی گڑھ گئے۔سنہ ۱۸۸۹ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے کیا۔یہیں علامہ شبلی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور ان سے فارسی

زبان وادب پڑھا اوران سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فارسی میں دادسخن دینے لگے۔ وہ جس وقت علی گڑھ میں بی اے کے طالب علم تھے، اس وقت علامہ شبلی وہاں عربی وفارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ نیز وہ تمام طلبہ کو درس کے آغاز سے پہلے درس قرآن دیا کرتے تھے۔

مولوی مسعود علی محوی نے فارسی زبان وادب کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا اوراس پر بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے بلکہ اس کے بڑے اداشناس تھے۔ فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے اور قاآنی کے طرز میں شاعری کرتے تھے۔ اوراس کے لئے وہ اپنے عہد میں معروف تھے۔ انھوں نے ۱۳۵۶ھ [۱۹۳۷ء] میں اپنا مجموعہ کلام ''نذرعقیدت'' شائع کیا۔ اس کے دیباچہ میں اپنے استاذ علامہ شبلی کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ جس سے علامہ شبلی کے اس ابتدائی زمانہ کے طریقۂ تدریس کا علم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں کہ فارسی شاعری کی ابتدا قصیدہ سے ہوئی، اتفاق کی بات ہے کہ میں نے بھی نظم نویسی اسی صنف شعر سے شروع کی۔ علی گڑھ کالج کی بی اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے، مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے، مولانا مرحوم ان نادرالوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دینے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کردینے میں ملکہ رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم ومغفور کی دلچسپ اور موثر صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے اور سب نے قاآنی ہی کا طرز اختیار کیا۔ کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے بالکل پاک اور صاف ہوگئے اور بعض نے فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی اور اچھے شعر کہنے لگے، مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آج تک کامیاب نہ ہوسکا۔'' (نذرعقیدت، ص د، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ)

۱۹۴۷ء میں محوی کا دیوان حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس کے دیباچہ میں بھی انہوں نے علامہ شبلی کو یاد کیا ہے۔ اوران کے ذوق فارسی کا ذکر کیا ہے۔ (دیوان محوی، ص:۶)

خدا جانے علامہ شبلی اپنے تلامذہ میں کون ساجذبہ ابھار دیتے تھے کہ وہ انہیں کبھی فراموش

نہیں کرپاتے تھے۔ مولوی مسعود علی محوی کے ایک اور دیباچے کا ذکر سنئے۔ شیخ علی حزیںؔ کے متفرق اشعار کا مجموعہ "سفینہ" مہاراجہ سر کشن پرشاد نے اشاعت سے پہلے ترتیب وتہذیب اور تقدیم کے لئے مولوی مسعود علی محوی کے ذمہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے بڑے اہتمام سے ۱۹۳۰ء میں دارالطبع جامعہ عثمانیہ سے شائع کیا۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"جس طرح اہل یورپ نے ہمارے ملکوں، ہماری حکومتوں اور ہماری دولتوں پر قبضہ کرلیا ہے اسی طرح وہ ہمارے علمی اور ادبی ذخیروں کے بھی مالک اور قابض ہوگئے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی چھوٹا بڑا شہر ایسا نہیں ہے جس کے علمی اور ادبی نفالیس اور نوادر چن چن کر یورپ کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں نہ پہنچ گئے ہوں۔ یہ بطور شکایت کے نہیں بلکہ بطور حکایت کے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ذخیروں میں سے جو کچھ ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے اس کے رکھ رکھاؤ اور اس سے استفادہ کی قابلیت بھی ہم سے مفقود ہوگئی ہے۔ برخلاف اس کے جو چیزیں یورپ پہنچ گئی ہیں وہ محفوظ ہیں اور ان سے استفادہ کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اور اس لحاظ سے ہمارے خیال میں یہ بدقسمتی زیادہ تاسف کے قابل نہیں ہے۔ ہندوستان کے انہیں باقی ماندہ ذخیروں سے بعض اوقات کچھ جواہر پارے نکل آتے ہیں اور اگر خوش نصیبی سے ایسے لوگوں کے ہاتھ پڑجاتے ہیں جو ان کی قدر و قیمت سے واقف ہوتے ہیں تو وہ روشنی میں آکر زمانہ کی دست برد سے بچ جاتے ہیں۔ کسے معلوم تھا اور کون جانتا تھا کہ میرزا صائب نے قدیم اساتذہ کلام کا ایک لاجواب انتخاب کیا ہے۔ اتفاقاً ایک دوست کے پاس میں نے اسے دیکھا اور ان سے مستعار لاکر اپنے استاد مولانا شبلی مرحوم کو دیا۔ مولانا مرحوم اسے دیکھ کر جس قدر خوش ہوئے اور جس قدر اس کی قدر کی اس کا اندازہ کرنا ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے بچشم خود یہ منظر نہیں دیکھا نہایت مشکل ہے۔ مولانا مرحوم حیدرآباد سے کوئی بڑی تنخواہ نہیں پاتے تھے لیکن باوجود اس کے اس پر آمادہ تھے کہ اگر مالک کتاب اس مجموعہ کے معاوضہ میں المضاعف وزن میں چاندی لینا چاہے تو وہ

بخوشی دیں گے۔اس میں شک نہیں کہ یہ نسخہ نہایت خوش خط اور جا بجا مذہب تھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاہی یا کسی امیر کے کتب خانہ کے لئے نہایت اہتمام سے لکھوایا گیا ہے۔غرض مولانا مرحوم کی تعریف اور قدردانی کی شہرت نے حیدرآباد میں اس مجموعہ کی دھوم مچادی اور ہر ایسے شخص نے جس کے پاس بڑا کتب خانہ تھا اپنے کتب خانہ میں اس کی تلاش شروع کی ۔نتیجہ یہ ہوا کہ عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ کے کتب خانہ سے بھی اس کا ایک نسخہ برآمد ہوا اور بعض دوسرے لوگوں کے پاس بھی اس کا پتہ چلا۔اور یہ مردہ تالیف از سر نو زندہ ہوگئی۔شیخ علی حزیں کے اس سفینہ کی بھی تقریباً یہی کیفیت ہے۔''

(سفینہ شیخ علی حزیں، ص: الف تاج)

سچ ہے کوئی کسی کا یونہی قدرداں نہیں ہوتا،اس کے لئے جوہری ہونا بھی ضروری ہے۔اور یہ بھی سچ ہے کہ علامہ شبلی اپنے عہد کے شاید سب سے بڑے جوہری تھے۔نخاس لکھنو میں پنساری کی دوکان سے مونس الارواح کا وہ نسخہ جسے آج دارالمصنفین میں دکھادکھا کر ہم اپنی اور اپنے ضلع کی عزت بڑھاتے ہیں وہ اس جوہری کے اسی ذوق ادب کا آئینہ دار ہے۔

مولوی مسعود علی محوی کو دنیا ایک مصنف اور مترجم کی حیثیت سے نہیں جانتی۔انہوں نے کوکبہ حمیدیہ،اصول واقعات متعلقہ،مشیرالوکلاء،اصول فقہ اسلام (مولف جسٹس سر عبدالرحیم) قانون بین الاقوام (مولفہ ویسٹ لیک) قانون قدیم (مولفہ مین) آئین انگلستان (مولفہ ڈائلی) شرع اسلام (مولفہ ملا فریدون) حالات اقوام جرائم پیشہ ممالک محروسہ سرکار عالی، دستورالعمل کوتوالی،وکالت،نذر عقیدت،دیوان محوی،مخدوم زادگان فتح پور (حصہ اول ودوم) رہنمائے مدینہ اور حیدرآباد جیسی کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔یہ کتابیں مطبوعہ ہیں۔بعض غیر مطبوعہ کتابیں بھی ان کے ذخیرہ میں ملی تھیں۔(مجموعہ کلام حضرت مسعود علی محوی، ص: ز،ط)

۱۹رجنوری ۱۹۵۳ءکو حیدرآباد میں وفات پائی۔تکیہ موسی شاہ قادری،باغ مرلی دھر، معظم جاہی روڈ حیدرآباد میں مدفون ہیں۔(ایضاً)

(۱۵)

جرجی زیدان

[۱۸۶۱-۱۹۱۴ء]

جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال مصر عالم عربی کا نامور عیسائی اہل قلم گذرا ہے۔ اس نے چار جلدوں میں ''تاریخ التمدن الاسلامی'' کے نام سے اسلامی تہذیب وتمدن کی تاریخ سپرد قلم کی ہے۔ بظاہر یہ تمدن اسلامی کی تاریخ ہے، لیکن درحقیقت یہ مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب پر ایک ناروا حملہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زہر کے تریاق کے لئے علامہ شبلی نے ''الانتقاد'' جیسی محققانہ کتاب لکھی جو ۱۹۱۲ء میں بیک وقت ہندوستان اور مصر سے شائع ہوئی۔ اس کے مفصل مطالعہ وجائزہ کے لئے راقم کی کتاب ''آثار شبلی'' ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ (آثار شبلی، ص: ۲۸۱-۳۰۸)

جرجی زیدان علامہ شبلی کا ہم عصر اہل قلم تھا۔ اس نے جب ''تاریخ التمدن الاسلامی'' کی تالیف کا منصوبہ بنایا تو اسے تہذیب اسلامی کی تاریخ کا سراغ علامہ شبلی کے تاریخی مقالات کے مجموعہ رسائل شبلی [مطبوعہ: ۱۸۹۸ء] سے ملا۔ اس کا اس نے اپنے مقدمہ میں اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''یورپ کی کتابوں میں عربوں کے جو قابل ذکر واقعات بیان ہوئے ہیں ان کا جو سراغ مجھ کو اصل عربی ماخذ میں نہیں ملتا تھا، اس وجہ سے اس کی صحت مجھ کو مشکوک معلوم ہوتی تھی، شاید یہ واقعات عہد وسطی کے یورپین سفرناموں سے ماخوذ ہیں اور اکثر واقعات محتاج تحقیق ہیں۔ مجھ کو اردو زبان میں لکھی ہوئی (شبلی) نعمانی کی کتاب رسائل شبلی ملی، جس میں مستند حوالوں کے ساتھ عرب کے مدارس، شفاخانے، کتب خانے اور عربوں کی تصنیفات کا ذکر متعدد فصلوں میں ہے، درحقیقت یہ ایک عظیم الشان تصنیف ہے۔ اس کے ذریعہ سے اس موضوع پر علماء کے آرا واقوال کو پڑھ کر جب میں نے اصل ماخذ کی طرف رجوع کیا اور امعان نظر سے واقعات کی جستجو کی تو مجھ کو حیرت انگیز تمدنی سرمایہ ہاتھ آیا۔ بالخصوص علم و

ادب کے میدان میں عربوں نے جونمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں، یہ اسی کی تفصیل ہے۔'' (تاریخ التمدن الاسلامی، ج ۳، مقدمہ، ص:۳-۴)

اس کے علاوہ بھی بعض عرب اہل قلم ڈاکٹر محمود لبیب وغیرہ علامہ شبلی سے متاثر ہوئے، مگر ان پر اثرات شبلی کے ثبوت مہیا نہ ہو سکے۔

---

(۱۶)

مولوی محمد عباس

[•••]

منشی فاضل مولانا مولوی محمد عباس ایم اے جوائنٹ ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کے علامہ شبلی نعمانی سے براہ راست متاثر ہونے کا ذکر تو نہیں ملا۔ البتہ ۱۹۰۲ء میں ان کی ضخیم کتاب ''مشاہیر نسواں'' شائع ہوئی تو انہوں نے اس کے مقدمہ میں علامہ شبلی کی ایک مشہور کتاب ''المامون'' کا اس کے ماخذ کے طور پر ذکر کیا ہے۔ (مشاہیر نسواں، ص:۳)

---

(۱۷)

مولوی عبدالرزاق کان پوری

[۱۸۶۲-۱۹۴۸ء]

مولوی عبدالرزاق کان پوری علامہ شبلی کے احباب میں تھے۔ البرامکہ ان کی بڑی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب کو اس قدر مقبولیت ملی کہ مصنف کا نام ہی مولوی البرامکہ پڑ گیا تھا۔ سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال ان کو اسی نام سے یاد کرتی تھیں۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کا انتساب علامہ شبلی کے نام ہے اور ان الفاظ میں ہے:

'' بکمال ادب وعقیدت ، بنابر اظہار شکریہ تصنیف سلسلہ ہیروز آف اسلام یہ

کتاب عالی جناب معلّی القاب شمس العلماء مولانا مولوی شبلی نعمانی پروفیسر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ وفیلو یونیورسٹی الہٰ آباد مدظلہم کے نام نامی واسم گرامی سے منسوب کی جاتی ہے۔

مسند علم از وجودت منبع آداب باد
آستانت قبلہ جان اولی الالباب باد

خاکسار مؤلف

(البرامکہ،ص:۲)

اس انتساب کے متعلق مصنف نے اپنی دوسری کتاب یادایام میں سرسید کے حوالہ سے بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ

''جب پہلی مرتبہ میری کتاب البرامکہ شائع ہوئی تو میں نے ایک نسخہ نذر کیا، اس وقت سرسید بستر مرگ پر تھے۔ مولوی وحیدالدین سلیم نے کتاب اور میرا عریضہ پیش کیا۔ کتاب ہاتھ میں لے کر چند صفحے پڑھے اور بہت خوش ہوئے اور فرمایا کتاب احتیاط سے رکھو میں انشاء اللہ اس پر ریویو لکھوں گا، لیکن جب تہدیہ کا صفحہ دیکھا تو فرمایا کہ مصنف نے بڑی غلطی کی ہے۔ اس کتاب کا تہدیہ مولوی شبلی کے نام کیا گیا، یہ میرا حق تھا۔ مولوی سلیم نے تائید کرتے ہوئے عرض کیا کہ بہ حیثیت بزرگ قوم اور اردو کے معلم ثانی ہونے کی حیثیت سے ضرور یہ آپ کا حق تھا۔ یہ سن کر سرسید غصہ ہوئے اور فرمایا تم نے میرا منشا نہیں سمجھا۔ جب مولوی صاحب نے اصرار کیا تو ارشاد ہوا کہ تم جانتے ہو کہ میں خاندان وزارت سے ہوں۔ میرے نانا دولت مغلیہ میں وزیر تھے اور البرامکہ ایک خاندان وزارت کی تاریخ ہے۔ لہٰذا میرا حق انتساب شبلی سے بدرجہا فائق تھا۔'' (یادایام،ص:۳۱-۳۲)

یادایام کے دیباچہ میں سوانح نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اس کمی کا ذکر کیا گیا ہے کہ اردو میں سوانحی ادب کی بہت کمی ہے اور پھر اس سلسلہ میں علامہ شبلی کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ

''نہایت خوشی ہے کہ سب سے پہلے ہمارے محترم واجب التعظیم شمس العلما مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی، فیلو یونیورسٹی الٰہ آباد و پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے ایک سلسلہ ہیروز آف اسلام (نامور فرمانروان اسلام) کا لکھنا شروع کیا ہے، چنانچہ سلسلہ خلافت سے ''المامون'' یعنی خلیفہ مامون الرشید کی لائف پانچ مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اس تصنیف سے جو اعتراض علماء پر عدم توجہی تاریخ کا تھا وہ بطور فرض کفایہ کسی قدر ساقط ہو گیا ہے، قوم نے المامون کو قبول کے ہاتھوں میں لیا اور اس کے مضامین کو رغبت کے کانوں سے سنا اس شوق اور شغف سے پایا جاتا ہے کہ گئی گذری ہوئی حالت میں بھی مسلمانوں کو اپنی قومی تاریخ سے خاص دلچسپی ہے۔'' (البرامکہ، ص:٦)

اس دیباچہ میں علامہ شبلی کا ایک اور جگہ ذکر آیا ہے۔ علامہ شبلی نے المامون لکھی اور سچ یہ ہے کہ اردو دنیا میں مامون کو زندہ کر دیا۔ المامون شائع ہوئی تو عباسیوں میں مامون کے انتخاب پر علامہ شبلی پر تنقیدیں ہوئیں اور کہا گیا کہ مامون کے بجائے ہارون الرشید اس انتخاب کا اصل مستحق تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی نے اس کے جواب میں لکھا کہ حق یہ ہے کہ اگر اس کا دامن انصاف برامکہ کے خون سے رنگین نہ ہوتا تو ہم اس کا انتخاب کرتے۔ مولوی عبدالرزاق کان پوری نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ (البرامکہ، ص:١۵)

مولانا نے مامون کے انتخاب کے اور بھی اسباب بیان کیے ہیں، مگر مولوی عبدالرزاق کان پوری نے ان سے صرف نظر کیا ہے۔ دراصل وہ اس پر نقد نہیں کر رہے ہیں بلکہ برامکہ کے ذکر سے اردو والوں کی عدم اعتنائی کا شکوہ کیا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ ان کی کتاب برامکہ کی تاریخ پر پہلی مبسوط اور بھرپور کتاب ہے۔

مولوی عبدالرزاق کان پوری کی دوسری کتاب ''نظام الملک طوسی'' ١٩١٢ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی اپنے موضوع پر بڑی اہم خیال کی جاتی ہے۔ اس کے دیباچہ میں بھی انھوں نے علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے۔ اور وہ ذکر اس طرح آیا ہے کہ مسلمانوں کو مشاہیر اسلام کے بجائے مشاہیر یورپ سے زیادہ دلچسپی ہوتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ وہ اردو میں مشاہیر اسلام کی سوانح

عمریوں کی عدم دستیابی بتاتے ہیں۔

مولانا شبلی نے ندوہ کے کسی اجلاس میں اس امر کا منظوم ذکر کیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف سے رغبت و دلچسپی نہیں رہی۔ چنانچہ عبدالرزاق کان پوری نے وہ فارسی اشعار بھی کتاب میں نقل کیے ہیں۔ (نظام الملک طوسی، ص:۵)

---

(۱۸)

پروفیسر ٹی، ڈبلو، آرنلڈ

[۱۸۶۴-۱۹۳۰ء]

ایم اے او کالج علی گڑھ میں فلسفہ کے استاد پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ تھے۔ وہ نہ صرف فلسفہ کے بڑے ماہر تھے بلکہ ان کی نظر جدید علوم وافکار پر بھی بڑی گہری تھی۔ وہ یورپ کی جدید تحقیقات اور اسلوب و انداز تحقیقات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ علی گڑھ میں علامہ شبلی سر سید احمد خاں کے بعد پروفیسر آرنلڈ کے بہت قریب رہے اور انھیں سے تعلقات اور افادہ واستفادہ نے علامہ شبلی کو ان اعتراضات سے واقف کرایا جو یورپ کے اہل قلم اسلام پر عائد کرتے تھے۔

پروفیسر آرنلڈ نے ۱۸۹۶ء میں اپنی مشہور کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' لکھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ پریچنگ آف اسلام لکھنے میں علامہ شبلی نعمانی نے ان کی بڑی مدد کی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں اپنے پیارے دوست شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی کا خاص طور پر احسان مند ہوں جنھوں نے اپنے قدیم اسلامی تاریخ کے خزانہ علم سے متواتر مہربانیوں کے ساتھ ہمیشہ میری مدد فرمائی، اگر وہ اپنے اس وسیع علم سے فیاضی کے ساتھ میری مدد نہ کرتے تو اس کتاب کے اکثر حصوں میں جو بیش قیمت واقعات درج ہیں ان سے میں لاعلم رہ جاتا۔'' (اردو ترجمہ دعوت اسلامی، مقدمہ، ص:۲۰)

---

(۱۹)

منشی محمد امین زبیری

[۱۸۶۴-۱۹۵۸ء]

منشی محمد امین زبیری ممتاز اہل قلم تھے۔ عرصہ تک صیغہ تاریخ ریاست بھوپال کے مہتمم رہے۔ علامہ شبلی کے ملنے والوں میں تھے۔ ۱۹۰۷ء میں علامہ شبلی سے ان کا ربط و تعلق قائم ہوا۔ علامہ شبلی نے سیرت نبوی کی تصنیف و تالیف کے لئے جس وقت قوم سے اپیل کی اس وقت محمد امین زبیری، بیگم سلطان جہاں کے لٹریری اسسٹنٹ تھے۔ چنانچہ انھوں نے سیرت کے سرمایہ کی فراہمی کے لئے بیگم سلطان جہاں کو متوجہ کیا اور بیگم صاحبہ نے سیرت کے تمام اخراجات کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ ان کی اس توجہ کی وجہ سے علامہ شبلی سے ان کے روابط گہرے ہوگئے۔ خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہوگیا اور علامہ شبلی نے ان کے نام شکر گذاری کے خطوط لکھے۔ اور یہ بھی کہ بیگم صاحبہ کو دوسرے علمی کاموں کی طرف متوجہ کرادیں۔ یہ تعلق علامہ کے دم واپسیں تک قائم رہا۔ علامہ کی وفات پر انھوں نے جو وفیاتی مضمون لکھا ہے اس میں اپنے دیرینہ تعلق کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ یہ مضمون پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم نے اپنی کتاب ''شبلی شناسی کے اولین نقوش'' میں شامل نہیں کیا ہے، اس لئے ہم نے بیان شبلی حصہ دوم میں شامل کردیا ہے۔

علامہ شبلی سے ان کے گہرے تعلقات ہی کی بنا پر مولانا سید سلیمان ندوی نے انھیں دارالمصنفین کا رکن نامزد کیا اور ان سے دارالمصنفین کے قیام کے سلسلے میں مشورے کئے، اور جب سیرۃ النبی ۱۹۱۸ء میں شائع کی تو اس میں بھی ان کا شکریہ ادا کیا۔

محمد امین زبیری بھوپال سے خواتین کے لئے ایک ماہانہ رسالہ ظل السلطان نکالتے تھے۔ علامہ شبلی نے اس کی تعریف کی اور بعض اہل قلم کو اس میں مضامین لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس رسالہ کے توسط سے محمد امین زبیری صاحب کی رسائی فیضی بیگمات تک ہوئی۔ ایک دن انھیں معلوم ہوا کہ ان کے نام علامہ شبلی کے متعدد خطوط محفوظ ہیں تو انھوں نے اسے حاصل کیا اور ان کی نقل تیار کی۔ ان کی خواہش تھی کہ انھیں ''مکاتیب شبلی'' کے دوسرے ایڈیشن میں بقول ان کے شامل کردیا جائے،

مگر مولانا سید سلیمان ندوی راضی نہیں ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے بابائے اردو کے مجبور کرنے پر ان کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں بھوپال سے شائع کرایا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں تاج کمپنی لاہور نے شائع کیا۔ ان دونوں اشاعتوں پر محمد امین زبیری نے دیباچے لکھے۔ پہلی اشاعت میں مختصر، مگر پھر دوسری اشاعت میں قدرے تفصیل سے لکھا۔ اور یہی دونوں دیباچوں کا مطالعہ ہمارے پیش نظر ہے۔ انھوں نے علامہ شبلی پر دو اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ایک ''ذکر شبلی'' اور دوسری ''شبلی کی رنگین زندگی''۔ ان دونوں کتابوں کے دو ایڈیشن دو مختلف ناموں سے حک و اضافہ کے ساتھ شائع ہوئے گویا وہ انھیں خوب سے خوب تر بناتے اور شائع کراتے رہے۔

خطوط شبلی کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ اس کی دوسری اشاعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جس وقت یہ نادر مجموعہ جناب زہرا بیگم صاحبہ اور جناب عطیہ بیگم صاحبہ کی عنایت سے میرے ہاتھوں تک پہنچا اس وقت میں نے مکاتیب شبلی میں اس کمی کو محسوس کیا اور خیال آیا کہ اس کو شائع کر دیا جائے، لیکن چونکہ میں محض مالی دقت کے لحاظ سے شائع نہیں کر سکتا تھا، اس لئے میں نے مولانا شبلی مرحوم کے ایک نہایت ارادت مند فاضل دوست کو جن کی ذرا سی توجہ اس کی اشاعت کی کفیل ہو سکتی تھی لکھا، لیکن جناب موصوف نے بعض وجوہ سے ان خطوط کی اشاعت ہی مناسب تصور نہ فرمائی، اس لئے میں بھی کسی قدر متردد ہو گیا اور دیگر دوستوں اور بزرگوں سے مشورہ کیا۔ ان میں بعض نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ اور بعض نے علی حالہ شائع کرنے کی رائے دی اور خصوصاً مولوی عبدالحق صاحب نے تو اشاعت پر مجبور ہی کر دیا، اس لئے یہ مجموعہ شائع کیا جاتا ہے۔'' (خطوط شبلی طبع اول ص:۳)

اس کی اہمیت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''غالباً اردو فارسی زبان میں ایسے خطوط کا یہ پہلا مجموعہ ہوگا کہ ایک علامہ دوراں نے خواتین کے نام لکھے ہوں اور اس میں عورتوں کی مختلف خصوصیات کے متعلق ایسے گراں مایہ خیالات ہوں۔'' (ایضاً)

زہرا بیگم اور عطیہ فیضی کے دل میں علامہ شبلی کے احترام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''مجھے یہ بھی کہنا ضرور ہے کہ ان دونوں بیگمات کے دل میں مولانائے مرحوم کی خاص عظمت ومحبت ہے۔ یہ خطوط ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں اور میں نے دیکھا کہ نہایت حفاظت کے ساتھ ان کی آہنی الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ اور ہزاروں اطمینان دلانے کے بعد مجھے اجازت دی گئی کہ میں بمبئی میں اپنے قیام گاہ پر ان کو نقل کروں۔''
>
> نقل کرتے وقت چند خطوط پر پنسل سے ایک نشان بنادیا گیا تھا، اس پر عطیہ صاحبہ کو بہت افسوس تھا اور انھوں نے ایک خط میں بھی اس افسوس کو ذرا تند الفاظ میں ظاہر کیا۔'' (ایضاً ص:۳،۴)

عطیہ فیضی کے شوہر مسٹر رحمین ایک بڑے مصور تھے۔ انھوں نے علامہ شبلی کی ایک تصویر بنائی تھی۔ اس کے بارے میں زبیری صاحب لکھتے ہیں:

> ''ان کے شوہر مسٹر رحمین فیضی نے مولانا کی ایک تصویر بنائی تھی، مسٹر رحمین ایک مشہور آرٹسٹ ہیں اور اس تصویر میں انھوں نے فن مصوری کا کمال دکھایا ہے۔ فرانس کی نمائش ۱۹۱۳ء کی آرٹ گیلری میں اس کی بے انتہا قدر کی گئی اور نہایت معقول قیمت لگی لیکن عطیہ بیگم صاحبہ نے اس کو جدا کرنا گوارا نہ کیا۔'' (ایضاً ص۴)

خطوط شبلی کا انتساب بھی زہرا بیگم اور عطیہ بیگم فیضی کے نام ہے اس کی وجہ زبیری صاحب نے یہ لکھی ہے کہ

> ''یہ دونوں بہنیں جس وقت مولانا کا تذکرہ کرتی ہیں اور ان کے واقعات سناتی ہیں تو ان کے لب ولہجہ اور الفاظ سے وہ احترام وہ عظمت اور وہ محبت نمایاں ہوتی ہے جس کا تعلق سننے اور دیکھنے سے ہے۔'' (ایضا)

اس دیباچے میں سبب اشاعت، خطوط کی انفرادیت، فیضی بیگمات کی علامہ شبلی سے والہانہ عقیدت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نہ علامہ شبلی کے علم وفضل کا ذکر ہے۔ نہ ان کی خطوط نگاری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور نہ ان خطوط کی اہمیت وافادیت بیان کی گئی ہے۔

۹/ سال بعد ۱۹۳۵ء میں محمد امین زبیری نے تاج کمپنی لاہور سے اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا اور پہلے ایڈیشن میں جو کمیاں رہ گئی تھیں انھیں دور کیا۔ اس کی نشاندی تو انھوں نے نہیں کی ہے کہ پہلے ایڈیشن میں کیا کمیاں رہ گئی تھیں اور وہ کیسے دور کی گئیں۔ البتہ جو چیز سامنے ہے وہ یہ کہ اس میں انھوں نے پہلے کے مقابلہ میں کسی قدر مفصل دیباچہ لکھا ہے۔

اس دوسرے دیباچہ میں علامہ شبلی کے حالات پر ایک نظر ڈالی ہے۔ رتبے کے لحاظ سے انھوں نے ان کی عظمت و جامعیت اور خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان کی جذباتی فطرت کا بھی ذکر کیا ہے اور اس فطرت کو انھوں نے علامہ شبلی کے تمام علمی، ادبی، اور شعری کارناموں پر حاوی ثابت کیا ہے۔ خاص طور پر سلطان عبدالحمید خاں کی سواری اور رسم سلاملق میں شرکت اور ان مواقع پر ان کی جذباتی کیفیت وغیرہ کو قلم بند کیا ہے اور اس سے متعلق اور بہت سی مثالیں دی ہیں اور انھیں خاصا جذباتی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ

> ''اس قسم کے بکثرت واقعات ہیں اور ان کی یہ حالت ان کی نظموں، خطوں، مضامین حتیٰ کہ بعض تصنیفات میں بھی نمایاں ہے۔ ان کے اکثر عظیم الشان کارناموں کا محرک یہی جذبہ ہے۔ سیاسیات ملکی، وقف علی الاولاد کو قانونی حیثیت میں لانے کی سعی مشکور۔ دارالمصنفین کا قیام سب ایسے ہی جذبات کا نتیجہ ہیں۔'' (خطوط شبلی، ص:٦)

اس کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آئے ہیں اور علامہ شبلی کے خواتین کے بارے میں جو خیالات تھے، ان کا ذکر کیا ہے اور امرت سر اور دہلی کی ان کانفرنسوں کا ذکر کیا ہے جن میں علامہ شبلی نے خواتین کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو کی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کے ایک خط کا جو انھوں نے مولانا ظفر علی خاں کو لکھا تھا اس کا اقتباس بھی نقل کیا ہے (خطوط شبلی ص:۷)

پھر ذاتی طور پر ان سے خواتین کے سلسلہ میں جو گفتگو رہی ان کو بیان کیا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ علامہ شبلی نے ان سے کہا کہ'' کاش کوئی لڑکی پانچ چھ برس کی عمر سے میرے ساتھ سفر حضر میں رہتی، میں خود تعلیم و تربیت کرتا اور دکھاتا کہ مسلمان خاتون کیا کچھ کر سکتی ہے۔'' (خطوط شبلی، ص:۸)

پہلے جذباتیت اور پھر جذباتیت کے عناصر خطوط میں، پھر خواتین کے بارے میں ان کے جذبات اور آخر میں لڑکی کی تربیت کا قصہ، یہ سب دراصل تسلسل کے ساتھ اس لئے ذکر کئے جارہے ہیں کہ ''خطوط شبلی'' کے ذکر میں اور آئندہ فسانہ بنانے میں نقش ونگار کا کام دیں۔

اس کے بعد وہ علامہ شبلی کے وطن بندول، وہاں کی خواتین کی جہالت اور رسم وروایات میں ان کے جکڑے ہونے وغیرہ کا ذکر کر کے علامہ کی تجرد کی زندگی اور عقد ثانی کی خواہش وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں علامہ شبلی کے سر میں صرف یہی سودا سمایا ہوا تھا۔ حالانکہ یہی وہ دور ہے جس میں انہوں نے ندوہ کی تعمیر وترقی کے لئے جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ ''شعرالعجم'' جیسی معرکۃ الآرا اور ''الانتقاد'' جیسی تحقیقی کتاب لکھ رہے تھے جس سے آنکھوں میں پانی اتر گیا تھا۔ سیرۃ النبی کا خاکہ بن رہا تھا۔ ان کاموں کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔

اس کے بعد علامہ شبلی کی نفاست اور ہر چیز میں نفاست، پھر مذاق اور شاعری اور غزل گوئی کا ذکر کرتے ہیں اور بڑی خوب صورتی سے حالی کا وہ قول جو انھوں نے ''دستہ گل'' پر لکھا تھا، نقل کیا ہے۔ (خطوط شبلی، ص:۹)

پھر موسیقی سے مناسبت اور اس سلسلے میں ان کے مطالعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں ان کے استغنا کا بھی ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مزاج میں استغنا اور خودداری کی صفات درجہ کمال پر تھیں۔ انھوں نے ذاتی فائدہ کے لئے کبھی تگ ودو نہیں کی اور نہ کبھی خوشامد سے ان کے لب آشنا ہوئے، قومی ضرورتوں کے لحاظ سے کبھی کبھی مدح سرائی ضرور کی ہے، مگر بہت کم۔
>
> اپنی کثیر التعداد تصانیف سے انھوں نے کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہیں کیا۔
>
> بہت سی کتابوں کا حق تصنیف مدرسۃ العلوم، ندوہ اور اپنے احباب کو ہبہ کر دیا اور یہی نہیں بلکہ جس نے جو چاہا طبع کرا لیا اور خوب نفع کمایا، آخر میں انھوں نے اپنا تمام علمی ذخیرہ اور نادر کتب خانہ جو تمام عمر کا سرمایہ تھا ندوہ اور دارالمصنفین کو وقف کر دیا اور دارالمصنفین کے لئے ایک وسیع رقبہ کا باغ اور دو بنگلے مزید برآں تھے۔''
>
> (خطوط شبلی، ص:۱۰۰)

پورے دیباچے میں اصل موضوع پر آنے سے پہلے انھوں نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے، مذکورہ بالا اقتباس کو مقطع میں سخن گسترانہ بات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا بیان سے مولانا کی طبیعت و مزاج اور خیالات کا اندازہ کرانے کے بعد اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ جس وقت ممبئی کے ممتاز خاندان فیضی سے ان کا تعارف ہوا اس وقت عطیہ بیگم اپنی تعلیم کے لحاظ سے بہت کچھ شہرت رکھتی تھیں۔ انھوں نے آزادانہ تعلیم پائی تھی اور پہلی مسلمان خاتون تھیں جو یورپ تعلیم کو گئی تھیں، ممبئی کے تعلیم یافتہ خاندانوں کی طرح آزادانہ معاشرت تھی، یہ خاندان عرصہ تک استنبول میں مقیم رہا تھا، ان کے والد تاجر تھے اور بسلسلہ تجارت وہاں قیام تھا۔'' (خطوط شبلی، ص:۱۰)

اس کے بعد محمد امین زبیری نے زہرہ بیگم اور نازلی رفیعہ بیگم کی قابلیت اور ذوق تصنیف و تالیف کا ذکر کیا ہے۔ ان کی مجالس، علماء کی قدر و منزلت اور احترام وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے اور ان تینوں کے موازنہ کے بعد عطیہ بیگم کو سب سے زیادہ ذہین اور تیز بتایا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

''مولانا نے ان میں وہ سب جوہر دیکھے جن سے ایک خاتون قابل رشک مرتبہ حاصل کر سکتی ہے۔ ان کے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ ان جوہروں کی جلا دیں اور عطیہ بیگم کو ایک نمونہ بنادیں۔ رفتہ رفتہ اس خاندان سے ان کے عزیزانہ تعلقات ہوگئے، پھر ندوہ کی امداد اور اتحاد خیال نے ان میں اور مضبوطی پیدا کردی۔ راقم کو بارہا ان بیگمات سے ملنے کا موقع ملا ہے اور مولانا کی نسبت محبت واحترام کا جوش جوان میں نظر آیا وہ قریب ترین احباب اور تلامذہ (؟) میں بہت کم پایا گیا۔'' (خطوط شبلی، ص:۱۱)

اس کے بعد پہلے ایڈیشن کا دیباچہ معمولی حذف واضافے کے ساتھ شامل ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس میں کئی قابل ذکر باتیں ہیں۔ خاص طور پر آخری جملہ جو دراصل مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اور مولانا سید سلیمان ندوی پر چوٹ ہے، جنھوں نے خطوط شبلی کی اشاعت

سے احتراز کیا تھا۔

زبیری صاحب سے علامہ شبلی کے جس زمانہ میں تعلقات قائم ہوئے، ان کی تمام تر توجہ سیرۃ النبی کی طرف تھی، زبیری صاحب نے خطوط شبلی کے دونوں ایڈیشن کے دیباچوں سیرۃ النبی کا نام تک نہیں لیا ہے۔ اور نہ ان کے دوسرے مذہبی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس سے علامہ شبلی کی شخصیت کا جو مرقع بنتا وہ خطوط شبلی کی اشاعت کے پس منظر میں فٹ نہیں ہوتا۔ پہلے ایڈیشن کی اس کمی کی طرف کسی نے اشارۃً متوجہ بھی کیا تھا۔ اس کے باوجود زبیری صاحب نے توجہ نہیں دی۔

خطوط شبلی کا مقدمہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے قلم سے ہے، جنھوں نے علامہ شبلی کی سخت اہانت بلکہ ہجو کی ہے اور انھیں عاشقوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ مگر زبیری صاحب اس مقدمہ کے بھی مداح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”بعض لوگوں نے مؤلف سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان خطوط کی نسبت کو ناپسند کیا۔ بعض نے ان کی اشاعت کو اس عقیدت و نیاز مندی کے خلاف جانا جو راقم کو مولانا مرحوم کی ذات گرامی کے ساتھ ہے۔ بعض نے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ میں متعصبانہ جھلک دیکھی جو خود ان کے اپنے خیالات نے پیدا کردی۔ حالانکہ مقدمہ تو ایک بہترین ادبی تبصرہ ہے۔“ (خطوط شبلی، ص:۱۲)

ان تمام اعتراضات اور شکوک وشبہات کا ازالہ زبیری صاحب کے نزدیک ان خطوط میں مضمر ہے اور بس ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ شبلی کے جذبات وغیرہ کے بارے میں میں نے جو کچھ لکھا ہے معترضین اگر اس کا مطالعہ کریں گے تو انھیں اپنے خیالات پر ہنسی آئے گی۔ چونکہ ہمارا موضوع ان دیباچوں کے مطالعہ سے آگے کچھ کہنے کی اجازت نہیں دیتا ورنہ زبیری صاحب نے اپنی آئندہ کتابوں میں علامہ شبلی کی شخصیت کو متہم کرنے کے لئے جو کچھ لکھا ہے، وہ علامہ شبلی کیا کسی معمولی شخص کے لئے بھی روا نہیں ہوسکتا، اور نہ اس سے زیادہ کسی کی توہین و تضحیک کی جاسکتی ہے۔

---

(۲۰)

ڈاکٹر ایچ، آر، تیموری

[***]

مولوی عبدالرزاق کان پوری[۱۸۶۲-۱۹۴۸ء] کی کتاب یادِ ایام کا مقدمہ ڈاکٹر ایچ، آر تیموری نے لکھا ہے۔ یہ محکمہ آثار قدیمہ بھوپال کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔اس سے زیادہ ان کے متعلق معلومات دستیاب نہیں۔

''یادِ ایام'' کے مقدمہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ ایک مستشرق پروفیسر ڈیمیری نے اپنی کتاب ''ویسٹرن کلچران ایسٹرن لینڈ'' میں برطانوی ہندوستان کے مصنّفین کا ذکر کیا ہے۔اس کا خیال ہے کہ برٹش انڈیا میں جس قدر ادیب اور مصنف پیدا ہوئے، ان میں تین ایسے اہل قلم تھے جن کا طرز انشا یورپ کے اسلوب کے مطابق ہے۔اس میں ایک اہم نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔
(عبدالرزاق کانپوری۔یادایام،ص:۹)

---

(۲۱)

مولانا فتح محمد خاں جالندھری

[پ:۱۸۶۴ء]

جس زمانہ میں علامہ شبلی نعمانی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے اردو قواعد یعنی صرف ونحو پر کتاب مرتب کرانا چاہتے تھے۔اسی زمانہ میں مولانا فتح محمد خاں جالندھری نے اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب مصباح القواعد لکھی۔علامہ شبلی نے اسے پسند کیا اور ضروری تصحیح کے لئے مولوی حیدر علی نظم طباطبائی[۱۸۵۳-۱۹۳۳ء] کے ذمہ کیا۔چنانچہ انہوں نے بہ نظر غور وشوق دیکھا اور جو ضروری ترمیمات واصلاحات کیں۔ان کی نشاندہی کے بعد مصباح القواعد بڑے اہتمام سے انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہوئی۔یہ تمام تفصیلات

مولوی فتح محمد خاں صاحب نے کتاب کے دیباچہ میں لکھی ہیں۔ (دیباچہ، مصباح القواعد، ص:۱۱)

علامہ شبلی نے مصباح القواعد کے متعلق انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ میں بھی یہ تمام باتیں سپرد قلم کی ہیں۔ بعد میں فاضل مرتب نے مصباح القواعد کا دوسرا حصہ بھی مرتب کیا ہے۔

مولانا فتح محمد جالندھری بڑے عالم وفاضل شخص تھے۔ انہوں قواعد سے متعلق کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں ایک منہاج القواعد بھی ہے۔ یہ کتابیں انہوں نے عطر چند پبلی کیشنز لاہور کی فرمائش پر لکھیں اور عطر چند پبلی کیشنز لاہور ہی نے انہیں شائع بھی کیا، لیکن مولانا کا اصل کارنامہ جسے نہ فراموش کیا جاسکا اور نہ کیا جاسکے گا وہ ہے ان کا ترجمہ وتفسیر قرآن فتح الحمید۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مصباح القواعد کی پسندیدگی اور اس کی اشاعت کے سوا علامہ شبلی سے کسی تعلق کا اب تک ذکر نہیں ملا ہے، تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں علامہ شبلی اگر کسی کتاب کو پسند کر لیں تو یہ بجائے خود بہت بڑی بات خیال کی جاتی تھی اور مصنفین اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

---

(۲۲)

مولانا حمید الدین فراہی

[۱۸۶۴-۱۹۳۰ء]

نامور عالم ومفسر قرآن علامہ حمید الدین فراہی علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد تھے۔ بڑے لائق وفائق بلکہ عبقری شخص تھے۔ علامہ شبلی سے تعلیم پائی، پھر علی گڑھ سے بی اے کیا، جس میں پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ اس وقت ایم اے اوکالج الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا۔

انہوں نے ابتدا ہی سے اپنے مطالعہ وتحقیق کا موضوع قرآن مجید کو بنایا اور پھر مدۃ العمر اسی پر کاربند رہے۔ تفسیر نظام القرآن اور دوسری تفسری رسائل ان کے کارنامے ہیں۔ یہ علامہ شبلی سے بے حد متاثر ہوئے اور ہمیشہ رہے۔ لیکن دونوں کے میدان علاحدہ علاحدہ رہے۔ البتہ نظام تعلیم وتربیت میں دونوں کے درمیان اتحاد مذاق کا ذکر مدرسۃ الاصلاح کی رودادوں سے ہوتا

ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کا نظام ونصاب تعلیم انہی نے بنایا۔ اس میں بھی دونوں کا نقطہ نظر ایک ہی ہے۔ دونوں کے تاثیر وتاثر کی داستان تفصیل طلب ہے۔ بعض اہل قلم نے جس میں مولانا سید سلیمان ندوی کو علامہ شبلی نعمانی سے بڑا عالم لکھا ہے، اسی طرح بعضوں نے قرآنیات میں علامہ شبلی پر فوقیت دینے کی کوشش کی ہے اور واقعہ یہ ہے اس سلسلہ میں بھی علامہ نے ان کی رہبری کی تھی جیسا مکاتیب اور مقالات شبلی کے بعض مشمولات سے معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال علامہ شبلی نے انہیں تعلیم دی تھی اور ہر موقع پر ان کی سرپرستی بھی کی۔ اور مولانا فراہی بھی بڑے بھائی اور استاد ہی کی طرح ان کا ادب واحترام کرتے رہے۔

---

(۲۳)

نواب سید علی حسن خاں

[۱۸۶۶-۱۹۳۶ء]

نواب سید علی حسن خاں نواب سید صدیق حسن خاں [۱۸۲۳-۱۸۹۰ء] کے صاحبزادے مشرقی علوم میں بڑا درک رکھتے تھے۔ بھوپال میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ تصنیف وتالیف کا بڑا عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکلیں۔ مولانا شبلی کے خاص احباب میں تھے۔ ان کے بھوپال کے زمانہ قیام سے تعلقات کا آغاز ہوا جب علامہ شبلی سرسید کے ساتھ حیدرآباد جاتے ہوئے بھوپال ٹھہرے تھے۔ پھر وہ لکھنؤ آگئے اور بھوپال ہاؤس کو مستقل مستقر بنالیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد علامہ شبلی بھی حیدرآباد سے لکھنؤ آگئے تو دونوں کے تعلقات میں اور اضافہ ہوگیا۔ وہ علامہ شبلی سے ملنے اکثر ندوہ آتے اور علامہ شبلی بھی ان کے یہاں اکثر جایا کرتے تھے اور کئی کئی روز تک ان کے یہاں قیام کرتے تھے۔ جب کبھی اس میں تاخیر ہوجاتی تو نواب صاحب سواری بھیج کر علامہ شبلی کو بلواتے۔ علامہ شبلی کی وفات کے بعد ندوہ کے ناظم مقرر ہوئے، مگر پھر مستعفی ہوگئے۔

ان کا بڑا علمی کارنامہ اپنے والد نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی مفصل سوانح عمری ہے۔

جو ''مآثر صدیقی'' کے نام سے چار حصوں میں شائع ہوئی ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن جو مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا، راقم الحروف کے پیش نظر ہے۔اس میں نواب سید علی حسن خاں نے اصل حالات سے پہلے جو مقدمہ لکھا ہے جو ان کے وسیع مطالعے اور اسلامی علوم وفنون پر گہری نظر کا پتہ دیتا ہے۔ خاص طور پر فن تاریخ کے آغاز وارتقا پر انھوں نے جو بحث کی ہے وہ بڑی عالمانہ ہے۔اس میں انھوں نے فلسفہ تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ابن خلدون کو اس کا بانی قرار دیا ہے۔ پھر ہندوستان کے مورخین پر تبصرہ کیا ہے اور اس میدان میں انھوں نے علامہ شبلی کی انفرادیت کا ذکر کیا ہے۔تاریخ میں تہذیب وتمدن سے مورخین کی بے اعتنائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ فن تاریخ ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو فلسفہ اور عقلیات سے آشنا نہ تھے۔اس فلسفہ تاریخ کے اصول ونتائج پر ان کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہندوستان میں علامہ ممدوح پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ تاریخ کے اصول روایت ودرایت پر اپنی تاریخی تصنیفات کی بنیاد رکھی اور جس دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی کے ساتھ مختلف عنوانوں کے تحت میں انھوں نے نہایت مفید جزئی وکلی حالات کا استقصا کیا وہ انھیں کا حصہ تھا۔
>
> علامہ ممدوح کی تالیف وتصنیف نے ارباب قلم کے لئے ایک نئے باب کا اضافہ کردیا اور اہل ہند میں تاریخی مذاق پیدا کر کے گویا ایک صلائے عام دیدی۔اس لئے چند دنوں میں بہت سی سوانح عمریاں جمع ومرتب ہوکر مشتہر ہوگئیں اور تھوڑے عرصہ میں ایک عظیم الشان ذخیرہ تاریخی واقعات اور اسلاف کے حالات کا فراہم ہوگیا۔''

(مآثر صدیقی۔حصہ اول،ص:۵)

اس نقطہ نظر کا اظہار بعض دوسرے اہل قلم نے بھی اپنی تحریروں میں کیا ہے،جن کا ذکر آئندہ اوراق میں آرہا ہے۔

---

(۲۴)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

[۱۸۶۷-۱۹۵۰ء]

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تحریک ندوہ کے ممتاز فرد تھے اور علم و دانش میں اپنے عہد میں منفرد مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے متعدد علمی و دینی اور سوانحی کتابیں لکھیں۔ شعر و ادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے اور اردو و فارسی دونوں زبانوں میں دادِ سخن دیتے تھے۔ ان کے فارسی کلام کا مجموعہ ''کاروانِ حسرت'' مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ سے شائع ہو چکا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے اور دونوں کے آخری دم تک انتہائی خوش گوار تعلقات رہے۔ ماہنامہ الندوہ انہیں دونوں کی مشترکہ ادارت میں نکلا تھا۔ بعض کتابوں کی تصنیف میں انہوں نے علامہ شبلی سے مشورے کیے۔ انہوں نے علامہ شبلی کی کئی کتابوں پر مفصل تبصرے لکھے ہیں۔ ان کی وفات پر بھی بڑا مفصل مقالہ لکھا ہے۔ ان کی یہ تمام تحریریں مقالاتِ شروانی میں شامل ہیں۔ مکاتیبِ شبلی میں ان کے نام علامہ شبلی کے ۱۱۸ر خطوط اور مکتوباتِ شبلی میں ۲۴ر خطوط شامل ہیں۔ بعد میں چند اور خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان سے دونوں کے نہ صرف گوناگوں تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ علمی، فکری اور ادبی موضوعات میں افادہ و استفادہ کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ دونوں کے ربط و تعلقات پر ہمارے دوست ڈاکٹر عطا خورشید نے ماہنامہ معارف کے شبلی نمبر [نومبر، دسمبر ۲۰۱۴ء] میں بہت عمدہ مقالہ لکھا ہے۔ کتاب ''مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں'' میں پہلا مضمون انہیں کے قلم سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بڑی صحبت مولانا شبلی صاحب مرحوم کی صحبت تھی، یہ موصوف کے ورودِ علی گڑھ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ سب سے پہلے میں نے موصوف کو کشتی کے اکھاڑے میں دیکھا تھا۔ ہر صحبت میں ادبی و تاریخی تذکرے رہتے تھے۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، شعرالعجم کا مطالعہ کیا، تبصرے لکھے۔ ان کتابوں کے مطالعے میں کلام کی برجستگی، مورخانہ بیان اور

وقائع نگاری کی قوت نے خصوصاً دل پر اثر ڈالا۔‘‘

(مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص:۴۰)

مولانا شروانی اپنی فارسی غزلیں اکثر ان کے پاس بھیجا کرتے تھے اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتے۔ داد دیتے اور کبھی کبھی اصلاح بھی کر دیا کرتے تھے۔ ان کے مجموعہ کلام کاروان حسرت کے مرتب عبدالشاہد شروانی نے لکھا ہے کہ امیر مینائی کے بعد وہ علامہ شبلی سے دادِ سخن لیتے رہے۔ ان کے اسی پاکیزہ ادبی ذوق کی بنا پر علامہ نے انہیں فارسی شعر وادب کی تاریخ شعر العجم کی تدوین کی طرف متوجہ کیا تھا، مگر وہ اس کی طرف توجہ نہ کر سکے اور علامہ ہی کو شعر العجم لکھنا پڑا۔

---

(۲۵)

حکیم محمد محسن فاروقی

[***]

مولوی حکیم محمد محسن فاروقی بچھرانوی نے الفوز الاصغر کا ترجمہ القول الاظہر کے نام سے کیا ہے۔ جو مطبع مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے متعدد بار شائع ہوا۔ ہمارے پیش نظر طبع سوم ۱۹۲۲ء ہے۔ یہ ترجمہ علامہ شبلی کی خواہش پر کیا گیا ہے۔ مترجم لکھتے ہیں:

’’جس زمانہ میں علامہ شبلی حیدر آباد میں تشریف فرما تھے اور انجمن ترقی اردو کا کام جناب ممدوح کے سپرد تھا میں نے اس کتاب کے ترجمہ کا نمونہ انجمن کو بھیجا۔ نہ صرف نمونہ پسند کیا گیا بلکہ علامہ موصوف نے از راہ الطاف بزرگانہ ایسے الفاظ میں اپنی رائے تحریر فرمائی جو اس ہیچمدان و ہیچمرز کے لئے مایہ فخر وناز تھی۔ میں ان الفاظ کو محض اظہار افتخار کے لئے یہاں درج کرتا ہوں۔ مولانا نے تحریر فرمایا تھا ’’ترجمہ بہت اچھا ہے، میں خود اس سے بہتر ترجمہ نہیں کر سکتا۔‘‘ مولانا کے اس محبت آمیز و حوصلہ افزا انکسار نے میری پژمردہ وافسردہ ہمت کے ساتھ مسیحائی کا کام کیا۔ اور مجھے تکمیل ترجمہ پر آمادہ کیا۔‘‘ (القول الاظہر، ص:۲)

(۲۶)

احسن لکھنوی

[۱۸۶۸-۱۹۳۹ء]

سید مہدی حسن، احسن لکھنوی اگرچہ ادیب وشاعر تھے، تاہم ان کا نام ڈرامہ نگاری کے میدان میں زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ انہوں ''واقعات انیس'' کے نام سے ایک عمدہ کتاب لکھی ہے۔ ان کی یہ کتاب مولانا سید امجد علی اشہری کی کتاب ''حیات انیس'' کے بعد منظر عام پر آئی۔ علامہ شبلی نعمانی کی شہرۂ آفاق کتاب ''موازنہ انیس ودبیر'' کے بعد انیس ودبیر پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں شاید ہی کوئی ایسی تصنیف یا مصنف ہو جو علامہ شبلی کے موازنہ انیس ودبیر سے متاثر نہ ہوا ہو۔ یا کم ازکم اس کا گہرائی سے مطالعہ نہ کیا ہو۔ چار کتابیں تو اسی زمانہ میں موازنہ انیس ودبیر کے جواب میں ردعمل کے طور پر وجود میں آئیں۔ علاوہ ازیں جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں موازنہ کے ذکر وتعارض کے بنا کام نہیں چل سکتا تھا اور نہ چلا۔ یہی حال مہدی حسن احسن لکھنوی کا بھی ہے۔ بلکہ انہیں سید امجد علی اشہری کی کتاب سے بھی الجھن ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میری کتاب کے شائع ہونے سے پہلے میر انیس کے متعلق دو کتابیں دو فاضل اہل قلم کے ہاتھ سے مرتب ہو کر نکلیں۔ ایک تو علامہ شبلی جیسے مستعد اہل قلم کے خیالات کا نتیجہ۔ اور دوسرے جناب اشہری کی فکر عالی کا نمونہ۔''

(واقعات انیس، ص:۱۵)

احسن لکھنوی نے اپنی کتاب بہتر ثابت کرنے کے لئے دونوں مصنفین پر تنقید کی ہے لیکن اس میں بھی انہوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ موازنہ انیس ودبیر کے بارے میں لکھا ہے کہ

> ''علامہ شبلی نے میر ومرزا کا موازنہ کیا ہے اور وہ موازنہ کیسا ہے اس سے مجھے کچھ بحث نہیں۔ اگر شکایت ہے تو اسی قدر ہے کہ کلام کا اقتباس بازاری مرثیوں سے کیا گیا ہے، جن کی صحت میں صاحبان تحقیق کو کلام ہے۔ اگر یہ بات دکھائی جائے کہ علامہ شبلی نے میر صاحب کے مرثیوں میں کہاں کہاں تحریف کی ہے تو

طول عمل ہوگا، مگر مصرعہ کا مصرعہ غلط ہیں۔'' (واقعات انیس، ص:۱۵-۱۶)

موازنہ کے بارے میں احسن لکھنوی کوئی نئی بات نہیں کہہ سکے۔ حالانکہ ان کی نظر گہری اور مطالعہ وسیع تھا۔ اس سے ان کی سہل انگاری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب کے نام سے بھی لوگ واقف نہیں۔ رہا موازنہ تو وہ ایک ایسی کتاب ہے جو ایک صدی سے زاید مدت سے عاشقان انیس کے لئے چراغ راہ اور نام نہاد بہی خواہان دبیر کے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ اس میں مرزا دبیر کے کچھ کم محاسن نہیں بیان ہوئے ہیں۔ البتہ میر انیس کو مرزا دبیر پر فوقیت دینا دبیریوں کو راس نہیں آیا۔

---

(۴۷)

قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ

[•••]

قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ ادیب، شاعر، ماہر تعلیم اور مسلم جارج اسکول اعظم گڑھ میں معلم تھے۔ وہ اردو فارسی دونوں میں داد سخن دیتے تھے۔ ضلع اعظم گڑھ کی ایک مردم خیز بستی قاضی کی سرائے کے رہنے والے تھے۔ پھر شہر اعظم گڑھ کے محلہ سیتارام میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اپنے تخلص پر مکان کا نام 'حیرت منزل' رکھا تھا۔

قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ نے ابتدائی تعلیم کے بعد جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر وہیں استاذ (سکنڈ مولوی) مقرر ہوئے۔ اس وقت علامہ شبلی کے قائم کردہ نیشنل اسکول کا نام مسلم جارج اسکول ہو گیا تھا۔ سنہ تقرر معلوم نہیں ہو سکا۔ غالباً ۱۹۰۵ء سے پہلے وہ استاذ مقرر ہوئے اور ۱۹۲۹ء کے بعد سبکدوش ہوئے۔ یہاں کی تدریس کے زمانہ میں انہوں نے درجہ ۳، ۴، ۵ کے طلبہ کے لئے اردو نحو وصرف کی کئی منظوم نصابی کتابیں لکھیں۔ جن کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

[۱] انگریزی قادر نامہ منظوم بخط اردو، جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ، ۱۹۱۷ء [۲]

قادرنامہ منظوم (بخط ہندی) [۳] ترجمان پارسی، جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ، ۱۹۱۷ء [۴] تہذیب القواعد: حصہ اول، جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ، ۱۹۱۸ء [۵] تہذیب القواعد: حصہ دوم [۶] تہذیب القواعد: حصہ سوم [۷] اپر پرائمری ریڈر مسمی بہ گلدستہ تہذیب، جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ، ۱۹۲۲ء [۸] حیرۃ الفقہ، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۲۹ء [۹] ماتم شبلی [۱۰] فارسی آموز [۱۱] مثنوی عجیب وغریب پرشین ٹیچر

مذکورہ بالا کتابوں میں کئی کتابیں راقم کی نظر سے گذری ہیں۔ قاضی حیرت کی کتابوں کے بارہ میں مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ

"مجھے اکثر مصنف ممدوح کے مسودات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی زندگی کا مقصد زیادہ تر چھوٹے بچوں کی زندگی کی تہذیب واصلاح ہے۔ اسی غرض سے وہ کتابیں اور رسالے لکھتے ہیں۔ اور ان میں تمام ضروری مسائل کو نہایت سلیس اور عام فہم بنا دیتے ہیں۔"

(قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ، حیرۃ الفقہ، ص:۳۹)

قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ کے خانوادہ شبلی سے گھریلو تعلقات تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ چونکہ دونوں خانوادے تعلیم یافتہ تھے، اس بنا پر دیرینہ روابط قائم رہے۔ اسی تعلق کی بنا پر علامہ شبلی نے حامد حسن نعمانی اور برادر خرد جنید نعمانی کی سرپرستی انہیں قاضی عبدالرحمٰن حیرت کو سونپی تھی۔ مرثیہ "ماتم شبلی" کے ایک حاشیہ میں حیرت نے یہ بات لکھی ہے۔

انہیں علامہ شبلی سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔ اورینٹل اسکول کی تدریس کے زمانہ میں خاص علامہ شبلی کے نظریہ تعلیم پر غور وفکر اور اس کو سمجھنے کے لئے انہوں نے علی گڑھ کا سفر کیا اور علامہ کے مہمان ہوئے۔ اور ان سے جدید نظریہ تعلیم کی تفہیم کے بعد واپس آئے۔ یہی سبب ہے کہ وہ علامہ شبلی کا جہاں ذکر کرتے ہیں استاد کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی کے سانحہ وفات پر بڑا دلدوز مرثیہ لکھا ہے۔ جو کاظمی پریس جون پور سے "قطرات اشک" کے نام سے چھپا ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

علم اور فضل کا جو جوہر روحانی تھا
وہ کہ جو فن کمالات کا اک بانی تھا
مصرِ اسلام کا جو یوسف کنعانی تھا
وہ کہ جو رحمتِ حق ، سایۂ یزدانی تھا

حیف صد حیف کہ تاریک جہاں ہوتا ہے
آفتاب اس کی تجلی کا نہاں ہوتا ہے

بے محل تھا ابھی محفل سے ترا گھبرانا
تری کوشش کو تو باقی تھا ابھی پھل لانا
جلوۂ سیرت نبویؐ تھا ابھی دکھلانا
کیوں پسند آیا تجھے ملکِ عدم کا جانا

یوں بھلا عزم فنا کوئی بشر کرتا ہے
میرے آقا کوئی اس طرح سفر کرتا ہے

اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دو اور مرثیے کہے ہیں۔ شبلی منزل پر بھی ایک نظم کہی ہے۔ ان کی یہ تخلیقات طوالت کے سبب یہاں نقل نہیں کی جا رہی ہیں۔ ان کا مفصل تذکرہ ناچیز نے اپنی کتاب ''شبلی: سخنوروں کی نظر میں'' کیا ہے۔

---

(۲۸)

حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی

[•••]

حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی صاحب قلم تھے۔ داد سخن بھی دیتے تھے۔ متعدد کتابیں یا مرتب کیں۔ علامہ شبلی کی تاریخی نظموں کا پہلا مجموعہ ''تاریخی جواہر'' انہیں نے مرتب کر کے شائع کرایا تھا۔ جواب نایاب ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر نے اس کا اگر دلگداز میں ذکر نہ کیا ہوتا تو آج

کوئی اس کے نام سے بھی واقف نہ ہوتا۔ (ماہنامہ دلگداز، لکھنو، اگست ۱۹۱۶ء، ص: ۱۹۲)

اظہر دہلوی نے مغل شہزادی زیب النساء کی مفصل سوانح عمری لکھی ہے۔ جو ہندوستانی اسٹیم پریس لاہور سے ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی نعمانی ایک ایسے بزرگ ہیں جن کو تاریخ کا فردوسی کہنا چاہئے۔ تحقیق واقعات میں مولانا کا جو پایہ ہے وہ میرے بیان کا محتاج نہیں۔ لہٰذا اگر ان سے توقع کی جاتی کہ وہ شہزادی زیب النساء کی مفصل سوانح عمری لکھ کر پیش کریں گے تو بے محل نہ تھی۔ اور میں عرصہ سے اس کا متمنی تھا۔ مگر مولانا نے الندوہ میں صرف دس بارہ صفحہ کا ایک آرٹیکل شہزادی کے متعلق لکھ کر خاموش رہ گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسی عظیم الشان شہزادی کی لائف کے لئے ضرورت تھی کہ نہایت تفصیل سے لکھی جاتی۔ میں نے سوانح ہر طرح مکمل کرنے کی کوشش کی اور جہاں تک ہوسکا تواریخ سے مدد لی۔ لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ جیسی میری تمنا تھی ویسی یہ سوانح عمری نہیں لکھی جاسکی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اگلے ایڈیشن میں اس کے مضامین میں کچھ اضافہ ہوسکے۔

گو مولانا کا متذکرہ بالا آرٹیکل مختصر تھا، لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس سے بڑی مدد ملی۔ چنانچہ میں نے جابجا اس کا حوالہ دیا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو مجھے اس سوانح عمری کے لکھنے کا خیال ہی یہ آرٹیکل دیکھ کر ہوا، اس لئے مجھے مولانا موصوف کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔'' (نواب زیب النساء بیگم، ص ۶-۷)

---

(۲۹)

صفدر مرزا پوری

[۱۸۷۰-۱۹۳۰ء]

منشی صفدر علی صفدؔر مرزا پوری اردو کے ایک ممتاز ادیب اور شاعر تھے۔ دیوان صفدر، دور

فلک اور بزم خیال ان کی تخلیقات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اساتذہ سخن، ادیبوں اور محققین کے معلومات افزا خطوط کا مجموعہ دو حصوں میں مرتب کیا۔ پہلا حصہ ۱۹۲۰ء میں نول کشور لکھنو سے اور دوسرا حصہ ۱۹۲۷ء میں صدیق بک ڈپو لکھنو سے شائع ہوا۔ دوسرے حصہ میں علامہ شبلی کا ایک خط جو قاضی محمد خلیل حیراں رئیس بریلی کے نام ہے، شامل ہے۔ یہ خط اب مکتوبات شبلی طبع جدید میں شامل کرلیا گیا ہے۔ علامہ شبلی کے ذکر میں صفدر مرزاپوری نے لکھا ہے کہ

> ''شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی وہ باکمال بزرگ گذرے ہیں جن کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں۔ جس کی شاہد عینی آپ کی تصانیف و تالیف ہیں۔ فن تاریخ دانی میں ہندوستان میں تو کیا یورپ میں بھی آپ کا جواب نہ نکلے گا۔ آپ کے کمال پر آپ کے وطن اعظم گڑھ کو جس قدر بھی فخر ہو کم ہے۔'' (مرقع ادب، دوم ص:٦)

---

(۳۰)

سید اولاد حیدر فوق بلگرامی

[۱۸۷۰-۱۹۴۲ء]

مولانا مولوی سید اولاد حیدر فوق بلگرامی ایک بڑے شیعہ عالم و مصنف گذرے ہیں۔ انہوں نے تقریباً دو درجن سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ ان کا قابل ذکر کام علامہ شبلی کی معرکۃ الآرا تصنیف سیرۃ النبی کا ''اسوۃ الرسول'' کے نام سے رد لکھنا ہے۔ اسوۃ الرسول چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ مفصل مقدمہ سیرت کا ڈھائی سو صفحات کی ایک جلد میں رد لکھا ہے۔ ناچیز کے لئے ان کی کتاب کا ان کے اسلوب نگارش کی بنا پر پڑھنا اور سمجھنا کار دارد تھا۔ غالباً سیرت نبویؐ پر لکھنے والوں نے اسی بنا پر اس سے تعارض نہیں کیا ہے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم نے سیرۃ النبی کا ناقدانہ جائزہ ''مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار'' ہندو پاک سے شائع کرایا ہے، مگر شاید انہیں بھی اس کتاب کا علم نہیں تھا۔ البتہ فاضل مصنف کے نواسے سید مہدی رضا بلگرامی نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ

''علامہ شبلی کی سیرۃ النبی پر خود سنی علماء معترض تھے۔وہ سب مولانا آزاد کے پاس پہنچے ۔لوگوں نے اپنے اعتراضات کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا سے درخواست کی کہ وہ اس کا جواب لکھیں۔مولانا اپنی سیاسی سرگرمیوں کے نتیجے میں اپنی عدیم الفرصتی کے باعث معذرت خواہ ہوئے۔لیکن ان لوگوں کو ہدایت کی کہ آپ مسودہ تیار کرلیں،میں بھی نظر ثانی کرلوں گا۔کچھ دنوں کے بعد جب یہی علما پھر مولانا آزاد سے ملنے گئے تو کہا کہ اب مسودہ تیار کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے کیونکہ سیداولاد حیدر فوق بلگرامی کی کتاب اسوۃ الرسول آچکی ہے۔جس میں ان تمام کمزوریوں کی تنقید کردی گئی ہے۔جو سیرۃ النبی کے سلسلہ میں ہم لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہورہی تھیں۔'' (سیداولاد حیدر فوق بلگرامی،ص:۶-۷)

---

(۳۱)

حکیم آزاد انصاری

[۱۸۷۰-۱۹۴۲ء]

حکیم الطاف احمد آزاد انصاری سہارن پوری اردو وفارسی کے شاعر تھے۔قاآنی سے بہت متاثر تھے اور انہیں کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔غالباً اس لئے قاآنی ہند بھی کہے جاتے تھے۔ ''معارف جمیل'' کے نام سے ان کا ایک مجموعہ کلام ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا ہے۔اس کا انتساب انہوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد صدر اعظم مملکت آصفیہ حیدرآباد دکن کے نام کیا ہے۔

''معارف جمیل'' میں حکیم آزاد انصاری نے اپنی سرگزشت بھی شامل کی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علامہ شبلی سے متاثر تھے۔اس میں علامہ شبلی کے بعض اقتباسات نقل کرکے دکھایا ہے کہ حکیم صاحب کا کلام فکروفن پر پورا اترتا ہے۔

''موازنہ انیس ودبیر'' کے حوالہ سے ایک مقام پر فنی گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی دکھایا ہے کہ علامہ شبلی کے خیالات سے پہلے یہ پہلو ہماری شاعری میں آگئے تھے۔اس لئے یہ خیال نہیں کرنا

چاہئے کہ یہ ''موازنہ انیس ودبیر'' سے مستعار ہیں۔(معارف جمیل، ص:۴۲۔۴۳)

---

(۳۲)

بابائے اردو مولوی عبدالحق

[۱۸۷۰-۱۹۶۱ء]

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو زبان وادب کی مدۃ العمر ایسی لازوال خدمت انجام دی کہ قوم نے انھیں 'بابائے اردو' کے خطاب سے نوازا۔اوراب وہ اسی نام سے ہر زبان پر ہیں اور شاید جب تک اردو زندہ رہے گی ان کی عظمت کا ذکر اسی طرح ہوتا رہے گا۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ علامہ شبلی نعمانی شاگرد تھے۔ایم اے او کالج علی گڑھ میں ان سے پڑھا تھا۔انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی شاعر، ادیب اور مورخ تھے۔ان کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہو جایا کرتا تھا۔وہ موقع بہ موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ اس کا حق ادا ہو جاتا تھا۔........
> جب میں مڈل میں پڑھتا تھا تو میں نے نجی طور پر عربی پڑھی تھی۔علی گڑھ میں آ کر میں نے دوسری زبان فارسی لی۔یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے فارسی لی۔اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے استاد ملے۔'' (بحوالہ ادیب، شبلی نمبر، ص:۱۴-۱۵)

یہ اقتباس ان کے مضمون مطبوعہ ماہنامہ انشا کراچی اکتوبر ۱۹۵۹ء کا ہے۔یعنی ان کی زندگی کے آخری دور کا،لیکن اس سے پہلے انھوں نے کبھی یہ اعتراف نہیں کیا کہ وہ علامہ شبلی کے شاگرد ہیں اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے، بلکہ ان کی حیثیت ہمیشہ ایک مخالف کی رہی۔ حیات شبلی ۱۹۴۳ء میں لکھی گئی۔اس میں مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

> ''ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے کسی وجہ سے ۱۹۰۲ء سے گویا اپنا یہ مسلک ہی مقرر کر لیا تھا کہ جا و بے جا ان پر اعتراض کریں مگر کبھی انھوں نے اس کے سوا کہ

''یہ الزام صحیح نہیں'' ''ان سے کچھ نہیں کہا۔'' (حیات شبلی ص ۶۹۱، طبع جدید ۲۰۱۵ء)

سید صاحب کے اس خیال میں بڑی صداقت ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا ایک بڑا ادبی کارنامہ قدیم کتابوں پر انتہائی محنت و تحقیق سے مقدمہ لکھنا بھی ہے۔ بلکہ ایک زمانہ میں وہ اس کام کے لئے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ اس حوالہ سے انھوں نے اردو کی جو خدمت انجام دی ہے اب وہ تاریخ ادب اردو کا ایک اہم باب ہے، مگر انھوں نے کئی مقدمات میں علامہ شبلی کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ یا تو محض نقد کیا ہے۔ یا ان کی حق تلفی کی ہے۔ حتیٰ کہ تنقیص بھی کی ہے۔ غالباً ہجرت تک ان کا یہی معاملہ رہا۔ خاص طور پر ان کے مقدمات میں تو ان کا یہی رویہ پایا جاتا ہے۔ ''مقدمات عبدالحق'' ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کتابی صورت میں شائع کیے ہیں۔ اس کے پانچ مقدمات میں علامہ شبلی کا ذکر بانداز تنقید و تنقیص موجود ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مقدمہ تذکرہ گلشن ہند۔ ۱۹۰۶ء

۲۔ مقدمہ حیات النذیر۔ ۱۹۱۲ء

۳۔ مقدمہ مثنوی خواب و خیال۔ ۱۹۲۶ء

۴۔ مقدمہ تمدن ہند

۵۔ مقدمہ خطوط شبلی۔ ۱۹۲۶ء

۱۔ تذکرہ گلشن ہند:

۱۹۰۱ء میں حیدر آباد (رودموسی) میں زبردست سیلاب آیا اور اس نے بڑی تباہی مچائی۔ اس وقت علامہ شبلی وہیں حیدر آباد میں تھے۔ یہ سیلاب کسی اہل علم کا کتب خانہ بھی بہالایا۔ اس میں جو کتابیں برآمد ہوئیں، ان میں تذکرہ گلشن ہند کا مخطوطہ بھی تھا جو مولوی غلام محمد صاحب مددگار کیبنٹ دولت آصفیہ کے ہاتھ آیا۔ چنانچہ انھوں نے اسے علامہ شبلی نعمانی کی خدمت میں پیش کیا جو اس وقت سررشتہ علوم و فنون کے ناظم اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر مولوی غلام محمد صاحب کی خواہش تھی کہ اسے ایڈٹ کر کے انجمن کی جانب سے شائع کیا جائے، مگر بقول عبداللہ خاں ذمہ دار کتب خانہ آصفیہ ''انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے نہ چھاپ سکی۔'' (التماس، گلشن ہند ص:۲)

اس کے بعد علامہ شبلی سررشتہ علوم وفنون کی نظامت اور انجمن ترقی اردو سے مستعفی ہو گئے، تاہم گلشن ہند کی طباعت واشاعت کا خیال ان کے دل سے نہ گیا۔ چنانچہ انھوں نے اس کی تصحیح و مراجعت کی۔ حواشی اور وضاحتی وتشریحی نوٹ لکھے۔ بعض اضافے بھی کیے۔ املا کی تصحیح کی۔ (ماہنامہ معارف اکتوبر ۱۹۲۰ء ص ۲۶۲) اور اسے عبداللہ خاں کے حوالہ کیا اور ان سے طباعت و اشاعت کی خواہش ظاہر کی۔ (ایضاً)

گلشن ہند کی تدوین کی یہ کوشش نہ صرف علامہ شبلی کی بلکہ اردو میں متنی تحقیق کی پہلی کوشش تھی اور اس کے آغاز کا سہرا علامہ شبلی کے سر ہے۔ اس کوشش کا اگر ذکر واعتراف کیا گیا ہوتا تو اردو میں متنی تحقیق وتنقید کا بنیاد گذار علامہ شبلی کو قرار دیا جاتا۔ مگر مولوی عبدالحق نے اسے مٹا کر اپنے استاد علامہ شبلی سے یہ تاج فضیلت چھین کر حافظ محمود شیرانی کے سر کیا۔ ہوا یوں کہ جب علامہ شبلی نعمانی حیدرآباد سے لکھنؤ آ گئے تو عبداللہ خاں نے تذکرہ گلشن ہند کا ذکر مولوی عبدالحق سے کیا۔ چنانچہ انھوں نے علامہ شبلی کے مقدمہ کو ہٹا کر اپنا مقدمہ شامل کر دیا، جس میں علامہ شبلی کی کاوشوں کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہی نہیں اس میں علامہ شبلی نے جو حواشی لکھے تھے، ان کی بھی نشاندہی نہیں کی بلکہ اس کے برعکس ان پر سخت تنقیدیں کیں۔ تفصیل کے لئے راقم کا مقالہ گلشن ہند مشمولہ ''آثار شبلی'' مطبوعہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۱۳ء (ص: ۳۷۱-۳۸۹) دیکھا جا سکتا ہے۔

تذکرہ گلشن ہند کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۶ء میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے طبع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مع گلزار ابراہیم انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔

تذکرہ گلشن ہند میں خواجہ میر اثر [م: ۱۷۹۵ء] کے تذکرہ میں مرزا علی لطف نے ان کی مثنوی خواب وخیال کا ذکر کیا ہے اور بطور نمونہ چند اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ علامہ شبلی نے مثنوی خواب وخیال کے بارے میں مولانا حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] کے موقف پر نقد کیا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ (مقدمہ شعر وشاعری) میں لکھنؤ کی شاعری پر صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں

ہو سکتی اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں، اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ بن سکتی ہے؟۔"

(گلشن ہند، ص:۳۲)

علامہ شبلی کے موقف کی تردید میں بابائے اردو کی تنقید ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف اعتراف کا لفظ لکھا حالانکہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بے حد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف وثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر وانیس میں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کی جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے حالانکہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی ہے۔ عام شاعری پر یا اردو شاعری کے نشو ونما اور اس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آ گیا ہے اور اس میں دلی لکھنؤ والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا، اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شائق ہیں، تنقید کے روادار نہیں، مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں بلکہ اردو میں فن تنقید پر پہلا مقدمہ ہے، اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے وہ صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں تو لوگوں کو ان کے عام (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا اور وہ بت جنھیں وہ مدت سے پوجتے چلے آ رہے تھے

یکا یک متزلزل ہو گئے اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا نے اس پر خواہ مخواہ اس لئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ در حقیقت وہ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو الٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا۔ صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اگرچہ صریح اور بین ہیں مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اس کی پوری قلعی کھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اردو زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں۔" (مقدمہ گلشن ہند، ص: ۱۹۔۲۰)

اس طویل اقتباس میں اصل بحث کے سوا کئی امور قابل غور ہیں۔ مثلاً وہ علامہ شبلی کو ہر جگہ مولوی اور مولانا حالی کو ہر جگہ مولانا لکھتے ہیں۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ مولانا کون تھا۔ یہی نہیں علامہ شبلی کی تنقید کی وجہ سے وہ ان کے علم و فضل پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کے مذاق سلیم پر پہلے شبہ کرتے ہیں، پھر اسے عامیانہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ پورا اقتباس علامہ شبلی کی ہجو ملیح ہے۔ حالانکہ معاملہ صرف اتنا ہے کہ مولانا حالی نے بغیر نام لئے دبستان لکھنؤ پر سخت چوٹیں کی تھیں۔ گو انھوں نے دبستانوں کی تخصیص نہیں کی ہے مگر سب جانتے ہیں ان کی زد پر لکھنوی مذاق شعر و ادب ہی تھا۔ اس کے خلاف تو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ چکبست نے تو متعدد مقامات پر مولانا حالی کے جوابات لکھے ہیں اور ان پر سخت تنقیدیں کی ہیں۔

جہاں تک مثنوی خواب و خیال کے متعلق علامہ شبلی کے نقطۂ نظر کا معاملہ ہے وہ صرف اتنا ہے کہ مثنوی خواب و خیال کے بعض اشعار سے اگرچہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب مرزا شوق نے اس سے استفادہ کیا ہے، تاہم حقیقت یہ ہے کہ تذکرہ گلشن ہند میں اس کے جو اشعار درج ہیں ان سے کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ مرزا شوق کی مثنوی اس سے مستفاد ہے۔ اس سے علامہ شبلی کے موقف کی بھی تائید ہوتی ہے۔

اسی طرح بابائے اردو کے اس خیال سے کہ مولانا حالی نے میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف و ثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ انیس و دبیر میں اتنا نہیں سراہا، کس قدر خلاف واقعہ بات ہے۔ ان کا ادعا دیکھئے کہ فرماتے

ہیں کہ مثنوی گلزار نسیم کا اردو زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

چکبست نے گلزار نسیم کا دیباچہ لکھا تو بعض مسائل میں ان کے کسی دوست نے علامہ شبلی سے خط و کتابت کی۔ چکبست نے اپنے مقدمہ میں جہاں مولانا حالی کے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں اس کے حاشیہ میں علامہ شبلی کے خط کا ایک سطری اقتباس نقل کیا ہے کہ ''گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بے رحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے۔''

(دیباچہ گلزار نسیم، بحوالہ مضامین چکبست، ص:۱۴۴، انڈین پریس الہ آباد، ۱۹۳۷ء)

''گلشن ہند'' کے اسی مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے اس پر بھی نقد ضروری خیال کیا ہے اور چراغ پا ہو کر لکھا ہے کہ

> ''افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے لالہ چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے، تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پر ہے۔''
>
> (ایضا،ص:۲۱)

نقادوں کے درمیان تضاد بیانی کی یہ پہلی مثال نہیں ہے۔ اس سے ہمارا ادبی ذخیرہ بھرا پڑا ہے۔ حالی و شبلی معاصر ہیں اور دونوں زندہ ہیں دونوں کے درمیان خط و کتابت ہو رہی ہے باوجود اس کے مولوی صاحب نے کس انداز سے علامہ شبلی کی تردید کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چاہے جس کا بھی موقف درست ہو تحقیق و تنقید میں مولوی عبدالحق کا یہ اسلوب کسی نوع سے درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور خاص طور پر اپنے استاد کے لئے تو یہ رویہ سرے سے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اس مقدمہ میں بابائے اردو سے کئی اصولی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن کی نشاندہی اور تجزیہ ہمارا موضوع نہیں تاہم ایک دو کا ذکر ضروری ہے کہ ان کا تعلق بھی علامہ شبلی ہی سے ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ تذکرہ گلشن ہند کا مخطوطہ مولوی غلام محمد کے ہاتھ لگا تھا اور انھوں نے

ایڈٹ کر کے شائع کرنے کے لئے علامہ شبلی کے حوالہ کیا تھا، لیکن بابائے اردو لکھتے ہیں:

''یہ کتاب شعرائے اردو کا قابل قدر اور نایاب تذکرہ ہے اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت شخص (عبداللہ خاں) کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی، میں خود بے بضاعت، تاہم اس فرمائش کو جو انھوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا اور بسر و چشم قبول کیا۔'' (مقدمات عبدالحق، ص:۶۱)

اسے 'صرف نظر' نہیں بددیانتی کا نام دیا جانا چاہئے۔

بابائے اردو نے اصل کتاب میں ترمیم و تنسیخ کی۔ حالانکہ ان کو یہ اختیار نہ تھا۔ ایک متنی محقق کو تصحیح متن اور ضروری حواشی کے سوا کسی کے کلام کو خارج یا اضافہ کرنے کا حق نہیں ہوتا لیکن انھوں نے ایسا کیا۔ عبداللہ خاں لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے، البتہ صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونہ کلام جو اس تذکرہ میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا اس میں صرف عمدہ نمونہ چن لیا گیا ہے اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوق سلیم نے انجام دیا ہے۔ اس کے سوا اس میں اور کوئی تصرف نہیں کیا گیا۔'' (التماس، ص:۱۲)

اب بابائے اردو کا بیان سنئے۔ فرماتے ہیں:

''مؤلف نے شعراء کا کلام جو بطور انتخاب درج کیا ہے اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے۔ صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں۔ خود مؤلف نے اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دیئے تھے اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا۔'' (مقدمہ، ص:۲۴)

مقدمہ نگار اور پبلشر کے اقتباسات سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ پبلشر کی التماس بابائے اردو کی نظر سے نہیں گذری۔ ورنہ یہ تضاد اس میں پیدا نہ ہوتا۔ دوسرے یہ کہ تذکرہ

گلشن ہند کی تصحیح وتدوین اور تحقیق متن کا کام اب بھی باقی ہے اور ضروری ہے کہ اصل تذکرہ کو محقق انداز میں شائع کیا جائے اور دکھایا جائے کہ مولوی عبدالحق کے تصرفات بیجا سے شعرا کا کون کون سا کلام سامنے نہیں آسکا ہے۔

عبداللہ خاں کی دو صفحے کی ناشر کی التماس نے علامہ شبلی کے اس کام کو روشنی میں لا دیا، ورنہ علامہ شبلی کی اس ادبی کاوش سے زمانہ کبھی واقف ہی نہیں ہوتا۔

بابائے اردو نے دیانت کے خلاف ایک اور کام کیا ہے۔ اصل تذکرہ میں شاہ ولی اللہ اشتیاق کی بعض کتابوں کے نام غلط درج تھے۔ مولانا شبلی نے حاشیہ میں اسے غلط بتایا ہے۔ در اصل مرزا علی لطف نے شاہ ولی اللہ اشتیاق کو شاہ ولی اللہ دہلوی تصور کرلیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی بعض کتابوں کے نام لکھے تھے۔ علامہ شبلی نے ان کتابوں کو فرضی قرار دیا ہے۔ دراصل انھوں نے بھی شاہ ولی اللہ اشتیاق کو شاہ ولی اللہ دہلوی ہی سمجھا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ بابائے اردو نے علامہ شبلی کے فٹ نوٹ کو اپنے مقدمہ میں اپنی تحقیق بتا کر پیش کردیا ہے۔ (مقدمات عبدالحق، ص: ۸۷)

۲۔مقدمہ حیات النذیر

ڈپٹی نذیر احمد کی سوانح عمری ''حیات النذیر'' سید افتخار عالم مارہروی [م: جولائی ۱۹۲۴ء] نے لکھی ہے۔ اس کا مقدمہ بھی مولوی عبدالحق کے قلم سے ہے۔ اس مقدمہ میں بھی مولوی صاحب نے اپنے استاد علامہ شبلی پر انتہائی سخت اور نازیبا تنقیدیں کی ہیں۔ مقدمہ کی تمہید ہی میں بغیر نام لئے علامہ شبلی پر سخت چوٹ کی ہے اور ان کی سوانح نگاری کو لایعنی اور انہیں بدبیں وغیرہ کے الفاظ سے نوازا ہے۔ انہوں نے تمہید میں سوانح نگاری کے جن اصولوں پر بحث کی ہے، اگر انہیں تسلیم کرلیا جائے تو ہمارا ذخیرہ سوانح عمری خرافات کا مجموعہ ثابت ہو جائے گا۔

دوسری خرابی اس مقدمہ کی یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی کے تعلقات پر حرف زنی کی ہے، حالانکہ ان بزرگوں کے تعلقات ہمیشہ اچھے اور استوار رہے۔ اور یہ تعلقات اس وقت سے قائم تھے جب مولوی عبدالحق صاحب پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت ڈپٹی نذیر احمد ضلع اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔

تیسری بات صریح کذب بیانی کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب امہات الامہ اپنے بعض

مشمولات کے سبب علماء کے درمیان ناپسندیدہ قرار پائی اور ندوۃ العلما ایک جلسہ میں اسے مشورہ سے جس میں خود مصنف ڈپٹی نذیر احمد کا مشورہ بھی شامل تھا، وہ نذر آتش کردی گئی۔ بابائے اردو کو یہ واقعہ سخت ناگوار گذرا۔ چنانچہ انہوں ''حیات النذیر'' کے مقدمہ میں اس عمل کے خلاف سخت ناگواری کا اظہار کیا ہے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ جو لوگ امہات الامہ کے جلانے میں پیش پیش رہے، ان سے مولوی عبدالحق کے تاحیات اچھے مراسم اور رنج کے تعلقات قائم رہے اور جو شخص اس واقعہ میں شریک نہ تھا اور ان کا استاد بھی تھا، وہ واقعہ کا اصل ذمہ دار قرار پایا۔ انہوں نے اس کا مورد الزام علامہ شبلی کو ٹھہرا کر ان کی طرح طرح سے تنقیص و تذلیل کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''طالب علمی کے زمانے میں جب میں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تو بے حد رنج اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلما مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھ کر محکم دلائل اور پرزور شہادتوں سے اس کی تردید کی تو اس بے نظیر رسالے کو پڑھ کر پوری تسکین ہوگئی۔ اور یہ یقین ہوگیا کہ یہ محض افسانہ اور یورپین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہے، مگر جب مجھے اس واقعے کی خبر لگی اور خصوصاً جب میں نے یہ سنا کہ علامہ موصوف بھی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اس کار خیر میں شریک تھے تو میرا خیال بدل گیا۔ اور اب تک میرا خیال ہے کہ کچھ تعجب نہیں کہ مسلمانوں نے کتب خانہ اسکندریہ جلا دیا ہو۔'' (حیات النذیر، ص:۷)

پورے مقدمہ میں کسی بھی شریک واقعہ شخص کا نام سوائے علامہ شبلی کے انہوں نے نہیں لیا ہے۔ دراصل کوشش یہ کی ہے کہ تمام تر تذلیل علامہ کی ہو۔ اور صرف علامہ ہی کی نہیں جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے ان کی تحقیقات پر بھی حملہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی اس واقعہ میں سرے سے شامل ہی نہیں تھے۔ حیات شبلی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''اس واقعہ کو مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری ترقی اردو نے اپنے مقدمہ حیات النذیر میں مولانا شبلی کی طرف بواسطہ یا بلاواسطہ بے وجہ اور بلاتحقیق منسوب

کر کے ایک تاریخی جرم کیا ہے۔ حالانکہ مولانا اس مجمع میں سرے سے موجود نہ تھے۔ مولانا شروانی صاحب نے جو شرکِ جلسہ تھے، مقدمہ مقدمات عبدالحق (ص:۸) میں اس واقعہ کی پوری کیفیت لکھ دی ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ مولوی عبدالحق صاحب مولانا شبلی مرحوم کی طرف بے بنیاد واقعات کی نسبت میں کتنی بے احتیاطی برتتے ہیں۔" (حیاتِ شبلی، ص:۴۷۸)

اس کذب بیانی اور تنقیص شبلی کے کارنامہ سے بابائے اردو کی حقیقت نگاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس تحریر کے بعد تقریباً پچاس برس مولوی عبدالحق صاحب زندہ رہے، مگر انہیں اپنے غلط موقف کی تردید یا تصحیح کا کبھی خیال تک نہ آیا۔

۳۔ مقدمہ مثنوی خواب وخیال

تذکرہ گلشن ہند میں میر اثر کی مثنوی خواب وخیال پر حالی وشبلی کی متضاد آرا اور اس پر مولوی عبدالحق کے تند وتیز تبصرے کا تفصیلی ذکر اوپر آچکا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں بابائے اردو نے اسے مرتب کر کے شائع کیا۔ اس پر بھی انھوں نے حسب عادت طویل مقدمہ لکھا اور حق یہ ہے کہ حق ادا کردیا ہے۔ وہ جس کتاب پر مقدمہ لکھتے ہیں کتاب اور صاحب کتاب کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض مقدمے طوالت کے لحاظ سے کتاب کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا اسلوب نگارش یا دوسرے لفظوں میں ان کی نثر طول بیانی کا بھی نمونہ ہے۔ اس میں بعض غیر ضروری باتیں بھی وہ لکھ جاتے ہیں۔

بابائے اردو نے علامہ شبلی کے متعلق تذکرہ گلشن ہند کی بحث کو مثنوی خواب وخیال کے دیباچے میں بھی دہرایا ہے اور تقریباً اسی انداز سے خامہ فرسائی کی ہے۔ (مقدمات عبدالحق، ص:۲۳۲)

۴۔ مقدمہ تمدن ہند:

تمدن عرب کے مصنف موسیو لیبان کی دوسری تصنیف تمدن ہند ہے۔ مولوی سید علی بلگرامی [۱۸۵۱-۱۹۱۱ء] نے اسے اردو جامہ پہنایا ہے۔ اس پر بھی مولوی عبدالحق کے قلم سے مقدمہ ہے۔ اصل کتاب اور ترجمہ کے ذکر سے پہلے بابائے اردو نے مترجم کے مفصل حالات وسوانح قلم بند کئے ہیں جس میں ولادت سے وفات تک کے تمام احوال لکھے ہیں۔ مولوی سید علی بلگرامی

دولت آصفیہ میں بڑے عہدہ پر فائز تھے اور زندگی کا بیشتر حصہ حیدرآباد میں گذارا۔ مقدمہ نگار کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے، اس لئے ان کے ذاتی اور نجی حالات اور دیکھے اور برتے ہوئے واقعات بھی لکھے ہیں۔

مولوی سید علی بلگرامی گو عمر و عہدہ میں علامہ شبلی سے بڑے تھے، مگر دونوں میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ پہلی بار سرسید کے ساتھ جب علامہ شبلی حیدرآباد گئے تھے تب سے مراسم قائم تھے۔ ''الفاروق'' کے دیباچہ میں ان کا بڑا والہانہ ذکر ہے۔ علامہ شبلی جب حیدرآباد گئے تو ان کے تعلقات میں اور گہرائی اور موانست پیدا ہوگئی۔ ابتدا میں علامہ شبلی کا قیام ان کے مکان پر ہی رہا۔ ان کا قیمتی کتب خانہ جدید علوم کی کتابوں اور قدیم اسلامی ذخائر کا معدن تھا۔ ایک وجہ تعلقات یہ بھی تھی۔ اور وہ ان کی مجلس کے حاضر باشوں میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بابائے مولوی عبدالحق نے متعدد جگہ ان کی مجلسوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سوائے ایک دو جگہ کے ہر جگہ علامہ شبلی کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ یہاں انھیں نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ حیدرآباد میں علامہ شبلی کے تقرر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مرحوم (مولوی سید علی بلگرامی) نے نواب سروقارالامرا بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدرداں امیر تھے، ایک سررشتہ علوم وفنون قائم کیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعہ تصنیف وتالیف وترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہونچایا جائے۔ مرحوم اس سررشتے کے نگراں مقرر ہوئے اور ان کی زیرنگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف وترجمہ ہوئیں لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لئے کوئی مناسب شخص انھیں نہ ملا تھا، لہٰذا انھوں نے شمس العلما مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمت ناظم سررشتہ علوم وفنون پر بہ مشاہرہ ...... ہوا۔ درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ مولانا کی چند کتابیں بھی اس سلسلے میں شائع ہوئی تھیں، لیکن ملک کی بدنصیبی سے یہ سررشتہ ٹوٹ گیا۔''

(مقدمات عبدالحق، ص:۳۸۶)

بابائے اردو نے مولانا شبلی کے انتخاب کو بہت اچھا بتایا ہے لیکن اس طرح کہ کوئی

مناسب آدمی نہیں ملا تھا، اس لئے مولانا شبلی کا انتخاب ہوا۔ لیکن یہ واقعہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۰۱ء میں جب علامہ شبلی حیدر آباد پہنچے تو ناظم سر رشتہ علوم وفنون کے عہدہ پر مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب فائز تھے۔ مولوی عزیز مرزا [۱۸۶۵-۱۹۱۲ء] نے ان کا تبادلہ شعبہ مالیات میں کرایا اور ان کی جگہ پر علامہ شبلی کا تقرر عمل میں آیا۔

۲۔ مولوی سید علی بلگرامی کی مروت اور اہل علم کی قدر دانی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مجلس کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''مرحوم بہت با مروت تھے، اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اس کو پوری نہ کر سکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دوسری بار پھر آتا تو اسی شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد برآری میں کوشش کرتے۔ یہاں تک کہ کتابیں جو انھیں بہت عزیز تھیں ان کے دینے میں بھی تامل نہ تھا، بشرطیکہ وہ سچا قدرداں ہو خاص کر طالب علموں اور اہل علم کا بہت خیال کرتے تھے، چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علی خاں مرحوم کے یہاں مدعو تھے، بارہ بجے کھانے کے بعد چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے شعر سناتے رہے جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوئے۔ مرحوم نے ان کی درخواست پر فوراً ''کامل مبردؔ'' کا بہت عمدہ نسخہ مطبوعہ یورپ جس کی قیمت ستر روپے ہے، مولانا کی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ جیسا طالب علم جو کتابوں کا شوقین ہے اہل علم کی درخواست رد نہیں کر سکتا۔''

(مقدمات عبدالحق، ص: ۳۹۳-۳۹۴)

اب دیکھئے، مولوی سید علی بلگرامی نے خوش ہو کر کتاب نذر کی ہے، مگر مولوی عبدالحق نے اسے درخواست بنا دیا۔

۳۔ اسی سلسلہ یعنی کتاب نذر کرنے کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو:

''مرحوم (مولوی سید علی بلگرامی) نے رد المنطقین لابن تیمیہ اپنے خرچ سے نقل کروا کر مولوی شبلی کی نذر کی، انگلستان پہنچ کر مرحوم نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں

کی ایک علمی سوسائٹی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہے، آپ وہ نسخہ بھجوا دیجئے۔ مولانا اپنی عادت کے موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت سست لکھا بلکہ یہ تک تحریر فرمایا کہ چونکہ یہ کتاب آپ کے خرچ سے نقل ہوئی ہے اس لئے آپ طلب کرتے ہیں۔ مرحوم نے اس درشت اور عتاب آمیز خط کا جواب یہ دیا کہ پانچ سو روپئے کی عمدہ کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھجوا دیں، چنانچہ اس کے بعد جب مولانا شبلی سرکار عالی کی درخواست پر دارالعلوم کے نصاب تعلیم کے مرتب کرنے کے لئے حیدر آباد تشریف لائے تو اس شرمندگی کے بارے میں ملے نہیں لیکن کتب خانے کے جلسہ انتظامی میں اتفاق سے جب مٹھ بھیڑ ہوگئی تو مرحوم اس خندہ پیشانی سے پیش آئے جوان کا شیوہ تھا۔"

(مقدمات عبدالحق، ص:۳۹۴)

اس بے سروپا قصہ میں انھوں نے علامہ شبلی کی عادت سخت بگڑنے والی بتائی ہے۔ ایک طرح سے محسن کش بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مولانا شبلی نے سرے سے اس طرح کے کسی واقعہ کے ہونے کی تردید کی۔ تب بھی اس عبارت کو مقدمہ سے خارج نہیں کیا بلکہ ہو بہو باقی رکھا اور جب "چند ہم عصر" شائع کی تو اس طویل افسانہ کے جواب میں حاشیہ میں محض ایک سطری نوٹ لکھ کر خاموش ہوگئے۔ (چند ہم عصر، ص:۸۰)

۴۔ انھیں سے متعلق ایک اور واقعہ سنئے:

"جب اہل علم میں سے کوئی شخص حیدر آباد میں وارد ہوتا تو وہ خواہ کہیں کا ہو ان کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ ان کا مہمان ہو۔ چنانچہ مولانا شبلی جب حیدر آباد تشریف لائے تو مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے مہمان ہوئے۔ مرحوم کو جب دوسرے روز اطلاع ہوئی تو فوراً پہنچے اور اپنے گھر لے گئے، لیکن جب مولانا ملازم ہوتے ہی دوسری جگہ اٹھ گئے تو مرحوم کو بہت رنج ہوا اور یہ رنج ان کے خطوط سے بھی مترشح ہوتا ہے۔" (ایضاً ص:۳۹۴-۳۹۵)

اس اقتباس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ شبلی دو چار روز مولوی سید علی بلگرامی کے

یہاں رہے اور جونہی ملازمت ملی ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی، لیکن یہ واقعہ نہیں مولانا شبلی ان کے یہاں نو ماہ رہ چکے تھے۔ اس سے زیادہ اور کوئی کیا رواداری نبھا سکتا ہے اور اس نو مہینہ رہنے کا انجام ملاحظہ ہو۔

۵۔ مولوی عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''جس زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم ان کے یہاں مہمان تھے ایک روز فرمانے لگے کہ میں اس کا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے مہمان ہیں بلکہ الٹا میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی، مگر ایک بات کا آپ کو میرا شکر گذار ہونا چاہئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری ایک بیوی ہے اور پھر بھی میں اسے نو مہینے چھوڑ کر آپ کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔'' (ایضاً، ص:۴۰۶)

یہ دراصل دونوں کے درمیان بے تکلفانہ باتیں تھیں جن کو مولوی عبدالحق نے علامہ شبلی کی تحقیر کے لئے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔

ان تمام واقعات کے بعد اخیر دور میں ان کا یہ لکھنا کہ میں علامہ شبلی کا کبھی مخالف نہیں رہا، کس قدر مضحکہ خیز بات ہے۔ (ماہنامہ ادیب، شبلی نمبر، ص:۱۵)

۶۔ شیعہ اور شیخ عبدالقادر جیلانی

''ایک دفعہ شمس العلماء مولوی شبلی نے پوچھا کہ شیعوں کو شیخ عبدالقادر جیلانی سے کیوں عداوت ہے، حال آنکہ انھوں نے شیعوں کے رد وغیرہ میں بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ رد لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی کے بہت سے اسباب ہیں۔ اگر آپ ہمارے بجائے ہوتے تو آپ کو بھی ان سے دشمنی ہوتی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی۔ مولانا نے پوچھا وہ کیوں کر؟ فرمایا کہ آدھی اسلامی دنیا حضرت شیخ عبدالقادر کی نذر و نیاز کرتی ہے اور اٹھتے بیٹھتے ان کا نام لیتی ہے اگر یہ شخص نہ ہوتا تو سب ہمارے ائمہ کی پرستش کرتے، اگر اسی طرح آپ کی آدھی سلطنت جاتی رہتی تو ہم آپ سے پوچھتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں۔'' (ایضاً، ص:۴۰۰)

مقدمہ خطوط شبلی کے ذکر سے پہلے چند باتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ مقدمہ ۱۹۲۶ء میں لکھا گیا۔ اس سے پہلے بابائے اردو نے علامہ شبلی مرحوم کے کسی کام کی تعریف و تحسین نہیں کی بلکہ ان میں کیڑے نکالتے رہے اوران سرگرمیوں کی سرپرستی کرتے رہے جو علامہ شبلی کے خلاف ہوتی تھیں۔ اس زمانہ میں حافظ محمود شیرانی کا سلسلہ تنقید شعر العجم وہ خود رسالہ اردو میں جس کے وہ ایڈیٹر تھے شائع کررہے تھے، جس کا ہر طرف اک شور تھا۔ حتیٰ کہ اسی تنقید اور بعض دوسرے تنقیدی مضامین کی وجہ سے آج حافظ محمود شیرانی کو تحقیق کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ انھوں نے تنقید شعر العجم میں بڑی دقت نظری سے کام لیا، لیکن قارئین کے سامنے یہ نکتہ واضح نہیں کیا کہ علامہ شبلی نے جس وقت شعر العجم لکھی تھی ان کے سامنے بیشتر اس کے ماخذ مخطوطہ اور ناپید تھے اور شیرانی صاحب کے زمانہ میں اس میں بیشتر طبع ہو کر عام ہو گئے تھے۔ بہرحال تنقید شعر العجم کو دبستان شبلی میں اس لحاظ سے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ اس کی پشت پناہی بابائے اردو کررہے تھے۔ اس میں وہ بڑی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ مثلاً ایک بار مولانا سید سلیمان ندوی نے ڈاکٹر سید عبداللہ سے کہا کہ وہ شیرانی صاحب سے کہہ دیں کہ وہ شوق سے تنقید لکھیں، مگر مولوی عبدالحق کی پارٹی بن کر نہیں۔ چنانچہ انھوں نے سید صاحب کا یہ خیال شیرانی صاحب تک پہنچادیا تو وہ برسوں ڈاکٹر سید عبداللہ سے ناراض رہے۔

(بحوالہ ڈاکٹر خلیق انجم، مولوی عبدالحق کی ادبی ولسانی خدمات/ ج۱، ص:۱۹۲-۱۹۳)

مولانا سید سلیمان ندوی کی حیثیت اس عہد میں علمی، ادبی اور تاریخی ہر حیثیت سے بابائے اردو سے کسی طرح کم نہ تھی اور وہ اس دور کی علمی وادبی سرگرمیوں کے بڑے واقف کار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کے ذریعہ شیرانی صاحب کو اپنے خوف سے آگاہ کیا۔ جہاں تک علامہ شبلی مخالف سرگرمیوں کی مولوی عبدالحق کی سرپرستی کا معاملہ ہے، اس کے متعلق ایک اور واقعہ سنئے۔ مقتدیٰ خاں شروانی نے ایک طویل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے ''مولانا شبلی کا قیام علی گڑھ''، اس میں انھوں نے بعض ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے علامہ شبلی کی شخصیت پر آنچ آتی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے انھیں خط لکھ کر اس مقالہ کی داددی اور لکھا کہ ''آپ نے کیا چھپی چوریاں پکڑی ہیں۔'' (رقعات عبدالحق، ص:۳۰۷)

بابائے اردو کے اس نازیبا رویے سے ان کی علامہ شبلی مخالف سرگرمیوں کا کسی قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۴۔ مقدمہ خطوط شبلی:

۱۹۲۲ء میں منشی محمد امین زبیری[۱۸۷۰-۱۹۵۸ء] کو عطیہ بیگم سے معلوم ہوا کہ علامہ شبلی نے ان کو اور ان کی بہن کو جو خطوط لکھے تھے وہ محفوظ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے وہ خطوط ان سے حاصل کئے۔ نقل کیا اور بعض خطوط کو اپنے رسالہ ماہنامہ ظل السلطان بھوپال میں بالاقساط شائع کیا۔ ان کی تحریر کے مطابق انھوں نے اسے مکاتیب شبلی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی میں شامل کرنے کی سید صاحب سے خواہش ظاہر ہے، مگر انھوں نے منع کر دیا۔ حالانکہ انھوں نے مکاتیب شبلی کے طبع دوم میں بہت سے خطوط کا اضافہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں محمد امین زبیری کے دو بیانات ملتے ہیں۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ اولاً انھوں نے ان خطوط کو علامہ شبلی کے ایک ارادت مند کے پاس بھیجا یا ان سے ان خطوط کے شائع کرنے کے سلسلے میں رائے مانگی، مگر انھوں نے اسے شائع کرنے سے منع کر دیا۔ (خطوط شبلی، طبع اول، ص:۳)

اس سے خود ان کا ارادہ متزلزل ہو گیا، مگر بابائے مولوی عبدالحق نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔ یہاں تک کہ اشاعت پر مجبور کر دیا۔ (ایضاً)

مولوی عبدالحق کی اس قدر دلچسپی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی عدم التفاتی کے سبب انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کو نظر انداز کر کے بابائے اردو سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ انھوں نے ایک مفصل مقدمہ لکھا۔ یہی مقدمہ اور اس کے مشمولات ہمارا موضوع مطالعہ و جائزہ ہیں۔

راقم گذشتہ پچیس برس سے شبلیات کا مطالعہ کر رہا ہے۔ مطالعے کا چسکا تو بچپن سے ہے اور مختلف موضوعات پر نہ جانے کتنی کتابوں کے دیباچے اور مقدمے پڑھے ہیں لیکن میری مطالعاتی زندگی میں ایسی بدترین تحریر پڑھنے کو کبھی نہیں ملی۔ میں نے اسے پہلے بھی پڑھا ہے لیکن آج جب اس پر لکھنے بیٹھا اور اس نظریہ سے اسے پڑھا تو میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ جسے قلم دے اس کا فرض ہے کہ وہ حق و انصاف سے کام لے۔ تخریب، بددیانتی، سیاق وسباق

اور پس منظر، کون سا پہلو ہے جس میں بابائے اردو نے خیانت سے کام نہ لیا ہو۔ واقعہ یہ ہے یہ مقدمہ نہ صرف علامہ شبلی کے خلاف لکھی جانے والی بلکہ اردو میں اپنی نوعیت کی بدترین تحریر ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے علامہ شبلی کی تعریف میں کبھی ایک حرف نہیں لکھا، لیکن خطوط شبلی کے مقدمہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

> ''آپ نے اپنی عنایت سے مولانا شبلی مرحوم کے جو خطوط مجھے بھیجے ہیں میں نے انھیں بڑے شوق سے پڑھا اور جب تک میں شروع سے اخیر تک سب نہ پڑھ چکا میں نے انھیں ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ چند روز بعد میں نے دوبارہ پھر پڑھا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا شوق اب بھی کم نہیں ہوا۔ بڑا ظلم ہوگا اگر یہ خط یونہی پڑے پڑے ردی میں مل جائیں اور تلف ہو جائیں اور دنیا اس نعمت سے محروم رہ جائے۔'' (خطوط شبلی، ص:۱۴)

اس کے بعد انھوں نے خطوط کی اہمیت وافادیت بیان کی ہے۔ مرزا غالب کی خطوط نگاری اور ان کی حیثیت وافادیت پر زور قلم صرف کیا ہے۔ پھر ان خطوط کے قابل لحاظ پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ

> ''میں مولانا شبلی کے ان خطوط کو...... کئی لحاظ سے قابل قدر سمجھتا ہوں۔ ایک تو ان کا طرز بیان نہایت سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے جو ان کی دوسری تصانیف اور رقعات میں نہیں پایا جاتا۔ دوسرے ان میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں جو ان کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے اور نہ شاید کبھی گفتگو میں ان کا ذکر انھوں نے فرمایا، جس کی وجہ آگے چل کر بیان کروں گا۔ تیسرے ان خطوں سے محبت اور خلوص کی بو آتی ہے جو ان کے دوسرے رقعات میں نہیں ہے اور یہ ایک بہت بڑی وجہ ان کی دلچسپی اور قدر کی ہے۔'' (خطوط شبلی، ص:۱۶-۱۷)

اس اقتباس میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔ مثلاً اسلوب نگارش کے بارے میں بابائے اردو نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے کیا واقعی ایسا ہے؟ شبلیات کا ایک ادنی طالب علم بھی اس سے اتفاق نہیں کرے گا۔ اس سے پہلے الفاروق، شعر العجم اور خود سیرۃ النبی جیسی لازوال کتابیں شائع

ہوچکی تھیں، جس میں علامہ شبلی کے اسلوب بیان کی تمام خصوصیات موجود ہیں اور جن کا اعتراف ماہرین فن نے کیا ہے۔ مولوی صاحب کے ذہن میں شاید یہ بات رہی ہوگی کہ وہ شعرالعجم کی شکل تو حافظ محمود شیرانی کے ذریعہ بگاڑ چکے۔ اب کوئی اس کی شاندار نثر کا نام نہیں لے گا۔

اسی طرح خواتین کے سلسلہ تعلیم کے متعلق ان کے بعض خطبات اور کانفرنس کی تقاریر سب کے سامنے تھیں۔ ہاں علامہ شبلی نے عطیہ فیضی کی تعلیمی سطح اور آزادانہ روش پر قدغن لگانے اور بر بنائے تربیت چند باتیں خطوط میں لکھی ہیں۔ اس کے بعد وہ اصل وجہ جسے بیان کرنے کے لئے بابائے اردو نے مذکورہ باتیں لکھی ہیں وہ یہ ہے کہ ان خطوں سے خلوص اور محبت کی بو آتی ہے اور اسی کو ثابت کرنے کے لئے انھوں نے پورے مقدمہ میں زور مارا ہے۔ مثلاً اگلے پیراگراف میں وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے اس جملہ پر کہ شعرالعجم صحیفہ حسن وعشق ہے، واقعات کی کھتونی نہیں، تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ شعرالعجم واقعات کی کھتونی بھی اور صحیفہ حسن وعشق کی داستان بھی، لیکن اگر وہ ان خطوط کو دیکھتے اور اگر دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا کہ جس داستان کا تصور ان کے ذہن میں تھا وہ شعرالعجم میں نہیں ان خطوط میں ہے۔''
>
> (خطوط شبلی، ص:۱۷)

پھر بابائے اردو نے خطوط شبلی کے متعدد اقتباسات سے خلوص ومحبت اور بو کی دلیلیں پیش کی ہیں اور تقریباً تمام اقتباسات درمیان سے لے کر سیاق وسباق مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، حتیٰ کہ معانی ومفہوم بھی غلط نکالے ہیں۔ استنباط نتائج میں بھی غلطی کی ہے، لیکن خوبی یہ ہے کہ درمیان میں بعض ایسے اقتباسات بھی درج کئے ہیں، جن سے قاری یہ سمجھے کہ وہ صرف خلوص ہی کی بات نہیں کر رہے ہیں، علمی وتعلیمی اور ادبی نکتے پر بھی ان کی نظر ہے۔ حالانکہ یہ سب انھوں نے اس لئے نقل کئے ہیں کہ وہ جو محل تعمیر کرنا چاہتے ہیں، سب اس کے نقش ونگار کے کام آئیں۔ مثلاً ان خطوط میں خواتین کی تعلیم وتربیت پر جو خیالات آگئے ہیں ان کا بھی ذکر کردیا گیا ہے، لیکن ساتھ ہی راز ونیاز کی باتیں بھی دکھائی ہیں تاکہ وہ جو ثابت کرنا چاہتے ہیں، قاری کا ذہن اس سے نہ ہٹے۔ جیسے جہاں شخص کا لفظ استعمال کرنا چاہئے وہاں پر وہ مرد کا لفظ استعمال کرتے ہیں تاکہ شخص

سے شخصیت کا پہلو نہ نکلے بلکہ مرد سے عورت اور مرد کا تصور سامنے آئے۔ اسی طرح علامہ شبلی نے عطیہ فیضی کے اندر ادبی مذاق پیدا کرنے کے لئے جو اشعار یا غزلیں ان کو بھیجیں، اس سے انہوں نے وہی مفہوم نکالا جو علی العموم غزلوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر لکھتے ہیں:

> ''ان خطوط سے جیسا کہ میں شروع میں لکھ چکا ہوں محبت اور خلوص کی بو آتی ہے اس سے قبل مولانا کے رقعات کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں لیکن وہ اس داستان سے خالی ہیں۔ محبت کے ولولے اور راز و نیاز کی سرگوشیوں کا لطف لینا ہو تو ان رقعات کو پڑھنا چاہئے یہ وہ جواہر ریزے ہیں جو ہمارے ادیبوں اور انشا پردازوں کے کلام میں مشکل سے ملیں گے اور اگر ہیں بھی تو یا تو فرضی اور بناوٹی یا پایہ تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔'' (خطوط شبلی، ص:۲۴)

ہمیشہ اور ہر ادبی و تنقیدی معاملہ میں مولانا حالی سے علامہ شبلی کا موازنہ کر کے علامہ شبلی کو ہیچ ثابت کرنے والا قلم یہاں کس طرح داد دے رہا ہے اور ابتدا میں خلوص و محبت کی جس بو کا ذکر کیا تھا، کیسے کیسے آہستہ آہستہ اس کو ایک داستان بناتا جا رہا ہے۔ اس کے بعد خطوط سے چند اقتباسات نقل کر کے اس داستان کو اور بھی رنگین بناتے ہیں۔ بعد ازاں احتیاطاً چند جملے جن سے عطیہ فیضی کی تربیت مقصود ہے وہ بھی نقل کرتے ہیں تاکہ سیدھا ان پر الزام نہ عائد ہو سکے۔

یہ رنگین داستان کی تخلیق دراصل علامہ شبلی کی بلند اور عظیم المرتبت شخصیت کو غارت کرنے کی ان کی اس کوشش کا انجام ہے۔ جس کا انھوں نے گلشن ہند کے مقدمہ سے آغاز کیا تھا۔ یہ خطوط ان کے لئے آخری تیر ثابت ہوئے۔

بابائے اردو نے خلوص و محبت کی جو بو محسوس کی تھی دراصل اس میں کوئی برائی بھی نہیں تھی۔ علامہ شبلی نے اپنے دوست حسن علی آفندی کی بیٹوں سے کام لینے کے لئے بڑی شفقت و مروت کا معاملہ کیا بھی ہے اور اس شفقت آمیز رویے کو بابائے اردو جو خود خلوص و محبت کی بو سے مدۃ العمر نا آشنا رہے اسی غلط انداز میں محسوس کر سکتے تھے اور کیا۔ انھوں نے ایک آخری دلیل یہ بھی دی کہ علامہ شبلی اکل کھرے اور تنگ مزاج تھے۔ باوجود اس کے انھوں نے کس درجہ نرم اور سبک انداز ان خطوط میں اختیار کیا ہے، مگر بات اس سے بھی نہیں بنتی۔ مکاتیب شبلی کے متعدد مکتوبات

سے اسی انداز کا احساس عام ہے اور وہ علامہ شبلی کے حسن وسلوک اور انتہائی دلفریب انداز نگارش سے مزین ہیں۔ مقدمہ کے آخر میں ان کی حسرت وتمنا نے الفاظ کا جامہ پہن لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہو گئی ہے۔ زمانہ کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا، وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے۔ ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی، لیکن بعض تصانیف ان کی ایسی ہیں جو مدتوں شوق سے پڑھی جائیں گی اور انھیں میں یہ خطوط ہیں۔'' (ایضاً ص:۳۶)

ان کی یہ تمنا پوری نہیں ہو سکی۔ آج وہ ہوتے تو دیکھتے کہ علامہ شبلی اور ان کی تصنیفات کا جلوہ ہندوستان سے آگے نکل کر عالم اسلام کو متحیر کر رہا ہے اور ان کی حیثیت ایک علمی رہنما کی قائم ہو چکی ہے۔ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں تصانیف شبلی کے ۱۴۲ ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور ایک ایک کتاب کے پچاس پچاس ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ شاید اسی بنا پر انھیں آخر میں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا اور انھوں نے پاکستان جانے کے بعد علامہ شبلی کی تعریف وتحسین شروع کی اور ایک موقع پر جب عبداللطیف اعظمی [۱۹۱۷-۲۰۰۲ء] نے ان سے ان کی مخالفت کا سبب پوچھا تو انھوں نے سرے سے مخالف ہونے ہی سے انکار کر دیا اور لکھا کہ یہ صریحاً غلط ہے۔ (ادیب شبلی نمبر ص ۱۵)

اس مقدمہ سے علامہ شبلی کی شخصیت کو نقصان ضرور پہنچا، مگر خطوط شبلی میں ایسا کچھ نہ تھا جو بیان کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خطوط آج سب کے سامنے ہیں اور ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بابائے اردو کا مقدمہ پڑھے بغیر پڑھا جائے۔

اس مقدمہ کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ ذہن کو غلط راہ پر ڈال دیتا ہے اور صحیح نقطۂ نظر قائم نہیں ہونے دیتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ جو لوگ مقدمہ پڑھیں وہ ڈاکٹر ابن فرید کا مقالہ ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' کا بھی مطالعہ کریں جس میں انھوں نے بابائے اردو کے غلط رخ کو صحیح رخ پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مقالہ ان کی کتاب 'میں، ہم اور ادب' میں بھی شامل ہے۔

اس مقدمہ کے بعد بابائے اردو نے علامہ شبلی کے خلاف کوئی قابل ذکر کام تو نہیں کیا بلکہ انھیں کرنے کی بھی اب ضرورت نہیں تھی۔ انھوں نے ایک لائق جانشین پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ منشی

محمد امین زبیری نے اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھایا اور کئی کتابیں لکھیں۔اس کا حاصل ڈاکٹر وحید قریشی [۱۹۲۵-۲۰۰۹ء] کی کتاب ''شبلی کی حیات معاشقہ'' ہے جو ۱۹۵۰ء میں لکھی گئی۔گویا بابائے اردو نے علامہ شبلی کے خلاف جو مہم چھیڑی تھی وہ تقریباً پچاس برس قائم رہی، لیکن جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے۔آج علامہ شبلی اور ان کے کارنامے ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے روشن باب کا حصہ ہیں اور تراجم کے ذریعہ ان کی کاوشیں افغانستان، ایران، ترکی، سعودی عرب، بیروت، مصر حتیٰ کہ دوشنبے تک پہنچ گئی ہیں۔ایران کے ایک شخص سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے پوری زندگی تصانیف شبلی کے فارسی تراجم میں گذار دی اور یہ سلسلہ ترکی، بیروت اور مصر میں اہل قلم یوسف پراچہ اور ڈاکٹر جلال سعید الحفناوی کے ذریعہ آج بھی جاری ہے۔کیا اسی کو لونی لگنا کہتے ہیں اور اگر یہی لونی ہے تو ابھی اور لگے گی۔

مشہور نقاد انجم اعظمی نے بابائے اردو کی مخالفت پر تبصرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''مولوی عبدالحق ساری زندگی شبلی کو سرسید کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔حالانکہ سرسید کا شبلی سے بڑا مداح پیدا ہی نہیں ہوا۔شبلی کی نظم ونثر دونوں ہی اس کی گواہ ہیں۔ہاں یہ سچ ہے کہ سرسید سے انتہائی عقیدت کے باوجود شبلی ان سے دوسروں کی نسبت زیادہ ہی اختلافات رکھتے تھے۔لیکن اختلاف رائے کو مخالفت اور دشمنی سے جاملانا مولوی عبدالحق جیسی نامور شخصیت کا کام تو ہوسکتا ہے جو شبلی سے کچھ ذاتی پرخاش بھی رکھتے تھے۔مجھ جیسا معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا یہ جرات نہیں کرسکتا۔'' (ادب اور حقیقت، ص:۲۲۸-۲۲۹)

---

(۳۳)

عبداللہ خاں

[•••]

عبداللہ خاں کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے ذمہ دار تھے۔علامہ شبلی نے تذکرہ گلشن ہند کی

تصحیح متن، حواشی اور تقدیم کے بعد اشاعت کے لئے انہیں کو دیا تھا۔ تذکرہ گلشن ہند کے پہلے ایڈیشن میں جو ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا، ناشر کی حیثیت سے عبداللہ خاں نے بھی ایک 'التماس' لکھی ہے۔ اس میں انہوں لکھا ہے کہ

> ''یہ تذکرہ ہمارے کرم فرما مولوی غلام محمد صاحب مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کے ہاتھ لگا، انہوں نے علامہ شبلی کو دکھایا۔ علامہ موصوف نے اس کو بدرجہ غایت پسند کیا اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا، لیکن انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے اس کو نہ چھاپ سکی۔ اور علامہ موصوف نے ہم کو اس کے شائع کرنے کی رائے دی۔ اور خود اس کے اڈٹ کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ علامہ موصوف نے اس کی تصحیح بھی کی، اور اس پر کچھ نوٹ بھی لگائے، جو بجنسہ چھاپ دئے گئے ہیں۔'' (تذکرہ گلشن ہند، ص:۴)

---

(۳۴)

مہدی حسن افادی

[۱۸۷۰-۱۹۲۱ء]

مہدی حسن افادی کا نام ان لوگوں میں بہت نمایاں ہے جو علامہ شبلی سے بے حد متاثر ہوئے اور تا حیات اس کا برملا اظہار کرتے رہے۔ اور شاید ان کی اپنی انفرادیت کے ساتھ یہ عشق شبلی بھی اردو ادب میں ان کی دوامی زندگی کا سبب بنا۔

اردو کے نامور ادیب وانشا پرداز مہدی حسن افادی گورکھپور کے رہنے والے جدید تعلیم یافتہ اور بڑے نستعلیق شخص تھے۔ تحصیل دار کی حیثیت سے مختلف تحصیلوں پر تعینات رہے۔ ادب و انشا کا بڑا عمدہ اور صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے۔

وہ علامہ شبلی کے انتہائی خاص احباب میں تھے بلکہ ان کے بڑے معتقد و مداح اور ان کے ادب وانشا کے ایک بڑے شیدائی تھے۔ علامہ شبلی کو ''ملک میں تاریخ کا معلم اول''، انہیں کا دیا ہوا

خطاب ہے۔"شعر العجم"کو وہ ادب عالیہ کا نمونہ قرار دیتے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ علامہ شبلی کی ہر ادا پر جان دیتے تھے۔واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کا ایسا عاشق شاید ہی کوئی اور پیدا ہوا ہو۔عبدالقوی دسنوی نے بھی اپنے مقالے میں اس بات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> "وہ اس تحریک (علی گڑھ) کی سب سے قدآور شخصیت علامہ شبلی نعمانی سے بے حد متاثر تھے۔ان کی عظمت اور قدر و قیمت کے معترف تھے۔اور ان سے طرح طرح کی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے۔شبلی ان کے دل و دماغ پر جس حد تک چھائے ہوئے تھے اس کا نمایاں اثر ان کی تحریر و تقریر اور فکر و خیال پر پڑا۔وہ بہت کچھ نہ لکھنے کے باوجود وہ مقام حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب ہو گئے جو بہتوں کو سب کچھ لکھنے کے بعد بھی نہیں ملتا۔"
>
> (مہدی حسن افادی، ص:۷)

---

(۳۵)

راجہ محمد اعجاز رسول خاں

[***]

راجہ محمد اعجاز رسول خاں، ریاست جہاں گیر آباد ضلع بارہ بنکی صوبہ متحدہ کے ایک تعلقہ دار تھے۔انہوں نے ایک دوسرے تعلقہ دار راجہ نوشاد علی خاں [۱۸۷۰-۱۹۱۲ء] صاحب تعلقہ دار ارمیلا رائے گنج ضلع بارہ بنکی صوبہ متحدہ کا اردو دیوان "دیوان نوشاد" مرتب کر کے شائع کرایا۔ دونوں نواب بڑے باذوق اور شعر و ادب کے نہ صرف دلدادہ تھے بلکہ خود بھی داد سخن بھی دیتے تھے۔دونوں نوابوں کے علامہ شبلی سے گہرے مراسم تھے۔اور دونوں علامہ شبلی کی قدر و منزلت سے بخوبی آگاہ بھی تھے، جیسا کہ "دیوان نوشاد" کے مقدمہ اور ندوہ کی بعض رودادوں وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔

راجہ اعجاز رسول نے راجہ نوشاد علی خاں کے "دیوان" پر مفصل مقدمہ لکھا ہے۔اس سے

ان کی ادبیات بالخصوص اردو ادب پر گہری نظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا کہ اس کی تصویر پیش نظر ہو جائے، ارسطو کے نزدیک شاعری کا اصلی عنصر یہی ہے،تصویر اور محاکات کے متعلق طولانی بحث ہے مگر مولانا شبلی نے ان دونو کا فرق ظاہر کرنے کے لئے مرزا قاآنی کا ایک نہایت عمدہ بند ان کے مسمطات سے انتخاب کیا ہے،جس میں دکھایا ہے کہ یہاں شاعر نے جس چیز کی تصویر دکھائی ہے مصور اس سے عاجز ہے۔.................
>
> ایسی تصویریں تو اشعار میں مشکل سے ملیں گی،مگر حضرت نوشاد کے یہاں بھی ان کی فکر کے مطابق چند شعر اس عنوان کے تحت میں داخل ہو سکتے ہیں۔''
>
> (دیوان نوشاد،ص:۱۲-۱۳)

---

(۳۶)

مولانا ظفر علی خاں

[۱۸۷۳-۱۹۵۶ء]

نامور ادیب وشاعر،صحافی اور مجاہد آزادی مولانا ظفر علی خاں مدیر روزنامہ زمیندار لاہور علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ایم اے او کالج علی گڑھ میں ان سے درس لیا تھا۔اور تاحیات اپنے استاد کا ذکر بڑے ادب واحترام سے کرتے رہے۔

علامہ شبلی کی کتاب زندگی کا ایک خاص باب ان کی اپنے تلامذہ سے محبت اور تعلق ہے۔وہ ہمیشہ ان کی مدد کرتے اور ان کے کام آتے تھے۔اگر مختلف تلامذہ کے ساتھ ان کے حسن سلوک کی داستان قلم بند کی جائے تو بجائے خود وہ ایک دلچسپ کتاب ہو جائے گی۔مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ بھی ان کا یہی شفقت آمیز طرز عمل رہا۔تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے متعدد رسائل و جراید نکالے۔ان میں دکن ریویو اور پنجاب ریویو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔علامہ شبلی نے اپنی

تحریروں سے ان کے جاری رکھنے میں ان کی مدد کی۔ چنانچہ ان کے متعدد مقالات شائع ہوئے۔ ایک بار تو انہوں نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب ''شعر العجم'' کا ایک باب ہی ماہنامہ دکن ریویو میں اشاعت کے لئے دیدیا تھا۔ جو بالاقساط شائع ہوا۔

کئی ملی معاملات و مسائل میں استاد اور شاگرد کے نقطہ نظر میں اختلاف ہوا۔ اور شاگرد نے برملا اختلاف کیا، حتیٰ کہ اختلافی بیان اخبارات میں شائع ہوا، لیکن استاد کا ظرف دیکھئے، اس نے اپنے موقف کی وضاحت و تشریح کی اور شاگرد کو قائل کرنے کے لئے دلائل پیش کئے۔ اس اختلاف کے باوجود استاد اور شاگرد کے تعلقات میں بال نہیں آیا۔ شاگرد نے بھی استاد کے ادب و احترام اور احسانات کے ذکر میں بخل سے کام نہیں لیا اور نہ یہ احساس پیدا ہوا کہ میں اب بلند مقام پر فائز ہو چکا ہوں۔ بلکہ یہ کہتا رہا کہ

یہ فیض صحبت علامہ شبلی کا تصدق ہے
کہ دنیائے ادب میں دھوم ہے میرے مقالوں کی

وہ دور طالب علمی ہی میں علامہ شبلی سے بے حد متاثر ہو گئے تھے۔ چنانچہ بعض فارسی قصائد علامہ کی شان میں اسی دور میں کہے اور مجامع میں سنائے۔ اس کی تفصیل مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں اور مولانا ظفر علی خاں کے سوانح نگاروں نے بیان کی ہے۔ بہر حال استاد اور شاگرد دونوں یگانہ روزگار تھے اور دونوں ایک دوسرے کے لئے مایہ فخر بھی۔

گو ایک زمانہ میں مولانا ظفر علی خاں کا رجحان مسلم لیگ کی طرف ہو گیا تھا مگر اپنے استاد کی طرح ہندو مسلم اتحاد کے وہ ہمیشہ داعی رہے۔

---

(۳۷)

پنڈت منوہر لال زتشی

[۱۸۷۶-۱۹۴۴ء]

پنڈت منوہر لال زتشی اردو اور انگریزی کے مصنف تھے۔ دونوں زبانوں میں ان کی

تصنیفات شائع ہوئی ہیں۔ اردو میں ''کبیر صاحب'' ان کی بہت مشہور کتاب ہے۔ یہ جب طلبہ کے لئے ''گلدستہ ادب'' مرتب کر رہے تھے، علامہ شبلی سے رابطہ کیا۔ بقیہ ذکر زتشی صاحب کے قلم سے سنئے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''میں ان سب بزرگوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے نہایت دریادلی سے مجھ کو اپنی تصانیف سے یا ایسی تصانیف سے جو ان کے قبضہ میں تھیں انتخاب کرنے کی اجازت دی۔
>
> حضرت شبلی نعمانی کا میں خصوصاً شکرگذار ہوں۔ جناب ممدوح نے نہ صرف اپنی شائع شدہ تصانیف سے انتخاب کرنے کی اجازت دی بلکہ شعر العجم کی چوتھی جلد شائع ہونے کے قبل اس کا پروف مجھ کو بھیج دیا اور اس میں سے جو مضامین میں چاہتا تھا اس کو اخذ کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔''
>
> (گلدستہ ادب، ص:۱)

---

(۳۸)

پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ

[۱۸۷۶-۱۹۲۷ء]

علامہ شبلی نعمانی نے ۱۹۰۳ء میں جب انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کا عہدہ سنبھالا تو اردو کی ترقی کے لئے متعدد علمی و عملی منصوبے بنائے۔ خاص طور پر انجمن کی جانب سے کتابیں لکھانے اور ترجمہ کرانے کا آغاز کیا اور اس میں اس قدر مصروف رہتے کہ سررشتہ علوم و فنون حیدرآباد کی ملازمت کے بعد ان کا تمام وقت اسی کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس کا ذکر خود انہوں نے اپنے متعدد خطوط میں کیا ہے۔

علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کا بہت سا کام تن تنہا انجام دیتے۔ انجمن کی سالانہ رپورٹس جو انھوں نے نواب محسن الملک کو پیش کیں اور جو شائع ہو چکی ہیں، ان سے انجمن کے حوالہ سے علامہ

شبلی کی تمام کارگذاریوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی تمام تفصیل راقم نے اپنی کتاب ''علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو'' مطبوعہ مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا میں قلم بند کی ہے۔

انجمن کے آغاز میں علامہ شبلی نے یہ کوشش بھی کی کہ اس وقت اردو میں جس قدر کتابوں کا ذخیرہ ہے اس کی ایک مبسوط فہرست مرتب کی جائے۔ اس اہم کام کے لئے انہوں نے پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی کو آمادہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے الفہر ست کے نام سے اردو کتابوں کی ایک فہرست تیار کی۔ اردو میں غالباً یہ پہلا اشاریہ کتب ہے جو الفہر ست کے نام سے مرتب ہوا۔ یہ اشاریہ کتابی صورت میں علامہ مرحوم کی وفات کے ۸ر سال بعد ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ الفہر ست کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۰۳ء میں جب انجمن ترقی اردو قائم ہوئی تو ایک تجویز یہ بھی ہوئی تھی کہ ایک فہرست ان کتابوں کی مرتب کی جائے جو اس وقت تک تصنیف وتالیف ہو چکی ہیں، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہر فن میں کس قدر کتابیں کس کس پایہ کی موجود ہیں تاکہ آئندہ ان سے بہتر کتابیں تصنیف کرائی جائیں اور اردو کا قدم علم کے میدان میں آگے بڑھایا جائے۔
>
> مولانا شبلی مرحوم کے ایما سے راقم نے اس کام کو شروع کیا تھا اور اسی سال اس کا ایک حصہ تیار بھی کر لیا تھا جس کا ذکر مولانا ممدوح نے رپورٹ انجمن ترقی ۱۹۰۳ء میں کیا تھا، تھوڑے دن کے بعد مولوی شبلی صاحب حیدرآباد سے چلے گئے اور انجمن نے اس کام کی طرف توجہ نہ دی۔''
>
> (الفہر ست دیباچہ، ص: ۳، نظام دکن پریس حیدرآباد، ۱۹۲۳ء)

الفہر ست انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع نہ ہو سکی۔ اس وقت بابائے اردو مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ غالب گمان یہ ہے کہ چونکہ یہ علامہ شبلی کا آغاز کردہ کام تھا اس لئے انہوں نے اس کی اشاعت سے اغماز برتا۔ بہرحال اردو میں اسی کتاب سے اشاریہ سازی کا آغاز ہوا جس کا سہرا علامہ شبلی کے سر جاتا ہے۔

---

(۳۹)

علامہ سر محمد اقبال

[۱۸۷۷-۱۹۳۸ء]

علامہ سر محمد اقبال، علامہ شبلی سے بیس سال چھوٹے یعنی ان کے بعد کی نسل سے تھے۔ جو ان کے افکار سے متاثر ہوئے۔ دونوں کے درمیان مراسم اور خط وکتابت بھی رہی۔ علامہ اقبال نے اپنی کتاب ''علم الاقتصاد'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ

> ''مخدوم ومکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی۔'' (علم الاقتصاد، ص:۶)

اب تک ماہرین اقبالیات یہ طے نہیں کر سکے کہ علامہ شبلی نے علامہ اقبال کی زبان کی اصلاح کب کی تھی اور آیا اصلاح کا یہ عمل خط وکتابت کے ذریعہ ہوا یا ملاقات کے ذریعہ۔ اس لئے کہ دونوں کی پہلی ملاقات کا سنہ اب تک راقم کی تحقیق کے مطابق ۱۹۰۳ء ہے۔

دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے۔ علامہ اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں علامہ شبلی کی بعض کلامی تصنیفات سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علامہ شبلی کو مستقل طور پر پنجاب بلانا چاہتے تھے، جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کے بعد بلکہ تاحیات علامہ شبلی نے جب بھی کوئی علمی یا ملی یا کلامی منصوبہ بنایا تو اس میں علامہ اقبال کو شامل کرنے کی کوشش کی۔ اور انجمن ترقی اردو میں انہیں شامل کرنے میں تو وہ کامیاب بھی ہو گئے اور کئی مسودات کی اشاعت کے فیصلے میں علامہ اقبال کی رائے شامل تھی۔

شبلی واقبال کی شخصیت، تعلیم وتربیت، نشوونما اور ذوق ومزاج اور فکر وخیال میں بھی بڑی ہم آہنگی ہے۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چونکہ دونوں کا مقصد حیات ایک اور غور وفکر کا طرز واسلوب بھی ایک تھا اور علامہ اقبال نے انہی قدروں کو ارتقا کی منزلوں سے ہم کنار کیا جو علامہ شبلی کی بھی آرزو تھیں۔ اس لئے محققین اور اہل قلم نے اقبال کو پیروئے شبلی قرار دیا اور بلاشبہ

علامہ شبلی کے افکار ونظریات کی مکمل عکاسی کلام اقبال سے ظاہر ہوتی ہے۔ عالم خوندمیری نے لکھا ہے کہ ملت میں سربلند ہونے کی جو تمنا ہمارے دلوں میں مچل رہی ہے اس تمنا کی چنگاری علامہ شبلی نے سلگائی تھی۔ (صبا حیدرآباد شبلی نمبر ص ۵۶) یہی نہیں انہوں نے علامہ شبلی نعمانی کا اصل وارث ابوالکلام اور اقبال کو قرار دیا ہے۔ (ایضاً) ان کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ شبلی نے ملت کے مرض کی صحیح تشخیص کی تھی مگر وہ نسخہ تجویز نہ کر سکے تھے۔ یہ نسخے ابوالکلام اور اقبال نے تجویز کیے۔ (ایضاً)

اس تاثیر وتاثر کی داستان راقم کی کتابوں ''اقبال اور دبستان شبلی'' اور ''نقوش شبلی'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

---

(۴۰)

پروفیسر سید نواب علی

[۱۸۷۷-۱۹۶۱ء]

پروفیسر سید نواب علی سابق وزیر تعلیم ریاست جوناگڑھ، استاد، اہل قلم اور مصنف تھے۔ ان کے قلم سے متعدد مضامین اور بلند پایہ کتابیں نکلیں۔ سیرۃ المصطفیٰ، معارج الدین اور تاریخ صحف سماوی ان کی معروف کتابیں ہیں۔

ان کی تعلیم کننگ کالج لکھنؤ میں ہوئی تھی، اس زمانہ میں وہ علامہ شبلی کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے اور ماہنامہ الندوہ میں مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں دیگر کتابوں کے ساتھ علامہ شبلی کی الکلام، الغزالی اور رسائل شبلی سے مستفید اور متاثر ہونے کا ذکر صراحت سے کیا ہے۔ پھر علامہ شبلی کی تصانیف اور خود ان سے اپنی گرویدگی بھی بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ

> ''۱۹۰۳ء میں جب میرا تقرر بڑودہ کالج میں ہوگیا تو سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر دس مضامین سیرۃ المصطفیٰ کے نام سے لکھنا شروع کیے۔ اس زمانے میں مولانا شبلی بڑودہ تشریف لے گئے اور جسٹس عباس

طیب جی مرحوم کے بنگلہ پر پہلی ملاقات ہوئی۔ مولانا کی تصانیف مجھے پہلے ہی گرویدہ کر چکی تھیں۔ اب ان کے حسن اخلاق نے لطف تقریر، ذوق سخن اور تبحر علمی نے اور بھی گرویدہ کر لیا۔ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تعطیلوں میں جب بھوپال جاتا تھا تو منشی منصب علی صاحب کے مکان پر مولانا سے اکثر ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تھا۔'' (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص:۷۹)

اس اقتباس سے ان کی شیفتگی شبلی کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ علامہ شبلی بڑودہ میں عباس طیب جی اور بھوپال میں منشی منصب علی کے یہاں قیام کرتے تھے۔ جسٹس عباس طیب جی، بدرالدین طیب جی کے داماد تھے۔ پروفیسر سید نواب علی یہاں بھی شریک بزم ہوتے تھے۔ (ماہنامہ ادیب، شبلی نمبر، ص:۴۰۵)

۱۹۰۷ء میں پروفیسر سید نواب علی نے سیرت پر ایک کتاب سیرۃ المصطفےٰ لکھی۔ علامہ شبلی نے اس کا تذکرہ الندوہ کے شذرات میں کیا اور لکھا کہ

ہمارے دوست مولوی نواب علی صاحب ایم اے پروفیسر بڑودہ کالج نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اردو زبان میں سوانح عمری لکھی ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔ جس جوش عقیدت سے انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے اس سے ایک پرانے مولوی کی شان نظر آتی ہے۔ ہم اس کے نہایت معترف ہیں، لیکن ایک ایم اے سے ہم اس بات کے متوقع تھے کہ یورپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جو بے شمار کتابیں لکھی ہیں، ان پر بھی نظر ہوتی اور ان سے بحث کی جاتی۔ بہرحال ہم اپنے دوست کے پھر بھی مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنے ہم عصروں سے بڑھ کر کام کیا ہے۔'' (شذرات شبلی ص:۱۰۲-۱۰۳)

اس تبصرے کا یہ اثر ہوا کہ پروفیسر سید نواب علی نے ایک اور کتاب قلم بند کی، وہ لکھتے ہیں

''تذکرۃ المصطفےٰ'' سنہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوگئی تو مولانا (شبلی) کا یہ ناقدانہ فقرہ کہ ''کتاب پرانے رنگ میں اچھی ہے، مگر ایک نئے تعلیم پائے ہوئے سے کچھ اور ہی امید ہے''۔ تازیانہ کا کام کر گیا اور میں نے فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا

مطالعہ شروع کیا۔ خصوصاً اسپنسر، ڈارون، ہکسلے، ہیگل، الیورلاج، ویلس، ہافڈنگ اور برگس کی تصانیف پر غور کرتا رہا۔ پھر معارج الدین کا حصہ اول شائع کیا، مگر افسوس مولانا اسی سال رحلت فرما چکے تھے۔"

(مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص:۷۹)

پروفیسر سید نواب علی بڑودہ کالج میں ۲۶ سال پروفیسر رہے۔ اس دوران علامہ شبلی کئی بار وہاں تشریف لے گئے۔ ان سے خط وکتابت بھی رہی۔ ان کے نام مکاتیب شبلی میں علامہ شبلی کے پانچ خطوط شامل ہیں۔ "شبلی کے مکتوب الیہ" میں ان کا تذکرہ شامل ہے۔

---

(۴۱)

سید احمد مرتضیٰ نظرؔ

[۱۸۷۸-۱۹۴۲ء]

مولوی سید احمد مرتضیٰ نظرؔ پختہ مشق اہل قلم، مورخ و مصنف اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اصلاً نصیر آباد ضلع رائے بریلی اتر پردیش کے باشندہ تھے، مگر ان کے والد نے سیرونج مدھیہ پردیش میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ بھی مدۃ العمر سیرونج میں مقیم اور وکالت کرتے رہے اور پھر ۱۹۴۲ء میں سیرونج ہی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

سید مرتضیٰ نظر نے دو بڑی اہم تاریخی کتابیں "آثار مالوہ" اور "صولت شیر شاہی" (مطبوعہ:۱۹۳۴ء) سپرد قلم کیں۔ علامہ شبلی سے ان کے تعلقات تھے اور خط وکتابت بھی کی تھی۔ علامہ کی وفات پر انھوں نے جو قطعہ تاریخ کہا تھا وہ حیات شبلی میں شامل ہے۔ انھوں نے تاریخ "صولت شیر شاہی" کے دیباچہ میں علامہ شبلی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"اردو زبان کی عمر گو بہت کم ہے، لیکن یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ اپنے عاشقوں اور قدردانوں کی خاص توجہ سے اس نے ترقی کے مدارج کو اس قدر جلد طے کر لیا کہ بقول علامہ شبلی مرحوم علمی زبان کی بلند کرسی پر پہنچنے کے قریب ہوگئی ہے اور مقام

مسرت ہے کہ اس زبان میں آج تک مختلف علوم وفنون ،تواریخ وسیر میں سحرنگارانشاپردازوں کے قلم سے ہزاروں لاکھوں کتابیں مرتب ہوکر شائع ہوچکی ہیں اوراب تک سلسلہ تالیف وطباعت برابر جاری ہے،لیکن میں افسوس کے ساتھ اس امرواقعی کے اظہار پر مجبور ہوں کہ جس طرح بعض متقدمین نے اصول سیرت نگاری سے قطع نظر کرلیا ہے، اسی طرح موجودہ دور کے اردومورخین نے بھی باستثنائے خواص، اس ضروری اوراصولی عناصر کوشامل کرنے سے اجتناب کیا ہے، جس کی وجہ سے حقائق کے چہرہ پرنقاب پڑ جانا ناگزیر ہوا۔

مورخین اردو میں سب سے پہلے ہندوستان کے مشہورادیب ومورخ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کوفلسفہ کی نگاہ سے دیکھ کردرایت اورتنقید کاراستہ نکالا، جس کی تقلید کوخواص اہل قلم نے اپنا شعار بنایا۔"

(صولت شہرشاہی،ص:۶)

اس تحریر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نظرصاحب علامہ شبلی سے کس درجہ متاثراوران کے کس قدرمعترف ومداح تھے۔ان کے درمیان جوخط وکتابت ہوئی ہے اوران کے نام علامہ شبلی کے جوخطوط "مکاتیب شبلی" میں درج ہیں، ان سے بھی ان کی اثرپذیری کے شواہد ملتے ہیں۔

---

(۴۲)

خواجہ حسن نظامی

[۱۸۷۸-۱۹۵۵ء]

خواجہ حسن نظامی دہلوی سے علامہ شبلی کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔متعدد ملاقاتوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔عرصہ تک خط وکتابت رہی۔۱۹۲۹ء میں خواجہ صاحب نے اپنی کتاب "اتالیق خطوط نویسی" شائع کی، جس میں انھوں نے اپنے خطوط کے ساتھ نامی مسلمانوں کے خطوط بھی شامل کیے ہیں۔اس میں علامہ شبلی کے بھی بیس خطوط شامل ہیں۔خواجہ صاحب کے ذخیرہ خطوط

میں انگریزی، ہندی، گجراتی اور اردو کے نامور اہل علم کے متعدد خطوط تھے۔ مکتوب نگاروں کا ذکر انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ سن کر اردو کے ایک لفافہ نے اپنے ساتھیوں کو غور سے دیکھا کہ کون کون موجود ہیں تو معلوم ہوا کہ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا کارڈ ہے۔ مولانا شبلی کا لفافہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا مکتوب ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال کا لیٹر ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا صحیفہ ہے۔ حکیم نورالدین خلیفہ مرزا صاحب کا نامہ ہے۔ اور تو اور نواب محسن الملک اور مولانا حالی کے خطوط ہیں۔''

(اتالیق خطوط نویسی، ص:۳۵)

خواجہ صاحب اپنے عہد کے ادیبوں کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''آج کل کے زمانہ میں مسٹر محمد علی، مسٹر ظفر علی، ابوالکلام صاحب آزاد، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب اور مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی اردو کے بے مثل ادیب ہیں۔ علامہ شبلی رحلت کر گئے وہ بھی اسی زمرہ میں تھے۔''

(اتالیق خطوط نویسی، ص:۴۰-۴۱)

بعد ازاں خواجہ صاحب نے مکتوب نگاروں کا ایک ایک دو دو جملوں میں تعارف کرایا ہے۔ علامہ شبلی کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی مورخ تھے۔ مبالغہ کی رنگینی سے ان کا قلم محفوظ تھا، تاہم سادہ نگاری میں بھی ایسی دبی ہوئی شوخیاں لکھ جاتے تھے کہ انسان گھنٹوں مزے لیا کرے۔''

(ایضاً ص۴۱)

اتالیق خطوط نویسی میں علامہ شبلی کے دراصل خطوط کا ایک انتخاب شامل ہے، خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال، مولانا ابوالکلام، علامہ شبلی کے خطوط زیادہ تھے۔ میں نے ان میں سے نصف سے بھی کم لئے ہیں، کیوں کہ بعض مکتوب بالکل پرائیویٹ تھے اور بعض میں کوئی ایسی ادبی بات نہ تھی جس سے پبلک کو تعلق ہوتا۔'' (ایضاً ص۴۳)

''اتالیق خطوط نویسی'' میں متعدد ناموروں کے خطوط شامل ہیں۔ ان میں اکبرالہ آبادی مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ شبلی، ڈاکٹر اقبال، نواب محسن الملک، مرزا غلام احمد قادیانی، حکیم نور الدین قادیانی، منشی ذکاءاللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر چار ادیبوں اور شاعروں کے متعدد خطوط شامل ہیں۔ جب کہ آخر الذکر کے محض ایک ایک خط بطور نمونہ درج کئے گئے ہیں۔ چند خطوط نیاز فتح پوری کے نام کے بھی درج ہیں۔ اکبرالہ آبادی کے خواجہ صاحب کے نام ایک ہزار سے زائد خطوط تھے۔ خواجہ صاحب نے بعد میں علاحدہ ان کا انتخاب شائع کیا، مگر افسوس شبلی و آزاد کے خطوط تلف ہو گئے۔

خطوط کی ترتیب کے بارے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''ان کی ترتیب میں تقدیم وتاخیر ادب کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ میرے عقیدے میں اول درجہ جناب اکبر کے خطوط کا ہے اس لئے وہ سب سے اول ہیں، اس کے بعد ابوالکلام صاحب، پھر علامہ شبلی اور اس کے بعد ڈاکٹر اقبال۔''
>
> (ایضاً،ص:۴۴)

خواجہ صاحب نے بعض مکتوب نگاروں کے خطوط کی شمولیت کے اسباب بھی لکھے ہیں۔ اس میں علامہ شبلی بھی شامل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا ذکاءاللہ صاحب سے میں نے دریافت کیا تھا کہ آپ نے حضرت محبوب الٰہی کی کوئی کرامات دیکھی ہے یا نہیں۔ یہ خط اس سوال کا جواب ہے۔ اسی طرح علامہ شبلی، مرزا صاحب قادیانی، حکیم نورالدین اور ابوالکلام صاحب کے خطوط کو تصور کرنا چاہئے کہ میرے ایک مخصوص سوال کے جواب میں ہیں۔ ان کو درج کرنے کی دو وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ ناظرین ان مشہور ومعروف حضرات کا نمونہ تحریر دیکھ سکیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے خیالات صوفیائے کرام کے متعلق عیاں ہو جائیں۔'' (ایضاً،ص:۴۴)

علامہ شبلی نے شعرالعجم کے لئے امیر خسرو کے حالات اور ان کی شاعری پر نقد وتبصرہ لکھا۔ اسی زمانہ میں خواجہ صاحب کو درویشانہ ادب کی اشاعت کا خیال آیا جو اردو میں درویشانہ ادب کے

سب سے بڑے حامی تھے بلکہ یہ سلسلہ انہی سے شروع ہوکر انہی پر ختم بھی ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں علامہ شبلی سے بھی درخواست کی۔ علامہ نے امیر خسرو پر اپنا مفصل مقالہ ان کے سپرد کردیا اور وہ حلقہ نظام المشائخ کی جانب سے "بیان خسرو" کے نام سے شائع ہوا۔

ایک بار علامہ شبلی دہلی میں ان کے مہمان ہوئے اور ایک ماہ قیام رہا۔ اس دوران میں وقوع پذیر ہونے والے دونوں کے متعدد واقعات قابل ذکر ہیں۔ اور ایک دوسرے سے بے حد متاثر ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی فرمائش پر علامہ شبلی نے حلقہ مشائخ دہلی میں تصوف کے موضوع پر تقریر کی۔ جس میں تقریباً دو ہزار منتخب اشخاص شریک ہوئے۔ یہ تقریر ایک گھنٹہ جاری رہی اور بہت پسند کی گئی۔ خواجہ صاحب نے اسی موقع پر کہا تھا کہ آپ اگر حالی صوفی ہوتے تو سب سے پہلے میں آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوتا۔ یہ تقریر خطبات شبلی نو دریافت میں شامل ہے۔ عظمت رفتہ کے مصنف ضیاء الدین احمد برنی نے لکھا ہے کہ تقریر کے بعد جس عقیدت مندی سے حاضرین نے ان کے ہاتھ چومے وہ سماں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ (عظمت رفتہ، ص:۲۶۶)

---

(۴۳)

حافظ محمود شیرانی

[۱۸۸۰-۱۹۴۶ء]

حافظ محمود خاں شیرانی فارسی زبان وادب کے ایک بڑے اسکالر اور محقق تسلیم کیے جاتے ہیں اور یہ مرتبہ انھیں "تنقید شعر العجم" کی بدولت حاصل ہوا۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک "شعر العجم" پر تنقید لکھی جو غیر مسلسل طریقے سے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ادارت میں نکلنے والے رسالہ "اردو" اورنگ آباد میں شائع ہوتی رہی۔ ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا، بقول مصنف اسے احباب کے تقاضے پر کتابی شکل دی گئی ہے۔ دو صفحے کے پیش کلام میں اس کی توضیح ہے۔

تنقید شعر العجم چار پانچ برس تک رسالہ اردو میں شائع ہوتی رہی اور اس میں جو طرز تحقیق اختیار کیا گیا ہے اس سے ادبی دنیا میں عام خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ تحقیق نہیں علامہ شبلی کی تنقیص کی ہے، لیکن فاضل محقق نے اس کی تردید کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ

> ''میں نہایت وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ تنقید ہذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقصت نہیں ہے بلکہ محض احتجاج ہے، اس مروجہ روش کے خلاف جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔ ہم تاریخی واقعات اور سوانح و حالات کے لکھتے وقت اس قدر تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ ان کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور ان کی صحت و درستی کے متعلق اپنا اطمینان کرلیں۔'' (تنقید شعر العجم ص: الف)

حافظ محمود شیرانی جس کو احتجاج بتا رہے ہیں وہ دراصل خوردہ گیری کے ضمن میں آتا ہے۔ کسی کے سنہ پیدائش میں یا کسی کتاب کے سنہ تصنیف میں دو قول ہو سکتے ہیں اور مورخین کے درمیان یہ فرق عام بات ہے۔ ان میں کسی ایک کو صحیح قرار دے کر اور اس کی رائے کو راجح قرار دینا، اگر واقعی تحقیق و تدقیق ہے تو بلا شبہ حافظ محمود شیرانی نے ''تنقید شعر العجم'' لکھ کر بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، لیکن بہت سے اہل قلم نے ان سے اتفاق نہیں کیا ہے اور خود ان پر بھی اسی قسم کے اعتراضات وارد کیے ہیں، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

راقم نے اپنی کتاب ''آثار شبلی'' میں اس کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے۔ بہر حال اس تنقید کا یہ نتیجہ ہوا کہ جس پنجاب یونیورسٹی نے شعر العجم پر ڈیڑھ ہزار انعام دیا تھا اور اسے اپنے نصاب میں شامل کیا تھا، اسی نے نصاب سے خارج کر دیا۔ شیرانی صاحب لکھتے ہیں:

> ''لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب یونیورسٹی نے ایم اے کے نصاب سے خارج کر دیا ہے تو مجھے بڑا رنج ہوا اور میں نے تنقید کا سلسلہ ختم کر دیا۔'' (ص ب)

اگر یہ تحقیق تھی تو شیرانی صاحب کو اس سلسلہ کو جاری رکھنا چاہئے تھا، جس کتاب میں اس قدر اغلاط ہوں کہ وہ نصاب سے خارج کر دی جائے، اس کی تحقیق ضروری امر تھا، مگر دراصل یہ واقعہ نہیں۔ جہاں تک انھیں جدید مطبوعات حاصل رہیں جو علامہ شبلی کے عہد میں نایاب اور

مخطوطات کی شکل میں تھیں اوران کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی تھی، تب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد وہ اور کیا کرتے اور دراصل بابائے اردو اور حافظ محمود شیرانی صاحب کی خواہش کی تکمیل ہو چکی تھی، یعنی وہ نصاب سے خارج کی جاچکی تھی۔

شعر العجم علامہ شبلی کی بے حد مقبول کتاب ہے۔حافظ محمود شیرانی کی تنقید سے وقتی طور پر ضرور اس کو نقصان پہنچا، تاہم اس کی مقبولیت بڑھتی ہی گئی۔ نہ جانے اس کے کتنے خلاصے اور تشریحات شائع ہوئیں۔کئی خلاصے راقم کی نظر سے گذرے ہیں اوران کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔علاوہ ازیں کئی زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے ہیں، جس کی تفصیل ناچیز کی کتاب ''تصانیف شبلی کے تراجم'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بہر حال شعر العجم کے اثرات نہ صرف ہندوستان میں قائم ہوئے بلکہ ایران وافغانستان کے اہل قلم نے بھی ایک تاثر لیا اور یہ آج بھی متعدد ممالک میں شائع ہورہی ہے اور پڑھی پڑھائی جارہی ہے۔ اردو میں چند ہی ایسی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں جن کے اثرات ملک سے باہر بھی مرتب ہوئے، ان میں ایک علامہ شبلی کی شعر العجم بھی ہے۔

---

(۴۴)

خواجہ سید رشید الدین مودودی

[•••]

خواجہ سید رشید الدین مودودی علامہ شبلی سے بے حد متاثر لوگوں میں تھے۔مشہور یورپین اسکالر مکس ملر کی بیوی کی کتاب سیاحت قسطنطنیہ کا انہوں نے اردو میں ترجمہ کیا۔علامہ شبلی سے اصلاح لی۔حواشی لکھے اور اشاعت کے لئے امادہ کیا۔یہ تمام تفصیل سید رشید مودودی صاحب نے دیباچہ میں لکھی ہے۔خواجہ صاحب علامہ شبلی اوران کے سفرنامہ کا ذکر کس قدر اہتمام سے کرتے ہیں وہ ملاحظہ ہو:

''سفرنامہ روم ومصر وشام جو ہماری قوم کے مقدمۃ الجیش اسلامی سیاح شمس

العلماء مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے چند وجوہ سے درحقیقت ایک بیش بہا تالیف ہے۔ اول تو خود مصنف علامی کا تبحر وذوق علمی، ان کا فضل واحترام جس نے قوم کے مصنفین میں ان کو آج کرسی صدارت کا درجہ بخشا ہے۔ دوسرے ان کے حب علمی وجوش اسلامی جس نے اس کم بضاعتی پر ان کو دور و دراز ممالک اسلامیہ کی سیر کی جرات دی تاکہ وہ خود اس بہارستان عرب وعجم کے خزاں رسیدہ باغ کی سیر سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں، جس کی پرفضا چشموں کے روشوں پر وہ صرف تاریخی صفحات پر عالم خیال میں سیر کرتے رہے تھے۔ پس علامہ موصوف کی تصنیف جس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھی جاوے کم ہے۔ مگر وہ ایک محدود تصنیف ہے۔ جو زیادہ تر ترکوں کی معاشرت وتعلیمی حالات پر شامل ہے۔ یہ ترجمہ شائع کرنے کی ضرورت نہ تھی اگر سفرنامہ روم ومصر وشام سے زیادہ حالات اس میں مندرج نہ ہوتے۔ اور خود علامہ نہایت مہربانی سے مجھ سے اس کے ترجمہ کی اشاعت پر مصر نہ ہوتے۔'' (سیاحت قسطنطنیہ، ص:۴-۵)

آخر میں فاضل مترجم خواجہ سید رشید الدین مودودی علامہ شبلی کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

''میں اپنے مخدوم ومحترم دوست شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی سابق پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ، فیلو یونیورسٹی الہ آباد، حال ناظم علوم وفنون ریاست حیدرآباد دکن کا بھی بدل شکرگذار ہوں جنہوں نے بکمال لطف وعنایت اس ترجمہ کے مسودہ کے مطالعہ میں اپنے وقت عزیز کو صرف فرمایا۔ اور بعض مقامات پر حواشی بھی تحریر فرمائے۔'' (سیاحت قسطنطنیہ، ص:۶)

فاضل مترجم نے علامہ شبلی کے حواشی کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

ان تفصیلات سے یہ واضح ہے کہ سیاحت قسطنطنیہ کے نہ صرف ترجمے میں بلکہ اس کی اصلاح وتصحیح اور اشاعت میں بھی علامہ شبلی کا حصہ ہے۔

(۴۵)

نقی محمد خاں خورجوی

[۱۸۸۰-۱۹۶۹ء]

خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی ایک مصنف گذرے ہیں۔ حیات حضرت امیر خسرو، اعجوبہ اسرار کے علاوہ اپنی خودنوشت ''عمر رفتہ'' بھی لکھی ہے۔ حیات امیر خسرو کے ماخذ میں علامہ شبلی کی شعرالعجم بھی شامل ہے۔ امیر خسرو کی تصنیفات کے بارہ میں علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ بیس سے زیادہ تصنیفات ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ نقی محمد خاں کو شکوہ ہے کہ علامہ شبلی نے ان:

''کتب خانوں کے نام نہیں لکھے۔ شعرالعجم کو چھپے ہوئے بھی تقریباً آدھی صدی کا زمانہ گذر گیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کتب خانے اور کتابیں اب بھی عالم وجود میں ہیں۔'' (حیات حضرت امیر خسرو، ص:۷)

بلاشبہ نقی محمد خاں نے حیات امیر خسرو پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کا مقدمہ مولوی عبدالحق کے قلم سے ہے۔ نقی محمد خاں نے اگرچہ علامہ شبلی کے حوالے نہیں دئے ہیں۔ تاہم جابجا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی کتاب سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔

---

(۴۶)

حکیم حبیب الرحمٰن

[۱۸۸۱-۱۹۴۷ء]

مسیح الملک حکیم حبیب الرحمٰن احسؔن نامور طبیب اور ادیب و شاعر اور مصنف گذرے ہیں۔ ان کے بعض مقالات ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے قلم سے متعدد کتابیں الفاروق، حیات سقراط، مساجد ڈھاکہ، ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے، شعرائے

ڈھاکہ، آسودگان ڈھاکہ اور ثلاثہ غسالہ نکل کر مقبول ہوئیں۔ آخر الذکر غیر مطبوعہ تھی جسے اب مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا نے شائع کر دیا ہے۔

حکیم حبیب الرحمٰن اردو اور بنگال کے عاشق تھے۔ اردو صحافت سے بھی انہوں نے تا حیات رشتہ استوار رکھا۔ ماہنامہ جادو کلکتہ کی ایک عرصہ تک ادارت کرتے رہے۔ اس طرح انہوں نے اردو کی بڑی خدمت انجام دی۔

حکیم صاحب علامہ شبلی کے احباب میں تھے۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا، مگر کوئی خط دستیاب نہیں ہوا۔ حکیم صاحب نے اپنی کتاب ''آسودگان ڈھاکہ'' میں لکھا ہے کہ

> ''سنہ ۱۹۰۶ء میں یہاں ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے متکلم اسلام علامہ شبلی مغفور تشریف لائے تو میں نے ان کی خدمت میں یہ خیال پیش کیا کہ حاجی خلیفہ کی کشف الظنون کی طرح صوبہ وار کتابوں کے حالات مع مصنفین کے مختصر ترجمہ کوئی لکھ دے تو ہندوستان کی یہ ایک بڑی علمی خدمت ہو۔ علامہ نے تحسین فرمانے کے ساتھ حکم دیا کہ بنگال کا حصہ تو پورا کر۔ چالیس برس سے کچھ نہ کچھ کرتا رہا ہوں مگر مسلسل کام نہیں ہوتا۔ تاہم اب کام ختم ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بھی اب کے چھپ جائے کہ بنگال و آسام کی علمی تاریخ ہے۔ اور میرے چہل سالہ جد و جہد کا نتیجہ۔'' (آسودگان ڈھاکہ، ص:۲)

یہ تمام تفصیلات ''ثلاثہ غسالہ'' کے دیباچے میں بھی ہیں۔ جو مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے یہ مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوئی تھی۔

تعجب ہوتا ہے کہ حکیم حبیب الرحمٰن کا زمانہ اس قدر مواصلات کی توانائی و ترقی کا نہ تھا، تاہم علامہ شبلی کے اثرات کہاں کہاں پھیلے ہوئے تھے۔ اور لوگ ان سے کس قسم کی توقعات رکھتے تھے اور وہ ان علمی کاموں کے معین و مددگار بن جایا کرتے تھے۔ آج تمام تر ترقی کے باوجود افسوس ہمارے معاشرے سے یہ تمام قدریں اور روایتیں مٹ گئیں۔ اور ایک بھی ایسا شخص نہیں ملے گا جو ان علمی کاموں کو انجام دے سکے۔

---

(۴۷)

مولوی سید محمد مرتضٰی

[۱۸۸۱-۱۹۲۵ء]

مولوی سید محمد مرتضٰی صاحب بانی حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس حیدرآباد کے قابل اشخاص میں سے تھے۔ علمی وادبی ذوق بہت بلند تھا۔ اچھے اہل قلم تھے۔ متعدد بلند پایہ مقالات ان کے قلم سے نکلے۔ خاص طور پر سوانحی مضامین بڑی تحقیق وتدقیق سے لکھے ہیں۔ ان میں سسلی میں مسلمانوں کی حکومت، سواحل ہند پر مسلمانوں کا توطن، سوانح قادری ناگوری، سوانح باقر آگاہ، سوانح قاضی بدرالدولہ، سوانح سالار جنگ وغیرہ مقالات اہل علم کے درمیان بہت پسند کیے گئے۔

مولانا سید ریاست علی ندوی سے پہلے اردو میں تاریخ صقلیہ کی داغ بیل بھی انہی نے ڈالی تھی۔ علامہ شبلی نعمانی جس زمانہ میں حیدرآباد میں سررشتہ علوم وفنون کے ناظم تھے مولوی سید محمد مرتضٰی سے ملاقات ہوئی اور وہ ان سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۴-۱۹۵۰ء] کے نام ایک خط میں علامہ شبلی نے ان کی ستائش کی ہے۔ ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی نے انہیں اپنا لٹریری اسسٹنٹ بننے کی پیش کش کی تھی۔
(تذکرہ مولوی محمد مرتضٰی، ص:۳۳)

مولوی سید محمد مرتضٰی علامہ شبلی سے خاصے متاثر تھے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے جب انجمن ترقی اردو کی جانب سے تاریخ التاریخ کی تصنیف کا اعلان شائع کیا تو اسے مولوی سید محمد مرتضٰی کو تفویض کیا گیا اور انہوں نے اس موضوع پر ایک جامع کتاب لکھی، جسے وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرتسر نے ۱۹۱۱ء میں شائع کیا۔ اس کے دیباچہ میں مولوی محمد مرتضٰی صاحب لکھتے ہیں:

> ”جس وقت مولوی شبلی صاحب نعمانی کی کتاب تاریخ علم کلام شائع ہوئی تو میں نے اس کے ریویو میں لکھا تھا کہ ”ہمارے خیال میں خود فن تاریخ کی نسبت یہ سوالات کہ کس طرح اس کی ابتدا ہوئی؟ اور کن وجوہ سے ہوئی؟ کس طرح اس نے ترقی پائی؟ کیا کیا تبدیلیاں اس میں ہوتی گئیں؟ اور کن وجوہ سے؟ نہایت

دلچسپ ہو سکتے ہیں اور علی الخصوص یہ سوال کہ اہل مغرب کا اس ترقی میں کہاں تک حصہ ہے؟ اور زیادہ اہم ہے۔ دو سال کا عرصہ گذرا کہ خاص فن تاریخ پر اس اصول کے مطابق ہم نے ایک بسیط مضمون لکھا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ اور غالباً اسی بنا پر انجمن ترقی اردو نے تاریخ التاریخ کا عنوان بھی ہمارے لئے مہیا کر دیا تھا۔" (تاریخ التاریخ: ص: ۱-۲)

پھر علامہ شبلی نعمانی قومی و دینی خدمت کی غرض سے حیدرآباد سے ندوہ لکھنو چلے آئے تو وہاں کی محفلیں اور خاص کر ادبی محفلیں اجڑ گئیں۔ مولوی سید علی بلگرامی، مولانا ظفر علی خاں، سید ہمایوں مرزا وغیرہ ان محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے۔

---

(۴۸)

سید محمد تقی فخر داعی گیلانی

[۱۸۸۱-۱۹۶۴ء]

ہندوستان سے باہر ایران میں علامہ شبلی اور ان کے افکار و خیالات سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والی شخصیت کا نام فخر المحققین سید محمد تقی فخر داعی گیلانی ہے۔ وہ ایران کے شہر گیلان میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے تہران آ گئے۔ وہاں شیخ محمد طالقانی، آقائی میرزا مسیح سمنانی اور فاضل تفرشی جیسے اساتذہ سے علم و حکمت، فلسفہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں تکمیل کے لئے عراق گئے اور ملا عبداللہ مازندرانی اور اخوند محمد کاظم خراسانی سے اکتساب فیض کیا۔ اور ان سے اجتہاد کا اجازت نامہ حاصل کیا۔ انہی اساتذہ کے حکم پر جدید مطالعات اور دعوت و تبلیغ کے لئے سید محمد تقی فخر داعی گیلانی ۱۹۱۰ء میں بمبئی وارد ہوئے۔ یہاں وہ انجمن دعوت اسلامی سے وابستہ رہے۔

سید محمد تقی فخر داعی گیلانی ہندوستان میں تقریباً پندرہ برس مقیم رہے۔ یہاں انہوں نے اردو اور انگریزی زبانیں سیکھیں۔ اندور کے کسی کالج میں چار برس تک عربی و فارسی اور حکمت و

فلسفہ کے استاذ رہے۔ ہندوستان میں وہ بہت سے اہل علم وکمال سے ملے جن میں علامہ شبلی بھی شامل ہیں۔ان سے وہ بے حد متاثر ہوئے بلکہ اس قدر متاثر ہوئے کہ زندگی کا ایک بڑا حصہ شبلی شناسی میں صرف کیا۔انہوں نے اہل ایران کی دلچسپی کے خیال سے ''شعرالعجم'' کی تمام جلدوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور وہاں کے مشہور اشاعتی اداروں سے شائع کرایا۔ بعدازاں ان کے دوسرے ایڈیشن بھی نہایت اہتمام سے ترتیب نو اور اضافات کے ساتھ شائع کرائے۔اوران پر بڑے معلومات افزا حواشی اور مقدمات لکھے۔ان کا خیال ہے کہ

''اگر چہ فارسی شاعری تنہا دنیا کی شاعری کے مقابل کھڑی کی جاسکتی ہے،مگر یہ کہ اس شاعری کا آغاز کب ہوا۔اس کے ظہور کے علل واسباب کیا تھے۔اس نے ارتقا کے مرحلے کیسے طے کئے۔اس میں مرور وقت کے ساتھ پیدا ہونے والے تغیرات کیا تھے۔اور سماجی حالات وواقعات نے اس کو کس طرح متاثر کیا۔یا قوم کی سیاسی وسماجی صورت حال پر اس کا کیا اثر ہوا۔ان امور کے حوالے سے مسلم زبانوں میں کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی۔شبلی نے شعرالعجم کی چوتھی جلد میں ان امور کا مفصل اور تازہ جواب مہیا کیا ہے۔'' (بحوالہ بازیافت لاہور،شبلی نمبر،ص:۱۶)

انہوں نے اپنی بمبئی آمد اور علامہ شبلی سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''اس دوران مشہور دانشور شبلی نعمانی سیر وسیاحت کے لئے بمبئی آئے۔ اتفاق سے اسی محلے میں ورود فرمایا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔میرا کمرہ ان کی اقامت گاہ سے متصل تھا۔چوں کہ میں نے اس بزرگوار کی شہرت پہلے سے سن رکھی تھی۔ لہٰذا چاہتا تھا کہ فوراً ان کی زیارت کا شرف حاصل کروں۔

میری نگاہ ایک ایسے وجود پر پڑی جو صاف ستھرے لباس اور جبہ وقبہ میں ملبوس تھا اور اس سے عظمت اور معرفت کے آثار نمایاں تھے۔انہوں نے بڑی محبت اور مہربانی سے مجھے اپنے نزدیک بٹھایا۔اور بہت دیر تک مجھ سے مختلف موضوعات پر شگفتہ روئی اور بشاشت کے ساتھ گفتگو کی۔اس زمانے کے ایران کے انقلابی، مگر ساتھ ساتھ پرآشوب حالات بھی زیر بحث آئے۔ وہ حکومت

ایران میں مشروطیت کے نتیجے میں پارلیامنٹ کے قیام پر بڑے خوش تھے۔ مگر آذربائیجان کے افسوس ناک احوال و واقعات پر دل گرفتہ بھی تھے۔ کہنے لگے میں اس وقت لکھنو میں تھا اور میں نے آذربائیجان میں ہونے والے مظالم کے خلاف ایک جلسہ برپا کر کے اپنی آواز بلند کی تھی اور اخبارات کو تار دئے تھے۔''

(بحوالہ بازیافت لاہور، شبلی نمبر، ص: ۱۳۰)

وہ علامہ شبلی سے اپنی ملاقاتوں کے بارہ میں لکھتے ہیں:

''ایک ہی دو ملاقاتوں میں میں اس نامور شخصیت کے بلند علمی مقام اور جامعیت کا شیفتہ ہو گیا اور خوش قسمتی سے ایسے اتفاقات ہوتے رہے کہ میں ان کی مصاحبت سے فیض یاب ہوتا رہا۔ بعد کی ایک ملاقات میں انہوں نے میرے کمرے میں آکر مجھے مشرف کیا اور فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے قیام بمبئی کے دوران، میں اور آپ دوپہر اور شام کا کھانا یکجا کھایا کریں۔ مجھے اس پیش کش کے قبول کرنے میں کسی قدر تامل تھا، مگر انہوں نے کمال بے تکلفی اور شرح صدر کے ساتھ جو ارباب دانش وکمال کا شیوہ ہوتا ہے فرمایا کہ چوں کہ میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ مانوس ہو جائیں، سو اگر آپ میری پیش کش کو قبول کرنے میں متامل ہیں تو ایسا کریں کہ جو کھانا آپ اپنے لئے تیار کرتے ہیں وہ یہاں لے آجایا کریں۔ میری غذا اس وقت بڑی سادہ اور ناچیز ہوتی تھی، جبکہ شبلی کے ہمراہ ایک ذاتی باورچی تھا جو ان کے لئے بہترین اور نہایت مرغوب اور مزے کے کھانے تیار کرتا تھا۔ چوں کہ میں اس استاد بزرگوار کے قیام سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہتا تھا، اس لئے میں نے ان کی تجویز سے اتفاق کیا۔ فراغت کے ان اوقات میں میں ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کرتا رہا۔ میں متعدد سوالات اور مسائل ان کے گوش گذار کرتا۔ وہ ان کے کامل اور شافی جواب اور حل مہیا کرتے۔ کبھی کبھی مجھے اپنے کمرۂ تحریر میں بھی لے جاتے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شبلی اپنے تمام سفر میں متحرک کتب خانہ اپنے

ساتھ رکھتے تھے۔اپنی منزل پر پہنچ کر سب سے پہلے اپنے تحریروانشا کے کمرے کو مرتب کرواتے، سفر میں ہوں یا حضر میں روزانہ چار گھنٹے تصنیف وتالیف میں صرف کرتے تھے۔فرماتے تھے کہ جب سے میں نے لکھنے کا آغاز کیا،اس معمول میں فرق نہیں آنے دیا۔ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا کہ روزانہ چار گھنٹے کام کر کے وہ کیسے اس قابل ہوئے کہ اتنی ڈھیر ساری تالیفات وجود میں آگئیں۔ فرمایا کسی بھی کام کی عمدہ پیش رفت کے لئے اصل چیز تسلسل اور انضباط ہے۔ زیادہ کام کرنا اور نڈھال ہو کر گھل جانا نہیں۔"

(بحوالہ بازیافت لاہور،شبلی نمبر،ص:۱۳-۱۴)

سید محمد تقی فخر داعی گیلانی مزید لکھتے ہیں۔

"میں خود جنگ عظیم اول سے کچھ عرصہ پہلے استاذ بزرگوار کی پرنور صحبت سے فیض اندوز رہا ہوں۔وہ سچائی اور لہجے کی صراحت سے متصف تھے۔اپنے غیر معمولی دانش وعلم کے باوجود غرور اور عالمانہ کبر کے قریب بھی نہ پھٹکے تھے۔حد درجہ متواضع ،منکسر اور بے تکلف تھے۔بڑے لطیف مزاج ،شوخ اور بذلہ سنج تھے۔ان کی روح کی نشاط چہرے بشرے کی جاذبیت،لطف صحبت،کشادہ روئی اور سب سے بڑھ کر لطف کلام ہی کی بدولت ہر شخص ان سے گفتگو کر کے محظوظ ہوتا تھا۔ان میں طبیعت کی رفعت اور خودداری اس درجے تھی کہ سلاطین وامرا کے انعامات و ہدایا کو قبول نہیں کرتے تھے۔ممالک اسلامی کی سیاحت میں تمام اخراجات خود برداشت کیے۔تین زبانوں میں شعر کہتے تھے مگر کسی کا قصیدہ نہیں کہا۔حیدرآباد کے ایک ثروت مند وزیر نے انہیں انعام واکرام سے نوازنا چاہا۔ایما یہ تھا کہ شبلی ان کا قصیدہ لکھیں۔فرمایا یہ میری عادت کے خلاف ہے۔ دوبارہ اظہار کیا گیا تو شبلی نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا میرے لئے ممکن نہیں کہ کسی کا قصیدہ لکھوں۔" (بازیافت لاہور،شبلی نمبر،ص:۱۴)

علامہ شبلی نعمانی کو کتابوں سے جو عشق تھا اور جس کا متعدد اہل علم نے اپنے اپنے انداز

سے ذکر کیا ہے جو ان کی شخصیت کا ایک بڑا اہم پہلو ہے۔اس کے اور بعض دوسرے قابل ذکر امور کے بارے میں سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے لکھا ہے کہ

کتاب خوانی اور لکھنے پڑھنے سے عشق تھا۔کتاب ان کی بہترین مصاحب تھی اور اس کی لذت کو ہر لذت پر ترجیح دیتے تھے۔ان کی تحریروں پر جو ایرادات اور اعتراضات ہوئے اور ہوتے رہے ان کا کبھی جواب نہ دیا۔بعض مواقع پر ان کے شاگرد اور عقیدت مندان کے حضور میں تشویش کا اظہار کرتے اور جواب لکھنے کو کہتے تو فرماتے جو وقت اس کام میں صرف کروں گا بہتر نہ ہوگا کہ اسے کسی نئے اور مفید علمی کام میں صرف کروں۔'' (بازیافت لاہور، شبلی نمبر، ص:۱۴)

فخر داعی ۱۹۲۵ء کے بعد ایران واپس گئے اور وزارت 'معارف وعلوم وفنون' سے وابستہ ہوئے۔ادارہ معارف خوزستان کے پہلے سربراہ ہونے کا شرف بھی انہیں حاصل ہوا۔علاوہ ازیں شبلی شناسی کے دیگر موضوعات پر متعدد علمی کام کرتے رہے۔انگریزی اور اردو کی کئی اور کتابوں کے انہوں نے ترجمے کیے۔دانیال ڈیفو، گستاولی بان، سرپرسی سائیکس کی کتابوں اور سر سید احمد خاں کی تفسیر کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا۔چنانچہ داعی اسلام اور فخر المحققین کے خطاب سے نوازے گئے۔ان کی خدمات کے اعتراف میں وزارت فرہنگ ایران نے 'نشان ایران' سے سرفراز کیا۔ ۱۹۶۴ء میں تہران میں انتقال کیا اور شہر قم میں تدفین ہوئی۔(مجلہ بازیافت لاہور، ص:۱۰-۱۱)

انہوں نے علامہ شبلی کی شعر العجم پانچوں جلدیں، سوانح مولانا روم، الکلام، علم الکلام، رسائل شبلی، الجزیہ، اور کتب خانہ اسکندریہ وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ کیا۔یہ تمام تراجم ایران کے بڑے اشاعتی اداروں اور مختلف شہروں سے شائع ہو کر مقبول ہوئے۔اوران کے دوسرے ایڈیشن بھی طبع ہوئے۔ایران کے بعض دوسرے اہل قلم نے علامہ شبلی کی ''سیرت النبی'' وغیرہ کا بھی ترجمہ کیا ہے، مگر ایک شبلی نواز اور شبلی شناس کی حیثیت سے جو عزت وشہرت سید محمد تقی فخر داعی گیلانی کو ملی وہ کسی اور کے نصیب میں نہیں آئی۔

وہ سوانح مولانا روم کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''شبلی نے کتاب مذکور میں گہرے مسائل ومباحث کو اس قدر سادہ اور روشن

اسلوب میں حل کر دیا ہے اور اس مہارت سے کہ گویا ہر بھید سے پردہ اٹھا دیا ہے۔
ان حقائق و معارف کو اس قدر شیریں، جالب اور جاذب اسلوب میں سمو دیا ہے
کہ میرا قلم اس کے بیان سے عاجز ہے۔ انہوں نے حیات رومی کا ایک ایسا
دروازہ کھول دیا اور گویا ایسے علمی رازوں کو فاش کر دیا جو اب تک ہماری نظروں
سے اوجھل تھے۔ اس خدمت پر شبلی درحقیقت ہمارے سپاس و قدردانی کے مستحق
ٹھہرتے ہیں۔'' (بازیافت ۲۷[شبلی نمبر] ڈاکٹر محمد کامران، اورینٹل کالج لاہور
جولائی-دسمبر ۲۰۱۵ء، ص:۱۶)

کتب خانہ اسکندریہ کے فارسی ترجمہ میں گیلانی نے طویل مقدمہ لکھا ہے:

''شبلی: ہندوستان کے قرن حاضر کے نامور ادیب ہیں جو عصری علوم
اجتماعی پر جامع تحریروں کے باعث تمام متمدن دنیا میں معروف ہیں۔ خاص
طور پر مصر اور بیروت کی مطبوعات میں ان کا بڑی شان سے ذکر ملتا ہے۔ تاریخی،
مذہبی اور ادبی مباحث پر مشتمل ان کی تصانیف سے استناد کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ
پروفیسر ایڈورڈ براؤن انگلستانی نے بھی متعدد مقامات پر ان کے کلمات سے
استشہاد کیا ہے۔

شبلی نے چند رسالے مختلف موضوعات پر بھی تصنیف کئے جو رسائل شبلی
کے نام سے موسوم ہیں۔ انہی میں ایک رسالہ 'کتب خانہ اسکندریہ' ہے جس میں
اسکندریہ کے قدیم کتب خانے کے جلائے جانے کا ذکر ہے اور جس کا ذمہ دار
یورپی اقوام میں اب تک مسلمانوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ شبلی اس موضوع کو زیر بحث
لائے ہیں اور عصر حاضر کے تحقیقی اصولوں کو بروئے کار لا کر عقلی و نقلی شواہد کی روشنی
میں اور خود یورپی لکھنے والوں کے اقوال کی مدد سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ عمل خود
نصاریٰ کے مذہبی و سیاسی پیشواؤں کا کیا دھرا ہے۔........ میں نے چند سال
قبل بڑی دقت نظر سے اسے اردو سے فارسی میں ڈھالا............ اور
اس کی تصحیح و تکمیل میں لگا رہا۔'' (بازیافت [۲۷] ''شبلی نمبر'' ڈاکٹر محمد کامران،

اورینٹل کالج لاہور جولائی۔دسمبر ۲۰۱۵ء،ص:۱۱)

سید محمد تقی فخر داعی گیلانی کی شبلی نوازی کی مفصل داستان راقم کی کتاب ''تصانیف شبلی کے تراجم'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

---

(۴۹)

پروفیسر محمد شفیع

[۱۸۸۳-۱۹۶۳ء]

پروفیسر محمد شفیع سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، بڑے ذی علم شخص تھے۔ قصور لاہور میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم.اے.کیا۔ دونوں میں اول آئے۔ میکلوڈ اسکالرشپ لے کر کیمبرج گئے، جہاں پروفیسر براؤن کی زیر نگرانی ابن عبدربہ کی کتاب العقد الفرید کی تحلیلی فہرست مرتب کی۔ وہاں سے واپس آکر پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ متعدد کتابیں اور تحقیقی مقالات ان کے قلم سے نکلے۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور کے مدیر بھی رہے۔ آخر میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور کی ترتیب وتدوین پر مامور ہوئے، جسے وہ آخری سانس تک پایہ تکمیل پہنچانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ ان کی زندگی میں محض پہلی جلد کے کچھ اجزا چھپے۔ البتہ ان کے مضامین کئی جلدوں میں لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔

''میخانہ'' شعرائے فارسی کا ایک انتہائی اہم تذکرہ ہے۔ اس کے مصنف ملا عبدالنبی ہیں، ایک عرصہ تک اہل علم میخانہ سے واقف نہ تھے۔ ابتدائی دور میں انگریز فہرست سازوں نے جو فہرستیں تیار کی ہیں اس میں بھی میخانہ کا نام تھا اور نہ وہ اس سے واقفیت رکھتے تھے۔ تاریخ محمد شاہی عرف نادر الزمانی میں اولاً چند سطور میں اس کا ذکر آیا، لیکن علامہ شبلی ''میخانہ'' سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ''شعر العجم'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور ''شعر العجم'' ہی کے واسطہ سے پروفیسر براؤن نے اس سے استفادہ کیا۔ مولوی محمد شفیع نے ''میخانہ'' ایڈٹ کیا تھا، جسے ۱۹۲۶ء میں عطر کپور اینڈ سنز

پبلشرز لاہور نے شائع کیا ہے۔انہوں نے اپنے مفصل مقدمہ میں لکھا ہے کہ

''خدا جزائے خیر دے مولانا شبلی مرحوم کو کہ انہوں نے غالباً سب سے پہلے شعرالعجم کی پہلی جلد میں میخانہ کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی، اور خواجہ حافظ اور طالب آملی کا ترجمہ لکھتے وقت اس سے مدد بھی لی۔شعرالعجم کے توسط سے ہی مرحوم پروفیسر براؤن نے میخانہ کے بعض مضامین پر اطلاع حاصل کی۔''

(میخانہ،ص:ب،عطر کپور اینڈ سنز پبلشرز لاہور،۱۹۲۶ء)

مولوی محمد شفیع ایم اے نے اس پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ لائق ذکر ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''معلوم نہیں ہوسکا کہ مولانا (شبلی) نے میخانہ کا مکمل نسخہ کہاں دیکھا تھا۔بعض عبارتیں جو انہوں نے نقل کی ہیں وہ آ و رٓ سے جو آگے مذکور ہیں مختلف ہیں۔اس سے گمان گذرتا ہے کہ کم سے کم ایک اور نسخہ میخانہ کا مکمل یا نامکمل ہندوستان میں موجود ہے۔''(ایضاً)

اس سے علامہ شبلی نعمانی کی متنوع اولیات اور فارسی ادبیات پر گہری نگاہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس طرح کی نہ جانے کتنی کوششیں اور کاوشیں علامہ شبلی کے وجود سے وابستہ ہیں۔تعجب ہوتا ہے کہ حافظ محمود شیرانی کو سنین کی غلطیاں تو نظر آئیں،لیکن اولیات شبلی ان کی نگاہ دیکھنے سے کیوں کر قاصر رہی۔؟

---

(۵۰)

مولانا عبدالسلام ندوی

[۱۸۸۳-۱۹۵۶ء]

مولانا عبدالسلام ندوی علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔انھوں نے علامہ ہی سے تحصیل علم کی تکمیل کی اور انہی سے تصنیف و تالیف کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔علامہ شبلی نعمانی نے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی کی طرح انھیں بھی ماہنامہ الندوہ کا نائب ایڈیٹر

مقرر کیا تھا اور انھوں نے اسے بڑی خوبی سے کئی برس نکالا۔ ماہنامہ الندوہ نے جن اہل قلم کو ملک میں بہ حیثیت اہل قلم روشناس کرایا ان میں ایک مولانا عبدالسلام ندوی کا نام بھی شامل ہے۔ وہ شعر وادب کے بڑے پارکھ اور بڑے اداشناس تھے۔ بلکہ علامہ شبلی کی ادبی وراثت ان کے حصہ میں کچھ زیادہ آئی تھی۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی مطالعاتی زندگی کے ذکر میں علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ میرے ہم وطن تھے اور میں ان کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا شبلی کو میں نے سب سے پہلے کان پور میں دیکھا اور ان کی مختصر تقریر سنی، لیکن اب تک ان کی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۱۱۷)

اسی زمانہ میں الفاروق شائع ہوئی اور ان کے بہنوئی مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کے پاس ریویو کے لئے آئی تو انہوں نے اس کا مطالعہ کیا اور اپنے تاثرات میں لکھا ہے کہ

> ''یہ پہلا دن تھا کہ دور جدید کی تصنیفات میں ہندوستان کے سب سے بڑے مورخ اور ادیب کی ایک ممتاز تصنیف میری نظر سے گذری۔ اسی زمانہ میں رسائل شبلی کا مجموعہ بھی شائع ہوا اور میں نے اس کو بھی بہ شوق پڑھا۔'' (ایضاً)

مولانا عبدالسلام ندوی ندوہ کے ممتاز فرزند تھے۔ علامہ شبلی ہی کی کشش سے ندوہ آئے اور ۱۹۱۰ء میں تحصیل علم سے فراغت پائی۔ (ایضاً)

انہوں نے اپنے مضمون میں اپنے معاصر مولانا عبدالماجد دریابادی سے بھی متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر فلسفہ اجتماع اور فلسفہ جذبات، تاریخ اخلاق یورپ وغیرہ کو انہوں نے باعتبار مضامین اور باعتبار طرز تحریر پسند کیا ہے اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ

> ''یہ کتابیں مادہ اور صورت دونوں کے لحاظ سے مولانا شبلی کی تصنیفات کا عکس ہیں۔ اس لئے ہم اور وہ دونوں ایک ہی چراغ کے پروانے ہیں۔'' (ایضاً ص: ۱۲۰)

مولانا عبدالسلام ندوی نے الہلال کلکتہ کے بعد بقیہ زندگی دارالمصنفین میں گذاری اور مدۃ العمر فکر شبلی کے شارح وترجمان بنے رہے۔ انہوں نے علامہ کی زندگی ہی میں شعر العجم پر مفصل تنقید لکھی تھی، جسے علامہ نے الندوہ میں شائع کیا۔ ایک مبسوط مضمون ان کے اسلوب نگارش پر لکھا

ہے جوادیب کے شبلی نمبر میں شامل ہے۔ حیات شبلی کا آغاز انہیں کے قلم سے ہوا تھا مگر وہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچا سکے جسے بالآخر جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے قلم بند کیا۔

علامہ شبلی کی وفات ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کے بعد ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا آغاز ہوا تو مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی کی تکمیل میں مصروف ہوئے اور مولانا عبدالسلام ندوی نے اسوۂ صحابہ وصحابیات کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور تین جلدوں میں اسوۂ صحابہؓ وصحابیات لکھی جو نہ صرف دارالمصنفین کی بہت اہم اور منفرد کتابیں ہیں بلکہ اردو زبان کی بھی شاہکار کتابیں ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک بڑی حیثیت مترجم کی ہے۔ انھوں نے متعدد اہم کتابوں کے ترجمے کئے ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی تاریخ فقہ اسلامی بھی ہے جو علامہ محمد خضر مرحوم کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے دارالمصنفین سے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے پیش نظر اسلامی علوم وفنون کی تدوین کا ایک وسیع منصوبہ بھی تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان میں جدید طرز پر علوم اسلامیہ کی تاریخ کا خاکہ سب سے پہلے علامہ شبلی مرحوم نے قائم کیا اور علم کلام کی تاریخ میں علم الکلام کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی اور چار پانچ جلدوں میں فارسی شاعری کی ایک مبسوط تاریخ مدون کی۔ اس کے بعد اگرچہ سیرت نبویؐ کی تالیف نے ان کو اس سلسلہ کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا تاہم وہ علوم اسلامیہ کی تاریخ کی تکمیل کا بار بار ذکر کرتے رہتے تھے اور اس کو اردو زبان کے لئے ایک جدید تاریخی موضوع خیال کرتے تھے، اگر وہ اپنی زندگی میں سیرت نبویؐ کی تکمیل سے فارغ ہو سکتے تو بہت ممکن تھا کہ اس دلچسپ موضوع کی طرف دوبارہ متوجہ ہوتے لیکن افسوس ہے کہ زندگی نے ان کو سیرت نبویؐ کے مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا، پھر اور سلسلوں کی تکمیل تو ایک عالم خیال کی چیز تھی تاہم جب ان کی یادگار میں دارالمصنفین قائم کیا گیا تو اس کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ یہ انتساب تیمنا وتبرکا نہ ہو بلکہ اس کو حقیقی طور پر ان کے نام کے زندہ رکھنے کا ذریعہ بنایا جائے، اس لئے ابتدا ہی سے یہ لحاظ رکھا

گیا کہ سیرت نبویؐ کے علاوہ ان کے دماغ نے اور جن تاریخی سلسلوں کا خاکہ قائم کیا تھا ان کی تکمیل کی جائے، چنانچہ آج تک دارالمصنفین سے جو تاریخی اور مذہبی کتابیں شائع ہوئیں ہیں ان میں تقریباً اکثر ان ہی سلسلوں سے تعلق رکھتی ہیں اور تاریخ فقہ اسلامی بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔''

(تاریخ فقہ اسلامی، دیباچہ، ص:۱۲-۱۳)

مولانا عبدالسلام ندوی نے علامہ شبلی کے خطبات کے مجموعہ پر جو پہلی بار دارالمصنفین سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا، دیباچہ لکھا ہے اور علامہ شبلی کی خطابت اور خطیبانہ شان اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی نعمانی جن اوصاف وخصوصیات کا مجموعہ تھے ان میں ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ ان میں زور تحریر کے ساتھ قوت تقریر کا خداداد ملکہ بھی پایا جاتا تھا۔

خوش قسمتی سے تقریر وزور بیان کے لئے جس قدر لوازم واوصاف ضروری ہیں وہ سب ان میں قدرتی طور پر موجود تھے۔ قد بلند وبالا تھا، اس لئے جب اسٹیج پر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو ہر شخص کے سامنے ظاہری حیثیت سے بھی ایک نمایاں شخصیت آجاتی تھی۔ آواز بلند اور گونجنے والی تھی اور اول سے آخر تک یکساں حالت میں قائم رہتی تھی، مزاج میں نیابت اشتغال اور جوش وخروش پایا جاتا تھا اس لئے ان کی تقریروں میں قدرتی طور پر زور اور جوش پیدا ہو جاتا تھا۔'' (خطبات شبلی، ص:۵-۶، طبع جدید ۲۰۰۸ء)

علامہ شبلی کی تقریروں کے موضوعات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کی تقریروں کے موضوع یا تو خالص علمی ہوتے تھے مثلاً اعجاز القرآن، علم الکلام اور فارسی شاعری کی تاریخ یا مذہبی مثلاً ختم نبوت اور تکمیل دین یا قومی جس میں زیادہ تر دین ودنیا کی آمیزش یا علوم قدیمہ وجدیدہ یا معقول ومنقول کی تطبیق پر زیادہ زور دیتے تھے اور تمام موضوع قرآن وحدیث اور تاریخ کے

ٹھوس معلومات سے لبریز ہوتے تھے۔'' (ایضاً،ص:٦)

مولانا عبدالسلام ندوی اپنے مشہور سلسلہ اسوۂ صحابہؓ کا سہرا اپنے استاذ علامہ شبلی کے سر باندھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ اس دور تجدید واصلاح میں ہندوستان کے مجدد اعظم مولانا شبلی مرحوم کو جب مسلمانوں کی ترقی واصلاح کا خیال پیدا ہوا تو انھوں نے اسی تریاق اکبر کو اس درد کا علاج قرار دیا اور ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ صحابۂ کرام کے فضائل ومناقب اس ترتیب وجامعیت کے ساتھ لکھے جائیں کہ دنیا کے سامنے معاشرت واخلاق اور عبادات ومعاملات کا بہترین عملی مجموعہ آجائے۔''

(اسوۂ صحابہؓ،ج ا،ص:۵-٦)

اسوۂ صحابہ کو وہ علامہ شبلی کے ذہنی خاکہ پر مشتمل بتاتے ہیں:

''مولانائے مرحوم نے اس کتاب کا جو ذہنی خاکہ قائم کیا تھا اسی کے مطابق کتاب کی ترتیب وتدوین کا سلسلہ جاری ہوا۔'' (ایضاً،ص:۷)

جس خاکہ کا ذکر مولانا عبدالسلام ندوی نے کیا ہے وہ علامہ شبلی کی تحریروں میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ مولانا عبدالسلام ندوی کی روایت ہے۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ حدیث شبلی کی روایت میں مرویات سلیمانی تو کثرت نقل ہوئیں مگر مرویات عبدالسلام کی سرے سے تدوین ہی نہ ہوسکی۔

مولانا عبدالسلام ندوی اردو کے ایک بڑے ادیب ونقاد تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تلامذہ شبلی میں شعروادب کے وہ سب سے بڑے اداشناس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرالہند کی تصنیف کا کام انھیں سونپا گیا، چنانچہ دو جلدوں میں انھوں نے اردو شعروادب کی بڑی عمدہ تنقیدی تاریخ لکھی، اس کے دیباچے میں انھوں نے موضوع کی وضاحت کے ساتھ اس پر اجمالی تبصرہ بھی کیا ہے۔ یہاں یہ بات عرض کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ انھوں نے بھی اپنے استاذ علامہ شبلی کو شعرالہند میں جگہ نہیں دی ہے۔ البتہ اس کے دیباچہ میں فن تنقید کے ضمن میں سب سے آخر میں موازنہ انیس ودبیر کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''سب سے اخیر میں مولانا شبلی مرحوم نے موازنہ انیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں پر

اصولی حیثیت سے نہایت تفصیل کے ساتھ تنقید کی، جو اگرچہ صرف شاعری کی ایک ہی نوع یعنی مرثیہ تک محدود ہے، لیکن اس میں مرثیہ کے تعلق سے مختلف اصناف مثلاً رزمیہ، مناظر قدرت، واقعاتی اور جذباتی شاعری کے متعلق بھی نہایت عمدہ تنقیدی اصول مذکور ہیں۔" (شعرالہند، ج ۲، ص: ۱۰)

اردو میں تاریخی سوانح عمریوں کا آغاز علامہ شبلی کی کتابوں المامون، الفاروق سے ہوا۔ پھر اس کا عام رواج ہوگیا۔ چنانچہ متعدد سوانح عمریاں اہل قلم نے سپرد قلم کیں۔ اس سلسلہ کو مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی "امام رازی" لکھ کر ترقی دی اور بلاشبہ یہ امام رازی کی نہایت مستند اور بڑی محققانہ کتاب ہے اور تقریباً الغزالی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

"جس طرح مولانا شبلی مرحوم نے الغزالی میں فلسفہ وعلم کلام کے متعلق امام غزالی کے خیالات ونظریات کی تشریح کی ہے اسی طرح امام رازی کے خیالات و نظریات کی تشریح کی بھی ضرورت تھی اور یہ کتاب اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔" (امام رازی، دیباچہ، ص: ۱-۲، اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء)

مولانا عبدالسلام ندوی کی دوسری اہم سوانحی کتاب "سیرت عمر بن عبدالعزیز" ہے۔ گویہ علامہ شبلی ہی کے انداز واسلوب میں لکھی گئی ہے، مگر علامہ شبلی کے سلسلہ کی نہیں ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز اگرچہ بنوامیہ میں سے تھے، مگر علامہ شبلی نے بنوامیہ میں ولید بن عبدالملک کا انتخاب کیا تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی علامہ شبلی کے سلسلہ نامور فرماں روایان اسلام کے انتخاب کو نقل کرکے لکھتے ہیں:

"اسلام کی تاریخ تمام دنیا کی تاریخوں سے مختلف ہے۔ اس کا روشن ترین زمانہ صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوا اور خلافت راشدہ تک پہونچ کر ختم ہوگیا، اس لئے خلفائے اسلام کا قابل فخر کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے دنیا کو اس نقطۂ نورانی سے آگے بڑھایا بلکہ ان کا حقیقی شرف یہ ہے کہ انھوں نے زمانہ کو اس قدر پیچھے ہٹایا کہ وہ عہد صحابہ سے جاکر مل گیا۔

خلافت راشدہ کے بعد بنوامیہ کا دور حکومت شروع ہوا جس میں بڑے
بڑے فرماں روا گذرے، عبدالملک نے ۲۱/ سال حکومت کی اور سلطنت کی بنیاد کو
مستحکم کردیا۔ ولید نے اس کثرت سے فتوحات کیں اور اس کثرت سے عمارتیں
تعمیر کرائیں کہ تمام دنیا اسلامی تمدن کا تماشہ گاہ بن گئی۔ لیکن ان میں صرف
حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک ایسے شخص ہیں جنھوں نے زمانے کی باگ پھیر کر
اس کو عہد صحابہ سے ملا دیا۔'' (سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص:۲)

یہ دراصل علامہ شبلی کے سلسلہ نامور فرماں روایان اسلام پر ایک تنقید ہے، مگر جس ادب و احترام سے اور جس انداز سے تنقید کی گئی ہے، وہ ہماری تصنیفی تہذیب کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اپنی بات کس طرح کہی جاتی ہے جس سے دوسرے کی تردید ہو جائے اور احترام پر بھی حرف واثر نہ آئے۔ یہ اس کا بہترین اسلوب ہے۔

علامہ شبلی کی جامعیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ماہر تعلیم بھی تھے۔ ان کے اس پہلو پر نسبتاً کم کام ہوا۔ ڈاکٹر عبیداللہ فراہی نے ایک کتاب اسی عنوان سے لکھی ہے، مگر وہ اختلافات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے اور مختصر بھی ہے۔ موضوع کا احاطہ نہیں ہوسکا ہے۔ بعض مقامات پر ان کے تلامذہ نے اس کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے ایک فرانسیسی کتاب کے عربی ترجمہ ''التربیۃ الاستقلالیہ'' کا اردو ترجمہ کیا، جسے ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔ اس کے مفصل مقدمہ میں مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے استاد کی ندوہ اور بعض دوسرے اداروں کی بیشتر تعلیمی خدمات کا تذکرہ کردیا ہے۔ طوالت کے باوجود اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ ندوہ کے بارہ میں ایک رائے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''بے شبہ ابتدا میں ندوۃ العلما کی حالت یہی تھی، لیکن اس کے ارکان میں ایک
فرد کامل (علامہ شبلی مرحوم) ایسا بھی تھا جو اصلاح کے شور و غل سے زیادہ اصلاح پر
عمل کرنے کے لئے شور و غل کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ندوۃ العلماء کے ایک
برگزیدہ اور اپنے ہم خیال رکن کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان سے اس کی تصدیق
ہوسکتی ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ندوہ کی حالت دیکھ کر ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ بوسیدہ ارکانوں کا تو یہ حال ہے کہ اس دفعہ بھی شرح عقائد نسفی، ہدیہ سعیدیہ، نورالانوار درس میں تجویز کی گئی ہے۔ ایک ہمارے روشن خیال شروانی ہیں جن کو میں انا امام کہتا ہوں ان کا یہ حال ہے کہ انگریزی کے نام سے ان کو لرزہ آتا ہے۔''

(مکاتیب شبلی جلد اول، ص:۱۳۲)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''یہ ارادہ ہوتا ہے کہ دو مہینہ کی رخصت لے کر لکھنؤ آؤں اور کم از کم دو چیزوں کو درست اور جاری کرادوں، نصاب اور رسالہ ماہانہ۔''

(مکاتیب شبلی ج ا، ص:۱۵۱)

ایک اور خط میں نہایت تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:

''نصاب تعلیم پر میں برسوں غور کر چکا ہوں، مصر کی اصلاحات کو دیکھتا رہتا ہوں، وہاں سے جدید کتابیں جواب تک کسی کے پاس نہیں پہونچیں ان کو منگوایا ہے۔'' (ایضاً، ص:۵۳)

لیکن اس شور وغل اور اس خط وکتابت کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا تو انہوں نے حیدرآباد کی گراں قیمت ملازمت کو خیر باد کہہ کے خود ندوۃ العلماء میں بحیثیت معتمد تعلیم کے مستقلاً قیام اختیار کیا اور سب سے پہلے جس چیز کی اصلاح کی طرف توجہ کی وہ یہی نصاب تعلیم تھا۔ چنانچہ الندوہ کے ابتدائی مضامین سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

علامہ مرحوم نے جن اصول پر قدیم نصاب تعلیم کو بدلنا چاہا۔ وہ وہی ہیں جن کو علامہ ابن خلدونؒ نے مقدمہ تاریخ میں قائم کیا تھا چنانچہ الندوہ (جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ جلد نمبر ۲) کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''ہم اس دعوے کے ثابت کرنے کے لئے اشارات وقرائن پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ قطعی طریقہ سے ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ نصاب تعلیم نہایت

ناقص اور ابتر ہے۔ سب سے پہلے ہم کو چند مقدمات اصول موضوعہ کے طور پر ذہن نشین کر لینے چاہئیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ نفس فن حاصل کیا جائے۔

۲۔ ہر فن کے حاصل کرنے کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ اس کے مسائل کو منفرداً اور بہ استقلال حاصل کیا جائے تا کہ اس فن کی طرف کافی توجہ ہو سکے اگر چند فنوں کے مسائل کو مخلوط کر کے حاصل کیا جائے گا تو کسی فن کی اچھی طرح تکمیل نہ ہوگی۔

۳۔ متعدد علوم وفنون کی تحصیل میں الاقدم فالاقدم کا خیال ضرور ہے، یعنی یہ کہ جو فنون مقصود بالذات ہیں انکے حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کیا جائے جو مقصود الغرض ہیں ان میں کم۔ اسی طرح علوم مقصود بالذات میں بھی بلحاظ اہمیت کے فرق مراتب کرنا چاہئے یعنی جو علوم زیادہ مہتم بالشان اور ضروری ہیں وہ زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔

۴۔ ہر علم کی تحصیل میں سب سے مقدم یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس فن کی جو غایت ہے وہ حاصل ہو۔

ان اصول کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے اس مضمون میں نصاب قدیم کے نقائص دکھائے اور ایک نصاب تعلیم جاری کیا جو انہی اصول کے مطابق مرتب کیا گیا تھا۔ آج ندوۃ العلما میں بہ تغیر اصلاح یہی نصاب تعلیم جاری ہے جو عمدہ نتائج پیدا کر رہا ہے۔

علامہ مرحوم نے اخیر میں خاص ایک فن کی تکمیل کے لئے ایک مستقل درجہ تکمیل قائم کیا جو انگریزی کے ایم اے کے برابر ہے۔

انگریزی زبان کی تعلیم لازمی کر دی، اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ندوہ کے طلباء میں متعدد اشخاص ہیں جو جدید علوم وفنون میں کافی مہارت رکھتے ہیں اور عام ضروریات کے لئے تو تقریباً تمام طلباء انگریزی جانتے ہیں۔ بایں ہمہ قدیم خیال کے علماء کی مخالفت، سرمایہ کی قلت اور دوسرے عوائق وموانع کی وجہ سے

مولانا مرحوم قدیم تعلیم میں جس وسیع پیمانے پر انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے ان کے حوصلہ وہمت کے موافق ان کو ندوہ میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کو ایک اور موقع ہاتھ آ گیا جس میں انہوں نے اس طریقۂ تعلیم و نصاب تعلیم میں اپنے حوصلہ کے مطابق تغیرات کئے یعنی حیدرآباد کے دارالعلوم میں پہلے پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کا نصاب درس جاری تھا جو قدیم عربی مدارس کے نصاب درس سے بھی زیادہ لغو و بے کار تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے خود پنجاب یونیورسٹی نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ وہ دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے امتحانات میں شریک نہیں کر سکتی۔ اس لئے اب یہ خیال پیدا ہوا کہ خود دارالعلوم کا ایک الگ نصاب تعلیم ریاست کی ضروریات کے مطابق تیار کیا جائے۔ چنانچہ نواب عمادالملک بہادر بلگرامی نے جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے ایک سرکاری مراسلہ کے ذریعہ سے مولانائے مرحوم سے اس معاملہ میں اعانت طلب کی اور لکھا کہ ترمیم نصاب میں چند ابواب پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

۱۔ اصلاح نصاب موجودہ پنجاب یونیورسٹی بہ لحاظ مقتضائے وقت و زمانہ و ضروریات خدمات حکومتی۔

۲۔ تکمیل تحصیل علوم مشرقیہ

چنانچہ اس مراسلہ کی بناء پر مولانائے مرحوم جون ۱۹۰۸ء میں خود حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں چند روز رہ کر ایک نصاب تیار کیا جس میں خصوصیات ذیل کو پیش نظر رکھا۔

۱۔ صرف وہی کتابیں درس میں رکھیں جن میں تمام مسائل نہایت سادہ صاف اور واضح طریقے سے بیان کئے گئے تھے۔

۲۔ اور جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط نہیں کئے گئے تھے۔

۳۔ قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ زیادہ وسیع نہیں کیا۔

۴۔ ادب کی کتابیں بہت بڑھا دیں۔

۵۔عربی تحریر وانشا پردازی کے لئے خاص گھنٹے مقرر کیے۔

۶۔عقائد وکلام میں متعدد اور بلند پایہ کتابیں نصاب میں رکھیں۔

۷۔تاریخ اسلام اور عام تاریخ کی کتابیں بھی داخل نصاب کیں۔

۸۔علوم جدیدہ کی بعض کتابیں جو عربی میں ترجمہ ہوگئیں تھیں نصاب میں شامل کیں۔

۹۔انگریزی زبان بطور سیکنڈ لینگویج کے لازمی قرار دی۔

۱۰۔مدت تعلیم جو پہلے انیس سال تھی اور کس گھٹا کر چودہ [۱۴] سال کر دیا۔

ندوۃ العلماء اور حیدرآباد کے علاوہ اور مدارس میں بھی نصاب تعلیم کی تبدیلی اور طلباء میں علمی زندگی پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔اور گو ان میں ندوہ کے نصاب تعلیم کی پابندی نہیں کی گئی تاہم ہر ایک نے اپنے اپنے مذاق ومصالح کے موافق قدیم نصاب میں ترمیم واضافہ کیا اور آج علماء وطلباء میں جو ایک عام حرکت، ایک عام روشن خیالی اور آزادی محسوس ہو رہی ہے وہ اسی تعلیمی انقلاب کا نتیجہ ہے۔(حوالہ: التربیۃ الاستقلالیہ، ص: ۵۰-۵۳)

علامہ شبلی کی یہی وہ فکر، مساعی جمیلہ اور علمی وعملی جدوجہد تھی جس کی بدولت لکھنو سے حیدرآباد تک اصلاح نصاب کا غلغلہ بلند ہوا۔واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ پر اس کے بڑے گہرے اور دورس اثرات مرتب ہوئے۔

---

(۵۱)

مولانا سید سلیمان ندوی

[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء]

علامہ سید سلیمان ندوی علامہ شبلی کے سب سے لائق شاگرد اور جانشین تھے۔تصنیف و تالیف کے لئے علامہ نے ان کی تربیت کی تھی۔خاندانی طبابت کے پیشے سے بچا کر علمی دنیا کا

سرتاج بنایا اور ندوہ کے جلسہ میں جب ہندوستان اور مصر کے عمائدین موجود تھے، اپنا عمامہ سر سے اتار کران کے سر پر رکھ دیا۔ یہ اسی دن طے ہو گیا کہ آئندہ گلشن شبلی کے مالی وہی ہوں گے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ شبلی کی جانکنی میں ان کے سراہنے جب آنسو بہار ہے تھے، استاذ نے اشارے سے تمام کام چھوڑ کر سیرت کی تکمیل کے لئے کہا اور پھر خود ''سیرت، سیرت'' کہتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ نور اللہ مرقدہ

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی محسن کتابوں پر جو مضمون لکھا ہے، اس میں جگہ جگہ مولانا شبلی کا ذکر کیا ہے۔ ایک موقع پر ابن خلکان کے مطالعہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی نے ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد کے سفر سے واپس آکر مجھے اس کے انگریزی یا فرنچ مترجم کا جب ایک تبصرہ دیا اور تعریف فرمائی کہ دیکھو یورپین کس وقعت سے کسی کتاب کو دیکھتے ہیں تو میرے دل میں ایک ٹھیس لگی اور میں نے ابن خلکان پر ایک تبصرہ لکھ کر پیش کیا جو الندوہ میں چھپا۔''

(مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص:۱۰)

سید صاحب نے اپنے کلامی ذوق کے بارے میں لکھا ہے کہ علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی تصنیفات پڑھیں۔ ان کی حوالہ دی ہوئی کتابیں دیکھیں۔ سید صاحب اپنے قرآنی علوم و معارف سے دلچسپی کے ذکر میں لکھا ہے کہ

> ''سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا۔ مولانا حمید الدین مرحوم کی دلچسپ و مفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا گیا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرت نبویؐ کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیث نبویؐ اس کے نقش و نگار ہیں۔''

(مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص:۱۲)

استاذ کی خواہش کے مطابق سید صاحب نے تمام کام چھوڑ دیئے، حتیٰ کہ دکن کالج پونہ کی پروفیسری چھوڑ دی اور آستانہ شبلی پر آکر بیٹھ گئے اور سیرت کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا اور پورا ہی کر کے دم لیا۔ سیرت کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی، اب تک کتاب کے بے شمار ایڈیشن

ملک و بیرون ملک سے شائع ہو چکے ہیں۔اس میں تین دیباچے اور ایک مقدمہ شامل ہے۔مقدمہ علامہ شبلی کے قلم سے ہے اور اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔یہی وجہ ہے کہ دہئی سے اس کا عربی ترجمہ شائع ہو کر عربوں میں مقبول ہوا۔دو دیباچے مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہیں۔پہلا دیباچہ طبع اول پر لکھا گیا تھا۔اس میں سیرۃ النبیؐ کی عظمت، علامہ شبلی کی وصیت کے مطابق تدوین و تکمیل اور اشاعت کی تفصیل ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''سیرت نبویؐ جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے آج ۷/سال کے بعد اس کی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ میں جاتی ہے، میں اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہوں کہ استاذ مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں جو فرض میرے سپرد کیا تھا الحمد للہ کہ اس کے ایک حصہ سے آج سبکدوش ہوتا ہوں۔'' (سیرۃ النبی، ج ا، ص: ۷، اعظم گڑھ طبع جدید، ۲۰۰۳ء)

علامہ شبلی کو اس کی اشاعت کی کتنی حسرت تھی اس کا اندازہ ان کے ایک خط کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا، جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔'' اس حسرت پر شاگرد کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''اس مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ حسرت ناک منظر بھی نگاہوں کے سامنے ہے کہ مصنف اپنی چار سال کی جاں کاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کر سکا اور حسن عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر اس کے ہاتھ آئے تھے ان کو آستانۂ نبوتؐ وہ خود نہ چڑھا سکا۔'' (ص: ۷)

اس کے بعد سید صاحب نے سیرۃ النبیؐ کی تدوین کے لئے علامہ شبلی کی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔حتمی ارادے کے بعد پچاس ہزار کی بڑی رقم کا اعلان اور نواب بھوپال بیگم سلطان جہاں [۱۸۵۴ء-۱۹۳۰ء] کی اعانت و ذمہ داری کی تفصیل سپرد قلم کی ہے۔اور لکھا ہے کہ

> ''فرماں روا خواتین اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دیئے ہیں آئندہ مورخ غالباً اس کارنامے کو ان میں سب سے بڑا قرار دے گا کہ اس کا تعلق اس

ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے بڑی ہستی ہے۔" (ص:۷)

علامہ شبلی کی وفات کے بعد بھی بیگم سلطان جہاں نے اپنی زرافشانی کا سلسلہ فیض جاری رکھا۔ سید صاحب نے اس کا بڑے والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ پھر سیرت نبویؐ کے مسودہ شبلی کی ترتیب وتدوین کے مسائل کا ذکر ہے اور انھوں نے اس میں جو اصلاحات و تصحیحات کی ہیں ان کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اور اس احتیاط کے ساتھ کہ اگر میں کہیں ایک حرف بدلتا تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا۔

چار برس بعد اس کا دوسرا اڈیشن کتابی سائز میں شائع ہوا اور اس میں جو کتابت وغیرہ کے اغلاط رہ گئے تھے انھیں درست کیا گیا۔ اس پر سید صاحب نے ایک صفحہ کا دیباچہ لکھا ہے۔ اس کا آغاز ان لفظوں میں ہوا ہے:

> "سیرۃ نبویؐ جلد اول طبع اول کو شائع ہوئے آج چار برس ہو گئے، اس اثنا میں خداوند تبارک وتعالی نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ خاکساران دارالمصنفین کے لئے فخر ونازش کا سرمایہ ہے، نہ صرف یہ کہ عام قدردانوں نے اس کو جان ودل سے خریدا اور امراء ووالیان ممالک نے اس کی خدمت کو سعادت دارین سمجھا بلکہ خواص اور علماء کے طبقہ نے بھی اس کی قدرشناسی کی۔" (ص:٦)

یہی نہیں یہ دوسرا اڈیشن اس لحاظ سے بھی بے حد اہم ہے کہ مختلف طبقات کے اہل علم نے اسے میزان نقد میں جانچا اور پرکھا۔ سید صاحب نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

> "ہندوستان میں اہل علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے فن کی میزان نقد میں سیرت کے مضامین وتحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیات قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظر ثانی کی، اہل تاریخ وسیر نے واقعات کی جانچ پرتال کی اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص ومحبت سے انھوں نے اپنے نتائج افکار

سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا۔'' (ص:۶)

سید صاحب کے قلم سے تیسرا دیباچہ طبع چہارم پر لکھا گیا ہے۔ پہلے سیرت کی مقبولیت پر مصنف اور جامع کی طرف سے اللہ کا شکر ادا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سیرت میں اغلاط کی تصحیح اور مسودہ سے مبیضہ اور دوسری طباعتوں کے اغلاط کی درستگی وغیرہ کی تفصیل قلم بند کی گئی ہے۔ ہندسوں کی بعض غلطیاں راہ پا گئی تھیں، انھیں درست کیا گیا ہے۔ اس طرح علامہ شبلی کے پیش نظر جو قلمی نسخے تھے اور اب سید صاحب کے پاس ان کے مطبوعہ نسخے آ گئے تو ان سے بھرپور استفادہ کر کے ان کے حوالہ دیئے گئے ہیں اور ضروری اضافات بھی کئے گئے ہیں۔ اس ایڈیشن میں جامع سیرت نے جو کچھ کیا ہے اسے ۸/شقوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ان مقدمات سے جو سب سے بڑی بات سامنے آئی ہے، وہ سید صاحب کی اپنے استاذ سے بے پناہ محبت اور خود ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت بے پایاں ظاہر ہوتی ہے۔

۱۹۲۰ء میں سیرۃ النبیؐ کی دوسری جلد شائع ہوئی۔ اس پر سید صاحب کا دیباچہ ہے۔ اس دیباچہ میں پہلی جلد کی مقبولیت کا ذکر ہے۔ پھر جنگ عظیم سے پیدا ہونے والے نقصانات دکھائے ہیں کہ کاغذ وطباعت کی گرانی کی وجہ سے سیرت نبویؐ تاخیر سے شائع ہو رہی ہے۔ پھر اس جلد کے مشمولات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''پہلی جلد نبوت کے پر آشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی اور دوسری جلد نبوت کی سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے، نبوت کی بست وسہ سالہ زندگی میں پہلی جلد بیس سال کے کارناموں کا مجموعہ تھی اور یہ جلد بقیہ آخری تین سال کے واقعات کا ذخیرہ ہے اور اس کے بعد اخلاق وشمائل شریفہ اور ازواج مطہرات واولاد کرام کا تذکرہ ہے۔'' (جلد دوم، ص:۹)

اس کے بعد مسودۂ سیرت اور اس کے ناتمام حصوں کی تکمیل کا ذکر ہے۔ سید صاحب جن ابواب میں اضافہ کرنا چاہتے تھے، علامہ شبلی کے قلم سے اس کے متعلق یادداشت ملی تو اس کے مطابق اضافے کئے۔ اسی طرح اخلاق کے باب میں بھی بہت سے عنوانات سادہ تھے اور سید صاحب نے انھیں لکھا۔ استاذ سے اپنی تحریر کو ملانے سے بچانے کے لئے اضافہ اور تکملہ اور حواشی

کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر دی گئی ہیں۔ (ایضاً،ص:۱۰)

سیرت کی جلد سوم سید صاحب کے قلم سے ہے، اس میں علامہ شبلی کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ جلد چہارم جو منصب نبوت پر ہے علامہ شبلی کا ایک جگہ ذکر ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع میں کیا تھا اور مذکورہ بالا مباحث میں سے عرب جاہلیت کے مذہبی اخلاقی حالات کے پچیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی۔ یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں، مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ وترمیم کی ضرورت ہوئی ہے، اس لئے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں۔''

(سیرۃ النبی، ج ۴، ص:۱۴، اعظم گڑھ طبع جدید ۲۰۰۳ء)

علامہ شبلی کے شاگردوں کی تعداد کم نہیں، مگر ان میں کوئی سید سلیمان نہیں ہوا۔ وہ اپنے استاذ کے ذکر کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے۔ سیرۃ النبیؐ جلد پنجم شائع ہوئی تو اس کے دیباچہ میں سیرت کی ترتیب وتدوین کے بارہ میں لکھا کہ

''اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے، جس کا خیال حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانی کو تھا۔ ان زبانی بیانوں اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے۔'' (ص:۳)

اس کے بعد ان کے دو مکاتیب کے اقتباسات دلائل میں نقل کئے ہیں۔ پھر سلسلہ سیرت کے حسن قبول کا ذکر کیا ہے اور امرائے اسلام کے عنوان سے ریاست بھوپال کے تعاون کا ذکر ہے اور اس بات کا بھی ذکر ہے کہ بیگم سلطان جہاں کے جانشین نواب حمید اللہ خاں نے اسی طرح قدردانی فرمائی ہے، جس طرح سرکار عالیہ نے کی تھی۔ علامہ شبلی نے بیگم سلطان جہاں کی فراخدلی اور امداد سیرت کے لئے ایک قطعہ کیا تھا۔ وہ قطعہ بھی سید صاحب نے نقل کیا ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی

تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے

علامہ شبلی نے جب وفات پائی تو بیگم صاحب نے بڑے درد لہجہ میں کہا تھا کہ ''فقیر بے نوا تو چل بسا، اب سلطان کی باری ہے۔'' (ص:۵)

آخر میں سید صاحب جن کی عمر اس وقت پچاس سال ہو چکی تھی اس بات کا ذکر کیا ہے، اور اسی سلسلہ کی تکمیل میں خاک ہو جانے کی تمنا کی ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے۔۵۸۰ صفحات پر مشتمل یہ جلد سید صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اپنے موضوع پر یہ بے حد اہم کتاب ہے۔۱۹۱۴ء میں سید صاحب اپنے استاذ کی خواہش کے احترام میں اس عظیم الشان کام کی تکمیل میں مصروف ہوئے اور زندگی کا بڑا حصہ اسی سیرت نبویؐ اور استاذ کی خواہش کی تکمیل میں لگا دیا۔ اس حصہ کے دیباچہ کے اخیر میں وہ لکھتے ہیں:

> ''سلسلہ سیرت کے بانی حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے، میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزا پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔'' (رحمہ اللہ تعالی)

(سیرۃ النبیؐ، ج ۶، ص:۴۰، اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۰۳ء)

سیرۃ النبیؐ کی ساتویں جلد مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات کے بعد ۱۹۸۰ء میں ہندو پاک سے شائع ہوئی۔

۱۹۳۰ء میں سید صاحب نے یورپ کا سفر کیا۔ وہاں سے بزرگوں، دوستوں اور احباب کے نام جو خطوط لکھے ان کا مجموعہ ''برید فرنگ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کا دیباچہ انھوں نے ''خطوط کا پس منظر'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں بھی علامہ شبلی کا ایک مقام پر ذکر آیا ہے۔ ہندوستان کی سیاسیات میں علامہ شبلی کے ایک طویل مضمون نے انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس کے

بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''ہندو بنگالیوں کے پر زور ایجی ٹیشن سے مجبور ہو کر انگریزوں نے ۱۹۱۰ء میں بنگال کی تقسیم کو منسوخ کر دیا۔ مسلمانوں کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ یہی زمانہ تھا جب نواب وقار الملک نے انگریزوں کی حکومت کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا اور مولانا شبلی مرحوم نے ''پولیٹکل کروٹ'' کا سلسلہ شروع کیا، جس نے مسلمانوں کے سیاسی رخ کو سرکار پرستی کی طرف سے پھیر کر صحیح سیاست کی طرف کر دیا۔''

(برید فرنگ، ص:۸، اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء)

جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ بڑا عظیم الشان تاریخی کارنامہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف فکر شبلی کے فروغ و اشاعت میں حصہ لیا بلکہ علامہ کی ایک ایک تحریر تلاش کر کے انتہائی سلیقہ سے مرتب و مدون کر کے شائع کی۔ مقالات کی آٹھ جلدیں، اردو و فارسی کلیات اور ایک جلد میں ان کی منتخب ادبی تحریریں ''انتخابات شبلی'' کے نام شائع کیں۔ ترتیب و تدوین میں یہ ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصل شبلی فہمی اور شبلی شناسی کی داغ بیل انہی نے ڈالی اور انہیں نے اس میں وسعت پیدا کی۔ سب سے آخر میں ''حیات شبلی'' لکھ کر بقول آل احمد سرور [۱۹۱۱-۲۰۰۲ء] مولانا حالی سے وہ تاج فضیلت چھین لیا جو ''حیات جاوید'' کی بدولت ان کے سر پر تھا۔ یہاں ان کی مدونہ کتب کے دیباچوں کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

مطبع نامی کان پور سے ۱۹۱۶ء میں مکاتیب شبلی جلد اول کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس میں دیباچہ شامل نہیں۔ طبع دوم معارف پریس اعظم گڑھ سے نکلا، اس میں دیباچہ شامل ہے۔ ۱۰/ صفحے کے اس دیباچہ کی ہر سطر ذکر شبلی سے عبارت ہے۔ ابتدا میں مکاتیب کی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے۔ پھر مکاتیب کے جمع و ترتیب کے آغاز، اعلان، پھر ہر طرف سے خطوط کی بارش کا ذکر کیا ہے۔ جن اہل علم اور تلامذہ نے علامہ شبلی کی ایک ایک سطر حفاظت سے سینہ سے لگا رکھی تھی، ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی کو اپنے اردو خطوط پسند نہ تھے بلکہ اپنے فارسی خطوط کو اہمیت دیتے تھے۔ اردو خطوط کو بد مزہ کہتے تھے۔ ان تمام تفصیلات کے بعد ان خطوط کی ادبیت اور انشا پردازی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے مہدی افادی [۱۸۷۰-۱۹۲۱ء] کی ایک تحریر نقل کی ہے اور

واقعی یہ تحریر بہت عمدہ ہے۔ اس سے علامہ شبلی کی انشا پردازی کی خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔ آخر میں خود انھوں نے مکاتیب شبلی کی چھ خصوصیتیں بیان کی ہیں اور حق یہ ہے کہ ان چھ خصوصیتوں کے ذکر میں ان کے خطوط کی تمام خوبیاں گنادی ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں محض دو خصوصیات ان کے الفاظ میں نقل کی جاتی ہیں۔ مکاتیب شبلی کی پہلی خصوصیت سید صاحب نے اختصار اور جامعیت کو قرار دیا ہے۔ پھر دوسری خصوصیت کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> ''درحقیقت مختصر نویسی کوئی ایسی خوبی کی بات نہیں ہے۔ اصل خوبی یہ ہے کہ اختصار لفظ کے ساتھ میں پوری وسعت موجود ہو۔ یہی خصوصیت مولانا کی انشا پردازی اور بلاغت کی جان ہے۔ وہ ایک ہی دو فقروں میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں ہم مضمون میں ان کو نہیں کھپا سکتے۔ وہ چند لفظوں میں جو جادو پھونک دیتے ہیں اس زمانہ کے سامری سیکڑوں منتروں میں وہ روح نہیں پیدا کر سکتے۔''
>
> (مکاتیب شبلی، اول، ص:۱۱ طبع جدید ۲۰۱۰ء)

مکاتیب میں القاب و آداب سے بے نیازی، جواب کی پابندی، طرز تحریر کی انفرادیت وغیرہ خصوصیتوں کو واضح کرنے کے بعد آخری یعنی چھٹی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ

> ''مولانا ہر شخص کے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ شاگردوں کے خطوط میں علمی و اصلاحی مشورے نظر آئیں گے۔ مولوی حبیب الرحمٰن شروانی کے خطوط میں زیادہ تر فارسی شاعری نوادر کتب اور ندوہ کے متعلق باتیں ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سے ادب و تاریخ فارسی کے مباحث پر گفتگو ہے۔ مولانا حمید الدین صاحب سے تفسیر اور سیرت پر مکالمات ہیں۔ مسٹر عبدالماجد سے مغربیات پر باتیں ہیں۔ مسٹر مہدی حسن صاحب مصنف دائرہ ادبیہ کے نام کے خطوط میں محاسن ادبی اور لطافت شعری پر گلفشانیاں ہیں۔'' (ایضاً، ص:۱۲)

آخر میں مکاتیب شبلی کے انتخاب کی ترجیحات کا ذکر ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے خطوط ان کے انتخاب میں نہ آسکے۔ یہ دیباچہ دونوں جلدوں کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ دوسری جلد میں دیباچہ شامل نہیں ہے۔

مکاتیب شبلی کی اشاعت کے بعد انہوں نے علامہ شبلی کے مقالات کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا، جو آٹھ حصوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ پہلا حصہ مذہبی، دوسرا ادبی، تیسرا حصہ تعلیمی، چوتھا تنقیدی، پانچواں تاریخی، چھٹا حصہ بھی تاریخی، ساتواں فلسفیانہ، آٹھواں متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے۔ان تمام حصوں کا مفصل تعارف و تجزیہ ناچیز ''آثار شبلی'' میں پیش کر چکا ہے۔

پہلی جلد پر مختصر سا دیباچہ ہے۔ مقالات شبلی کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم نے مستقل تصنیفات کے علاوہ مختلف عنوانات پر سیکڑوں علمی و ادبی وسیاسی مضامین لکھے تھے جو ہنوز اخبارات ورسائل کے صفحات میں منتشر تھے۔علم دوست اصحاب کا تقاضا تھا کہ ان پراگندہ موتیوں کو ایک سلک میں منسلک کردیا جائے کہ وہ ہر شخص کو یکجا میسر آسکیں اور اہل علم ان سے پوری طرح فائدہ اٹھاسکیں، اگرچہ مولانا مرحوم کے چند مضامین رسائل شبلی اور مقالات شبلی کے نام سے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے لیکن یہ دونوں مجموعے ناتمام ہیں اور صرف چند تاریخی اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس بنا پر ارادہ کیا گیا کہ مختلف عنوانات کے تحت اس عنوان پر ان کے تمام مضامین ایک ایک جلد میں یکجا کردیئے جائیں تاکہ ان کے مضامین جن جن موضوع پر ہوں وہ الگ الگ مرقع میں نظر آئیں۔'' (مقالات شبلی، حصہ اول، ص:۱)

مقالات شبلی کی دوسری جلد سے ساتویں جلد تک بغیر دیباچہ کے شائع ہوئی ہیں۔ البتہ آٹھویں جلد میں جو متفرق اور متنوع مضامین اور تحریروں کا مجموعہ ہے۔اس میں دیباچہ شامل ہے۔ آٹھویں جلد بہت اہم ہے۔اس میں بڑا تنوع اور گونا گونی ہے۔ اس سے علامہ شبلی کی مختلف حیثیتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم کے مضامین کا یہ مجموعہ ان کے متفرق اخباری مضامین، مختلف سفید تجاویز اور منصوبوں پر مشتمل ہے، اس مجموعہ پر سرسری نظر ڈالنے سے مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ساتھ نظر پڑ جاتی ہے، اشاعت اسلام، وقف

اولاد، اوقاف اسلامی، تعطیل نماز جمعہ، مجلس علم کلام، اشاعت کتب قدیمہ، ترجمہ انگریزی قرآن مجید، تالیف سیرت نبویؐ وغیرہ۔ مختلف قومی اور مذہبی تجویزیں انھوں نے قوم کے سامنے پیش کیں ان میں سے کچھ کو اپنی کوششوں سے پورا کر دیا، کچھ ایسی تھیں جو مناسب فضا نہ ہونے سے بار آور نہیں ہوئیں۔"

(مقالات شبلی ج ۸، ص: ۵)

بقیہ دیباچہ اسی اقتباس کی تشریح و توضیح ہے اور اس قدر عمدہ ہے کہ یہاں ان کے اقتباسات طوالت کے باوجود نقل کیے جاتے ہیں:

۱۔ اشاعت اسلام

"اشاعت اسلام کا کام انھوں نے باقاعدہ شروع کر دیا تھا اور مجھے میری قومی خدمت کی تعلیم کی غرض سے مددگار ناظم بنا دیا تھا۔ یاد ہوگا کہ ۱۹۰۸ء میں ارتداد کا جو عظیم الشان طوفان اٹھا تھا، اس کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اٹھے تھے ان میں ایک سربرآوردہ نام مولانا مرحوم کا بھی ہے۔ وہ شاہجہاں پور وغیرہ خود دورہ کو نکلے۔ راج پوتانہ کے اطراف میں معتمد آدمی بھیجے۔ ندوہ میں سنسکرت پڑھانے کا انتظام کیا۔ کئی طالب علموں کو اس درجہ میں داخل کر کے ان کو اس حد تک تیار کیا کہ اس درجہ کے ایک مسلمان طالب علم نے شاید ۱۹۱۰ء کے ندوہ کے اجلاس دہلی میں جب ٹھیٹ ہندی میں تقریر کی تو حاضرین کو اس کے پیدائشی پنڈت ہونے کا گمان ہو گیا اور وہ اس وقت دور ہوا جب لوگوں نے اس سے قرآن سنانے کی فرمائش کی۔ اتفاق دیکھئے کہ اس کے قرآن سنانے کا لحن بھی نہایت دلاویز تھا، اس وقت اس نے سورہ رحمٰن کی قرات اس خوبی سے کی کہ سارا مجمع آئینہ حیرت تھا۔" (ص: ۵-۶)

۲۔ تحریک وقف علی الاولاد:

"وقف علی الاولاد کا مسئلہ جس میں سرسید ناکام رہ چکے تھے مولانا کی کوششوں سے ایسا کامیاب ہوا کہ حکومت وقت کو اس کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور

مسٹر محمد علی جناح کی تحریک سے اسمبلی نے اس کو قانون بنانا منظور کیا۔'' (ایضا)

۳۔تعطیل جمعہ:

''نماز جمعہ کی تعطیل کے مسئلہ کو اٹھایا اور اس حد تک اس کو گورنمنٹ سے منوالیا کہ جو مسلمان نماز جمعہ میں جانا چاہیں وہ ایک مقررہ وقت کے لئے جاسکتے ہیں۔'' (ایضاً)

۴۔سیرۃ نبویؐ

''ان کی سیرت نبویؐ کی تجویز ایسی سرسبز ہوئی کہ آج ہماری زبان اس مقدس لٹریچر کی فراوانی، بلندی اور افادیت پر بجا فخر کرسکتی ہے۔'' (ایضاً)

۵۔اوقاف اسلامی:

''عام اوقاف اسلامی کا کام انھوں نے اخیر زندگی میں شروع کیا تھا اور ناتمام رہا مگر اکثر صوبوں میں ان کی ناتمام کوششوں کی آواز بازگشت گونجی اور سالہا سال کے بعد صوبوں کی حکومتوں نے اس کے متعلق اب کچھ نہ کچھ کیا ہے۔'' (ایضاً)

۶۔سیاسیات:

مولانا شبلی کی سیاسیات پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے۔سید صاحب نے حیات شبلی اور زیر نظر مقالات شبلی (ج:۸) کے دیباچہ میں جو کچھ لکھا ہے دوسرے لکھنے والوں نے اسی کی تشریح وتعبیر کی ہے۔سید صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا عملاً سیاسی نہ تھے مگر وہ اپنے خیالات میں نہایت سخت سیاسی تھے، اتحاد عالم اسلامی کے وہ پہلے سفیر تھے، علماء اور رہنمایان قوم میں سب سے پہلے ان ہی نے اسلامی ممالک کا سفر کیا اور سلطان ٹرکی سے اعزاز کا تمغہ پایا، جب وہ واپس آئے تو انگریزی حکومت نے ان کی کڑی نگرانی رکھی، کئی سال تک وہ جاسوسوں کے نرغہ میں رہے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ عثمانی خلافت اور اتحاد اسلامی (پین اسلامزم) کے جس سے اس زمانہ میں بہت کچھ ڈراجاتا تھا ہندوستان

میں مبلغ ہیں۔'' (ص:۶-۷)

اس کے بعد سید صاحب نے شبلی کے ٹرکی جانے سے پہلے ٹرکی کے لئے چندہ جمع کرنے، شہر آشوب اسلام لکھنے اور لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھنے۔ اور مسلمانوں کے مسائل و معاملات پر خوش کن خبر سے خوش ہونے اور غم انگیز خبروں سے دل گیر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ پھر ان کے سیاسی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ

> ''مولانا کالج میں گو سرسید کے ساتھ رہتے تھے مگر مذہبی اختلاف کے ساتھ ساتھ موصوف کو سرسید کے آخری سیاسی خیالات سے حد درجہ اختلاف تھا اور اس کو وہ ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے حق میں سخت مضر سمجھتے تھے، بلکہ اعلانیہ وہ کانگریس کی حمایت کرتے تھے اور اس وقت کی کانگریس کے خیالات سے پوری طرح متفق تھے۔'' (ص:۷)

اس کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے سرسید سے سیاسی اختلاف، جمہوری نظام کے حق میں تقریر، سرسید کا جواب لکھنا، تقسیم بنگال، جنگ بلقان، واقعہ مسجد کان پور، مسلم لیگ کی مخالفت کی تفصیل لکھی ہے، صحافت کے سلسلہ میں مولانا شبلی کی کوششوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۱۲ء میں جو بڑا انقلاب انگیز سال تھا مسلمانوں کی آزاد اخبار نویسی کا سال آغاز ہے، جب لاہور سے زمیندار نے رنگ پلٹا اور کلکتہ میں الہلال نمودار ہوا تو وسط ہند کیسے خالی رہ سکتا تھا چنانچہ لکھنؤ میں سید میر جان کی کوشش اور مولانا کے زیر مشورہ مسلم گزٹ نکلا، مولانا اس میں کبھی نام سے اور کبھی بے نام مضمون لکھتے تھے، مولوی وحید الدین سلیم مرحوم کو اس کی ایڈیٹری کے لئے مولانا ہی نے بلوایا تھا۔'' (ایضاً ص:۸-۹)

بعد ازاں علامہ شبلی کی انگریزی ترجمہ قرآن کی کوششوں کا ذکر ہے۔ دار المصنفین کی تجویز، ندوہ کی تعمیرات، ندوہ کے طلبہ کی کامیابیوں، قدیم عربی کتب کی اشاعت کی تجویز، مجلس علم کلام اور المامون کی تنقید کا جواب وغیرہ موضوعات پر علامہ شبلی کی کوششوں اور کاوشوں کی تفصیل لکھی ہے۔ آخر میں اس جلد میں شامل مضامین کی جمع و تدوین پر روشنی ڈالی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

اس دیباچہ میں علامہ شبلی اور ان کے افکار کی تفصیل سے وضاحت ہوتی ہے۔ یہ سید صاحب کا بہت اہم دیباچہ ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک بڑا کارنامہ علامہ شبلی کے اردو و فارسی کلام کی تدوین بھی ہے۔ جسے انھوں نے کلیات شبلی کے نام سے شائع کیا۔ کلیات فارسی بغیر دیباچے کے شائع ہوا ہے اس لئے اس سلسلہ میں ان کی کاوشوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ البتہ کلیات شبلی اردو پر انھوں نے ایک طویل مضمون جس میں علامہ شبلی کی شاعری اور خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس سے ان کی محنت اور تگ و دو کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا شبلی کی زندگی ہی میں علامہ کے کلام کے کئی مجموعے دہلی و لاہور سے شائع ہو گئے تھے جس کی تفصیل آثار شبلی میں دی گئی ہے۔ سید صاحب نے اس وقت تک جتنا کلام دستیاب تھا تلاش کر کے یکجا کر رکھا تھا، جسے مرتب کر کے شائع کیا۔

علامہ شبلی ایک بڑے شاعر تھے، مگر ان کے علمی کارناموں کے مقابلہ میں ان کی شاعری اس درجہ کی نہیں ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی مرحوم کے علمی کمالات میں اگرچہ فارسی اور اردو کی شاعری بھی داخل ہے تاہم انھوں نے بذات خود کبھی اس کو اپنا قابل فخر کارنامہ قرار نہیں دیا اور اس حیثیت سے کبھی اپنے ہم عصروں کی صف میں حریفانہ حیثیت سے کھڑے نہیں ہوئے بلکہ یہ ان کا ایک تفریحی مشغلہ تھا۔'' (کلیات شبلی، دیباچہ، طبع اول، ص:۱)

سید صاحب کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ بہر حال علامہ شبلی سے متعلق شاید سب سے زیادہ دیباچے اور تقدمے سید صاحب نے لکھے اور ان کے فکر و خیال کی وضاحت کی۔ واقعہ یہ ہے کہ فکر شبلی کی تفہیم کے لئے ان دیباچوں کا بھی مطالعہ ضروری ہے۔

سید صاحب نے دار المصنفین سے جب الکلام شائع کی تو اس پر تنبیہ کے عنوان سے دیباچہ لکھا اور علامہ شبلی کے عقائد کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھا۔ دراصل الکلام کی بعض عبارتوں کو سامنے رکھ کر علامہ شبلی کی کم از کم دو بار تکفیر کی گئی۔ یہی سبب ہے کہ سید صاحب نے اس

کے دیباچہ میں بدلائل ثابت کیا ہے کہ علامہ شبلی کے دینی عقائد وہی تھے جو اہل سنت والجماعت کے ہیں۔ اپنے موقف کی تائید میں انہوں نے الکلام، علم الکلام اور علامہ کے ایک اعلان سے شواہد فراہم کیے ہیں۔ اور جن عبارتوں کو سامنے رکھ کر بعض علماء نے فتاوے صادر کیے تھے، ان کو ملاحدہ کی کتابوں کے اقتباسات قرار دیا ہے۔ علامہ شبلی نے بھی یہی وضاحت کی تھی۔ سید صاحب نے الکلام پڑھنے والوں کو تنبیہ کی ہے کہ ملاحدہ کے جو اقوال ہیں انھیں رد کرنے کے لئے کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ سید صاحب نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ملاحدہ کے اقوال نقل کرنے میں اسلاف کے دو طریقے رہے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ رہا ہے کہ ملاحدہ کے اقوال نقل کیے بغیر ان کا رد لکھا جائے اور دوسرا طریقہ یہ رہا ہے کہ ان کے اقوال نقل کر کے رد لکھا جائے۔ مولانا شبلی کا یہی دوسرا طریقہ تھا جن لوگوں نے تکفیر کا فتوی دیا تھا، دراصل انھوں نے ملاحدہ کے اقوال کو علامہ شبلی کا قول سمجھ لیا تھا یہ پورا دیباچہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی سوانح شبلی کے دور آخر کے چشم دید شاہد تھے۔ اکثر ان کی تحریروں میں علامہ شبلی کے اقوال وخیالات آجاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کا ذکر کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ اسی طرح کی دو باتیں مولوی سید یوسف حسین کی کتاب ''عطر سخن'' کے مقدمہ میں آگئی ہیں۔

مولوی سید یوسف حسین صاحب موضع چھپرا ضلع سارن بہار کے رہنے والے تھے۔ ان کا ادبی مذاق بہت پختہ تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے انتخابات کے پانچ مجموعے نسیم سخن، غنچہ سخن، گل سخن، عطر سخن اور روح سخن مرتب کئے۔ ۱۹۳۰ء میں مرتب کے صاحبزادے سید احمد حسین نے اپنے والد کی ادبی یادگار شائع کی تو اس کا مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی سے لکھوایا۔ اس مقدمہ میں انہوں نے علامہ شبلی کی تین باتوں کا ذکر کیا ہے اور وہ باتیں اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر نمایاں طور پر کیا جائے۔

مولانا حالی کا خیال ہے کہ سخن گوئی سے زیادہ سخن فہمی مشکل ہے۔ علامہ شبلی کا بھی یہی خیال تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا محمد فاروق چریا کوٹی رحمۃ اللہ علیہ مولانا شبلی علیہ الرحمہ کے استاد کل تھے۔
اور مجھے بھی ان سے عربی ادب وشعر میں تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ ع

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

جب میں شروع شروع عربی میں شعر کہنا شروع کیا اور اصلاح کی غرض سے استاد کے سامنے پیش کیا تو فرمایا "شعر کہنے سے شعر سمجھنا زیادہ مشکل ہے۔اس لئے اپنے شعر کہنے سے زیادہ دوسروں کے شعر سمجھنے کی مشق پیدا کرو۔" مولانا شبلی مرحوم بھی فرماتے تھے کہ "سخن گوئی سے زیادہ سخن فہمی مشکل ہے۔" اور اس بارہ میں مولانا حالی مرحوم کے بے حد مداح تھے۔ایک دفعہ کا واقعہ بیان کرتے تھے کہ جب پہلے پہل جاحظ بصری (المتوفی ۲۵۵ھ) کی کتاب البیان والتبیین چھپ کر مصر سے آئی تو میں نے اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا، کتاب کا کوئی خاص موضوع سمجھ میں نہیں آیا۔اس میں عرب کے مشہور فصحا اور بلغاء کے کلام کے ٹکڑے یکجا تھے۔اتفاق سے رات کو مولانا حالی (جو ان دنوں علی گڑھ کالج میں رہتے تھے) آئے اور وہ کتاب لے گئے۔صبح کو یہ کہہ کر واپس کی کہ "یہ نثر کا حماسہ ہے۔" مولانا فرماتے تھے کہ ان کا یہ فقرہ سن کر میں پھڑک گیا اور عقدہ حل ہوگیا۔" غرض یہ تھی کہ جس طرح عربی نظم میں حماسہ شعرا کے بہترین کلام کا مجموعہ ہے، اسی طرح جاحظ نے گویا عربی زبان اور خطیبوں اور انشا پردازوں کے مختلف عمدہ ترین نثر کا یہ مجموعہ فراہم ہوگیا ہے اور یہی اس کا موضوع ہے۔"

(مقدمہ عطر سخن، ص:۱۳)

حماسہ کو علامہ شبلی نے عربی ادب کا قرآن بتایا ہے۔سید صاحب لکھتے ہیں:

"حماسہ کا جامع ابوتمام ہے، جو خود ایک بڑا صاحب دیوان شاعر اور بحتری کا مدمقابل تھا، لیکن فن کے تمام نقادوں کا فیصلہ ہے کہ ابوتمام کی لازوال شہرت ایک دیوان کے مصنف اور شاعر ہونے کی رہین منت نہیں بلکہ حماسہ کے مولف اور جامع ہونے کی ممنون ہے۔گیارہ سو برس کے قریب ہوئے کہ اسی حماسہ کی بدولت ابوتمام کا نام ادبائے عرب میں سرفہرست نظر آتا ہے۔اور بقول

مولانا شبلی ''وہ عربی ادب کا قرآن ہے۔'' (عطر سخن، ص:۱۴)

شعری انتخابات میں علامہ شبلی کو سب سے زیادہ مرزا مظہر جان جاناں کا خریطہ جواہر پسند تھا۔سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''جب ہندوستان کی زبان فارسی تھی، ہر لکھے پڑھے آدمی کے پاس ''سفینہ یا بیاض'' کے نام سے کاغذوں کے چند سادہ اوراق ہوتے تھے جن پر ہر صاحب ذوق اپنی پسند سے دوران مطالعہ یا باہم صحبتوں میں جو اچھے اشعار پڑھتا یا سنتا تھا ان کو وقتاً فوقتاً قلم بند کر لیتا تھا اور اس طرح ہر قدر شناس کے پاس شعرا کے اچھے اور منتخب شعروں کا ایک الگ مجموعہ تیار ہو جاتا تھا۔ اس قسم کے سفینے یا بیاض ہر پرانے علمی خاندان میں اب بھی موجود ملیں گے اور اکثر مشرقی کتب خانوں میں اس طرح کے متعدد نادر اور منتخب مجموعے محفوظ ہیں۔استاد مرحوم کی زبانی سنا تھا کہ ان کو مرزا صاحب کا ایک اس قسم کا انتخاب حیدرآباد دکن میں ملا تھا اور وہ اس کی تعریف کرتے تھے۔لیکن اس قسم کے تمام فارسی انتخابات میں وہ مرزا مظہر جان جاناں کے انتخاب کو جو خریطہ جواہر کے نام سے مشہور ہے اور چھپ بھی گیا ہے سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے۔'' (عطر سخن، ص:۱۴)

علامہ شبلی کی اسی پسندیدگی کی بنا پر مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے خریطہ جواہر کو دارالمصنفین سے شائع کیا۔اس کی تفصیل راقم کی کتاب ''شاہ معین الدین احمد ندوی حیات و خدمات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

علامہ شبلی نے ''تاریخ بدء الاسلام'' ایم اے او کالج کے نصاب کے لئے بقول شخصے سر سید کی فرمائش پر تیار کی تھی اور وہ تقریباً ان کی زندگی تک نصاب میں داخل رہی۔اسے سیرۃ النبی کا تخم قرار دیا جاتا ہے۔پھر شعر العجم جامعہ پنجاب لاہور کے نصاب میں شامل ہوئی۔ان کی وفات کے بعد شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر اور مقالات جلد اول وغیرہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں براہ راست یا مددگار کتب کے طور پر شامل ہوئیں۔دارالمصنفین نے ''انتخابات شبلی'' انہی کے لئے شائع کیا تھا۔اس حوالہ سے زیر نظر کتاب میں کوئی تحریر شامل نہیں تھی، اس لئے سید

صاحب کا یہ اقتباس شامل کیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خوشی کی بات ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ پھیل رہا ہے اور ان اگلے بزرگوں کی کتابیں اور تحریریں بھی پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں جنہوں نے اپنے قلم کے اعجاز سے جدید اردو ادب کو پیدا کیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرۃ الاستاذ مولانا شبلی مرحوم کی کتابیں بھی پڑھی جاتی ہیں جو اردو ادب میں خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ مسلم یونی ورسٹی میں ''سرسید اور ان کے رفقا'' کا جو ایک خاص دور رکھا گیا ہے، اس کے ضمن میں مولانا کی تصانیف کو پڑھ کر ان کے ادبی مضامین وخیالات کو یکجا کرنا پڑتا ہے، اس مشکل کو پیش نظر رکھ کر یہ مناسب سمجھا گیا کہ ''انتخابات شبلی'' کے نام سے مولانا کی شعرالعجم اور موازنہ سے جو خالص ادبی کتابیں ہیں ایک ایسا مرقع تیار کر دیا جائے جو ایسے طالب علموں کے کام آئے۔

اس انتخاب میں ایک خاص پہلو پیش نظر رہا ہے کہ کلام کے حسن وخوبی اور خاص طور سے شعر کی تنقید اور اس کے محاسن ومعائب کے اصول کو ان کی ان دو کتابوں سے لے کر اس طرح یکجا کر دیا جائے کہ کسی کلام کے عام محاسن اور خاص طور سے شاعری کی حقیقت اور اس کے جانچنے کے اصول ومعیار طلبہ کے ذہن نشین ہو جائے۔

ہماری زبان میں اس قسم کی تنقیدی کتاب اصولی حیثیت سے تھی بھی نہیں، اس لئے اس انتخاب نے یہ کمی بھی پوری کر دی۔

یہ انتخاب اصل میں مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کی فرمائش سے شروع کیا گیا اور اس نے اس کی قدر کر کے اس کو اپنے ایف اے کے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ امید ہے کہ ہمارے ملک کی دوسری یونی ورسٹیاں بھی اس کی پوری قدر کریں گی۔'' (انتخابات شبلی، ص:۱)

بزم تیموریہ تین جلدوں میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی بہت مشہور کتاب ہے۔ اس کی

جلد اول پر تقدیم مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہے۔ اس میں انہوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ ''بعض ممتاز شعرا فیضی، طالب آملی، نظیری، کلیم اور صائب وغیرہ پر اس لئے مختصر لکھا گیا ہے کہ ان کی شاعری پر مفصل تبصرہ شعر العجم میں موجود ہے، جس پر اضافہ کرنا ممکن نہ تھا، اور ان ہی کو دہرانا تحصیل حاصل تھا۔'' (بزم تیموریہ، ص:۳)

''حیات امام مالک'' بھی سید سلیمان ندوی کا ایک کارنامہ ہے۔ اردو میں اپنے موضوع پر یہ پہلی کاوش ہے۔ مگر جس پیمانہ پر اس کا آغاز ہوا تھا اس پر پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ وجہ تھی کہ جس وقت اس کی ابتدا ہوئی علامہ شبلی نے وفات پائی۔ سید صاحب اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''فراغت کے بعد سب سے پہلے اسی کتاب کی تکمیل کا خیال ہوا۔ ابھی تصنیفات کا حصہ ختم ہوا تھا کہ حضرت الاستاد نے وفات پائی۔ اور دم نزع وصیت فرمائی کہ تمام کام چھوڑ کر سب سے پہلے سیرت نبویؐ کی تکمیل کی جائے۔ اس بنا پر جہاں تک حیات امام مالک کی مسافت طے ہو چکی تھی قلم کا مسافر وہیں پہنچ کر رک گیا اور اب آئندہ اس کی تکمیل کی فرصت ہاتھ آنی مشکل معلوم ہوتی ہے اس لئے جو حصہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اس کو وقف ناظرین کیا جاتا ہے۔''
>
> (دیباچہ، حیات مالک، ص:ب)

---

(۵۲)

اقبال احمد خاں سہیل

[۱۸۸۴-۱۹۵۵ء]

علامہ اقبال احمد خاں سہیل ایم اے، ایل ایل بی علیگ، ایم اے او کالج علی گڑھ کے نامور فرزند اور آسمان علم و ادب کے نیر تاباں تھے۔ ماہر قانون تھے۔ ذہانت اور بے نظیر قوت حافظہ کے مالک تھے۔ شاعری میں سخنوری نہیں کشور کشائی کرتے تھے۔ ایسے یگانہ روزگار مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ گئے۔ اور ایم اے ایل ایل بی کی اسناد لیں۔ تحصیل علم کے بعد اعظم گڑھ کچہری میں وکالت شروع کی اور بھرپوری زندگی اسی غیر علمی وادبی مشغلہ میں خود کو مصروف رکھا۔ بلاشبہ ان کے اس طرز عمل سے خود ان کی ادبی زندگی کو نقصان پہنچا۔

انہوں نے دینی علوم کی تمام تر تعلیم علامہ شبلی سے حاصل کی تھی۔ شعروادب میں بھی ان کو اپنا استاد قرار دیتے تھے۔ غرض علی گڑھ کے علاوہ ان کو جو کچھ فیض پہنچا تھا وہ علامہ شبلی کی ذات سے پہنچا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علامہ شبلی کے مدة العمر والہ وشیدا رہے۔ اور ان کی ہر ادا پر جان دیتے اور تاحیات ان پر فدا و فریفتہ رہے۔

علامہ اقبال احمد خاں سہیل نہ صرف بے حد ذہین تھے۔ اور بڑا اخاذ ذہن پایا تھا۔ ان کی ان عظمتوں کی داد ان کے متعدد معاصرین اور احباب نے دی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں متعدد تحریکیں قائم ہوئیں۔ ان میں کانگریس اور مسلم لیگ جیسی ممتاز سیاسی جماعتیں بھی شامل ہیں۔ افتخار اعظمی [۱۹۳۵-۱۹۷۷ء] کے بقول ''شبلی کی صحبت اور تربیت کی وجہ سے سہیل نے ان تحریکوں کو جانا پہچانا۔ اور ان کے مقاصد کو سمجھا۔'' (تابش سہیل ص ید)

افتخار اعظمی نے یہ بھی لکھا ہے کہ سہیل کے استاد علامہ شبلی نعمانی جمہوری انقلاب کے داعی تھے۔ اور سرسید احمد خاں کے مقابلہ میں وہ اس خیال کے حامی تھے کہ مسلمان جنگ آزادی میں دوسری قوموں کے ساتھ برابر کے شریک ہوں۔ علامہ شبلی کے ان افکار کا اقبال سہیل پر بہت گہرا اثر پڑا۔ یہ خیالات ان کے ذہن میں علامہ شبلی ہی کی بدولت پختہ ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے نفسی کیفیات کی صورت اختیار کر لی۔ (ایضاً)

نہ صرف سیاسی بلکہ علامہ شبلی کے علمی وادبی اور تعلیمی نظریات پر بھی وہ مدة العمر عمل پیرا رہے۔ ان کی شاعری کو بھی بعض اہل قلم نے دراصل علامہ شبلی کے افکار کی توسیع قرار دیا ہے۔ اور کسی معاملہ میں نہ سہی، لیکن شعروادب کے میدان میں بلاشبہ وہ فکر شبلی کے ترجمان نظر آتے ہیں، انہوں نے خود بھی اپنی تحریروں میں جابجا اس کا اعتراف کیا ہے۔

علامہ شبلی نے اردو میں تاریخی واقعات کے منظوم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جو بے حد مقبول ہوا۔ بقول افتخار اعظمی ''انہوں نے شبلی کی طرح کمال صحت کے ساتھ صدر اسلام کے بعض

بلند تاریخی واقعات نظم کیے ہیں۔" (ارمغان حرم، ص:۴۵)

کلیات اقبال سہیل شائع ہو چکا ہے۔اس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ نہ صرف انداز بلکہ افکار و نظریات میں بھی کلام سہیل شبلی کا پرتو ہے۔ناچیز کی رائے میں علامہ سہیل کی شعری آواز دراصل علامہ شبلی کی بلند اور ترقی یافتہ لے ہے۔

اقبال احمد سہیل نے سیرت شبلی لکھی۔تنقیدی مضامین لکھے۔تبصرے اور تقریظات لکھیں۔ سب میں وہ اپنے استاد کے نقش قدم ہی پر رہے۔اور روایت سے بغاوت نہیں کی۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ کچھ بھی کہتے اگر کوئی ان کے سامنے ان کے استاد کی رائے پیش کر دیتا تو چاہے وہ ان کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہو خاموش ہو جاتے یا سر تسلیم خم کر دیتے۔

---

(۵۳)

شیخ اکرام الحق

[•••]

شیخ اکرام الحق کی کتاب "شعر العجم فی الہند" پہلی نظر میں علامہ شبلی کی معرکۃ الآرا کتاب شعر العجم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔بلاشبہ اردو میں یہ قیمتی اضافہ شعر العجم کی بدولت منظر عام پر آیا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ

> "علامہ شبلی نعمانی نے ہندوستانی فارسی شاعری کا تذکرہ شعر العجم، کلیم ہمدانی ملک الشعرا شاہ جہانی پر یہ کر ختم کر دیا کہ "وہ صحیفہ شاعری کا آخری ورق تھا۔" حالانکہ اواخر عہد شاہ جہاں سے لے کر اساس پاکستان تک ہندی الاصل فارسی شعرا جس تعداد میں اور جس کمال فن کے ساتھ اور جس قدر اہم ادبی تحریکات کو لے کر اس ملک میں پیدا ہوئے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے۔یہ ناانصافی ہے اگر انہیں درخور اعتنا نہ سمجھا جائے۔اور یہ کہہ دیا جائے کہ وہ شمار کے قابل نہیں۔"

(شعر العجم فی الہند، ص:۱-۲)

مصنف شیخ اکرام الحق نے علامہ شبلی کے موقف کو غلط قرار دیتے ہوئے یہ کتاب لکھی ہے، اوراس میں ہندوستانی فارسی شعرا کے احوال اور شاعری کو پیش کیا ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس کا خاکہ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے تیار کیا اور اس سلسلہ کے بعض مضامین ماہنامہ معارف اعظم گڑھ نے شائع کئے۔ (ایضاً ص:۲)

پوری کتاب میں مصنف نے جابجا علامہ شبلی نعمانی سے تعارض کیا ہے گویا اس کتاب کی پوری فضا شعرالعجم سے ماخوذ ہے۔

فاضل مصنف نے ہندوستان کے فارسی گوشعرا میں علامہ شبلی کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ فارسی کے ایک بڑے سخنور تھے، مگر ان کے تجزیے میں کچھ نازیبا باتیں بھی شامل کردی ہیں۔ اختلاف کے باوجود ان کی رائے یہاں نقل کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''غدر کے بعد فارسی گوشعرا میں سے مولانا شبلی ایک خاص خصوصیت کے مالک ہیں۔ اور وہ یہ کہ ان کی شاعری وارداتی اور افاداتی، عشقیہ اور مقصدیہ اصناف شاعری کے درمیان ایک کڑی ہے۔ انہوں نے اپنے ماحول سے متاثر ہوکر ہنگامی حالات اور ملی مفاد کو نظم کیا۔ مگر آورد کی شاعری تھی۔ طبیعت میں حسن پرستی تھی۔ بڑھاپے میں عشق کی لو لگی اور ایسا شعلہ پھوٹا کہ غزل کے روایتی گوشوں کو جگمگا گیا۔ البتہ بجھتی آگ کا شعلہ تھا جلد بیٹھ گیا۔'' (ایضاً ص:٦٦)

تنقید شعرالعجم کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جو شعرالعجم کی بدولت وجود میں آئی۔

---

(۵۴)

مولانا ابوالحسنات ندوی

[م: نومبر ۱۹۲۲ء]

مولوی ابوالحسنات ندوی بہار کے رہنے والے اور دارالعلوم ندوہ کے ممتاز فرزند تھے۔ اسلامی علوم وفنون اور شعروادب کے بڑے عالم تھے۔ تحصیل علم کے بعد دارالمصنفین کے رفیق منتخب

ہوئے۔دادسخن دیتے تھے۔اور نظم ونثر دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔علامہ شبلی سے بعض قصائد پر اصلاح لی تھی۔ان کے بعض خطوط میں بھی ان کا نام آیا ہے۔علامہ شبلی نے دارالمصنفین کی ابتدائی تیاری کے بعد اپنے جن طلبہ کو بلانا چاہا تھا ان میں مولوی ابوالحسنات ندوی بھی تھے۔چنانچہ سید صاحب نے انہیں بلاکر رفیق مقرر کیا اور چھ برس تک اس عہدہ پر انہوں نے ریسرچ اور تحقیق کا کام کیا، مگر موت کے آگے کس کو رستگاری ہے۔وہ نومبر ۱۹۲۴ء میں وفات پا گئے۔

دارالمصنفین کی رفاقت کے زمانہ میں انہوں نے متنوع مضامین معارف اور بعض دوسرے رسائل میں لکھے۔اسی کو مرتب کر کے انہوں نے ''ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں'' کے نام سے شائع کیا گیا۔یہ اپنے موضوع پر بڑی منفرد تحریریں ہے۔اس میں اصلاً ان کے رہبرو رہنما بانی دبستان شبلی ہیں کہ سب سے اول انہی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔اور اسلامی مدارس اور دارالعلوم جیسا تحقیقی مقالہ لکھا۔اسے الناظر پریس نے کتابی صورت میں بھی شائع کیا ہے۔

کئی برس ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک سابق استاد نے لکھا تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے فرامین دیکھے ہی نہیں تھے۔اس کے جواب میں راقم نے لکھا تھا کہ علامہ شبلی بنارس میں ندوہ کے سالانہ اجلاس میں فرامین کی نمائش کی تھی اور وہ اسے تاریخ کا بڑا اہم ماخذ تصور کرتے تھے۔مولوی ابوالحسنات ندوی نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں فرامین کو بنیادی ماخذ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''علامہ شبلی نعمانی نے اجلاس ندوۃ العلماء منعقدہ بنارس کے موقع پر ایک علمی نمائش کی تھی۔اس میں اس قسم کے متعدد فرامین جمع کیے گئے تھے۔یہ تاریخ ہند کا نہایت مہتم بالشان ذخیرہ ہے۔اس لیے اس کو پیش نظر رکھے بغیر جو تاریخ ہند مرتب کی جائے گی وہ بڑی حد تک نامکمل ہوگی۔''

(ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں،ص:۹)

علامہ شبلی جیسے نامور مورخ اور کئی معرکۃ الآرا تاریخی کتابوں کے مصنف،اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف تاریخیں لکھیں بلکہ مسلمانوں میں ابن خلدون کے بعد وہ واحد ایسے مورخ ہیں جنہوں اصول تاریخ نویسی وضع کیے۔ایسے دانشور مورخ کے بارے

میں یہ لکھنا کہ انہوں نے فرامین دیکھے ہی نہیں تھے کیسا مضحکہ خیز معاملہ ہے۔

---

(۵۵)

بیگم مہدی افادی

[٭٭٭]

مہدی حسن افادی[۱۸۷۰-۱۹۲۱ء] اردو کے صاحب طرز ادیب وانشا پرداز تھے۔ ان کا سرمایہ ادب مختصر ہونے کے باوجود اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ ان کا شمار اردو کے بڑے ادیبوں اور انشا پردازوں میں کیا جاتا ہے۔

وہ علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کے والہ وشیدا تھے اور مدۃ العمر یہ رشتہ مودت قائم رہا۔ علامہ شبلی نے ان کے اسلوب نگارش کی زبردست دی ہے۔ اور یہاں تک لکھا ہے کہ کاش شعر العجم کا مصنف بھی اس طرح کی دو سطریں لکھ سکتا۔ دوسری طرف مہدی حسن افادی الاقتصادی نے علامہ شبلی کو تاریخ کا معلم اول قرار دیا۔ بلکہ ایک اہل قلم نے یہاں تک لکھا ہے کہ شبلی مہدی افادی کی کمزوری تھے۔ یہ جملہ صحیح ہو یا نہ صحیح ہو، دونوں ایک دوسرے کے بے حد محب ومداح تھے۔

مہدی افادی کے مجموعہ مضامین ''افادات مہدی'' [مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور طبع چہارم ۱۹۴۹ء] میں علامہ شبلی سے متعلق ان کے درج ذیل مضامین شامل ہیں:

ا۔ تمدن عرب اور پروفیسر شبلی
۲۔ علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ الندوہ
۳۔ آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ
۴۔ شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر
۵۔ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی
٦۔ اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ

۷۔ شبلی سوسائٹی

۸۔ حالی وشبلی کی معاصرانہ چشمک

ان کے علاوہ بعض دیگر مضامین مہدی میں بھی علامہ شبلی کا خاصا ذکر ہے۔ اس کا مقدمہ مولانا عبدالماجد دریابادی [۱۸۹۲-۱۹۸۲ء] کے قلم سے ہے۔ اسے مہدی افادی کی بیگم نے مرتب کیا ہے اور ''ان کی یاد'' کے عنوان سے بڑا شاندار دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتی ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ باہمی تعلقات خاص طور پر گہرے تھے۔ ۱۸۹۰ء سے مولانا شبلی مرحوم سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور تعلقات کی تدریجی رفتار کے ساتھ تحریر کا لب ولہجہ بدلتا گیا۔ مولانا فرط خلوص سے ان سے کوئی راز نہیں رکھتے تھے۔

مولانا مرحوم اپنے ایک خط میں ان کے دو مضامین کی دادیوں دیتے ہیں:

''البشیر میں ایک مضمون دیکھا، نیچے تمہارے نام کے دستخط تھے، حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزاپوری دوست ہیں یا نذیر احمد وآزاد کی دوروحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے، کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھاتا رہا، دو ہی تین ہفتے ہوئے وہی برق ایک اور افق پر چمکی، یہ اس سے بھی زیادہ ہوش ربا اور خیرہ کن تھی۔''

ایک دوسرے خط میں لکھا کہ ''کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب ہوتے، دائرہ ادبیہ لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو یقین کرنے کی بات نہیں۔

جب وہ الہ آباد تبدیل ہو کر آئے تو مولانا بہت خوش ہوئے اور لکھا کہ آپ کے الہ آباد آجانے نے مجھ کو الہ آباد کے سفر پر فوراً مجھ کو آمادہ کر دیا، اب میرے سفر کی تعداد میں ضرور اضافہ ہو جائے گا۔

جب مولانا شبلی مرحوم الہ آباد تشریف لاتے تھے تو اپنے زمانہ قیام میں ایک دن بھی بغیر ان کے دیکھے مولانا کو چین نہیں آتا تھا اور مولانا کی مانگ ہر طرف کثرت سے رہتی تھی، میرے ہاں ایک روز سے زیادہ مہمان نہیں رہ پاتے تھے، تاہم جہاں مولانا ہوتے تھے وہ روزانہ ان سے ملنے کے لئے جایا کرتے

تھے۔" (افادات مہدی، ص: ۱۰-۱۱)

مہدی بیگم کے دیباچہ سے جوانہوں نے مہدی افادی کی ظرافت کا قصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے، یہ راز افشا ہوتا ہے کہ سید عبدالرؤف بیرسٹرایٹ لا نے علامہ شبلی کی دعوت کی تھی۔ سید عبدالرؤف صاحب محمد آباد گہنہ کے رہنے والے اور علامہ شبلی کے منجھلے بھائی مہدی حسن بیرسٹرایٹ لا کے کلاس فیلو تھے۔ بہر حال مہدی بیگم لکھتی ہیں:

"ایک مرتبہ سید عبدالرؤف صاحب بیرسٹرایٹ لا، الہ آباد جواب پنجاب ہائی کورٹ کے جج ہیں ان کے ہاں مولانا شبلی مرحوم کی دعوت تھی۔ اسی سلسلہ میں اور بھی بہت اصحاب شریک تھے، عبدالرؤف صاحب ان کے علمی اور سنجیدہ مذاق کی بہت قدر کرتے تھے۔ خاص کر ایسے موقعوں بیرسٹر صاحب ان کو ضرور پکڑتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ "بھائی بغیر آپ کے میز پر لطف نہیں آتا۔ اس دعوت میں باہر کے ایک رئیس صاحب بھی شریک تھے۔ آپ نے جو ایک نائب تحصیل دار کو اس قدر باقاعدہ کپڑوں میں دیکھا اور اس پر مولانا اور بیرسٹر صاحب کی خاص توجہ، تو آپ کی طبیعت نے نچلے نہ بیٹھنے دیا۔

رئیس صاحب نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، کیا آپ براہ مہربانی مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ انسان جنٹلمین کس طرح بنتا ہے۔ وہ سن کر ٹال گئے۔

دوبارہ پھر یہی سوال کیا، اب بھی وہ خاموش رہے، لیکن جب تیسری مرتبہ رئیس صاحب نے اس کا اعادہ کیا، تب انہوں نے نہایت سنجیدگی سے بغیر ان کی طرف دیکھے ہوئے جواب دیا، معاف کیجئے گا جنٹلمین بنتے نہیں ہوتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ہر طرف کے قہقہوں کی آواز سے ہال گونج اٹھا اور بیچارے رئیس صاحب جھینپ گئے۔ عبدالرؤف صاحب سے ضبط نہ ہو سکا، جوش میں فوراً اٹھے اور ان سے لپٹ گئے۔" (افادات مہدی، ص: ۱۶-۱۷)

بیگم مہدی افادی نے دوستی کی یہ داستان سنانے کے بعد لکھا ہے کہ علامہ شبلی کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی سے بھی مہدی

حسن افادی کے تعلقات قائم رہے۔ خاص طور پر سید صاحب نے ان کا رابطہ محبت اپنے استاذ مولانا شبلی مرحوم سے وراثتاً پایا تھا۔ (ص ۱۲) ان کے دیگر احباب مولانا عبدالماجد دریابادی، سید ناصر علی ایڈیٹر صلائے عام، مولوی عبدالرزاق کان پوری مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، شاہ دلگیر کا نام لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ

''الہ آباد میں کبھی کبھی مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد بھی میرے یہاں مہمان ہوا کرتے تھے۔'' (ص:۱۳)

اس تعلق خاطر کی داستان کا کچھ حصہ مہدی حسن افادی کے ذکر میں آچکا ہے۔

مکاتیب مہدی کا مقدمہ بھی مہدی بیگم لکھا ہوا ہے۔ مکاتیب مہدی میں علامہ شبلی کا ذکر کثرت سے آیا ہے لیکن دیباچہ میں انہوں نے یہ بھی افسوس کیا ہے کہ مولانا کو کیسے کیسے عمدہ خطوط لکھے، مگر انہوں نے محفوظ نہیں رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی نے کسی کا خط محفوظ نہیں رکھا اور شاید وہ اس لحاظ سے مکاتیب کا تحفظ ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔

مہدی بیگم نے مہدی افادی کی وفات کے بعد نہ صرف ان کے ادبی وتنقیدی مضامین ''افادات مہدی'' شائع کرائے بلکہ ان کے مکاتیب یکجا کیے اور ''مکاتیب مہدی'' کے نام سے شائع کیے۔ بعدازاں اپنے نام کے مکاتیب ''صحیفہ محبت'' یکجا کیے جنہیں پروفیسر محمود الٰہی نے انہیں اپنے مفصل مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں شائع کرایا۔ اسی مختصر ادبی سرمائے سے اردو میں مہدی افادی کا نام روشن ہے۔ کم لوگوں کے نصیب میں ایسی بیویاں آتی ہیں۔ ان دونوں کی حقیقی داستان، عشق ومحبت کی سچی داستانوں میں ملیں گی۔

---

(۵۶)

سید ظفر الملک علوی

[۱۸۸۴-۱۹۳۶ء]

مولوی محمد اسحاق معروف بہ سید ظفر الملک علوی اہل قلم، مصنف، مرتب اور ماہنامہ الناظر

لکھنؤ کے مدیر تھے۔تاحیات علم وادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ علامہ شبلی کے ملنے والوں میں سے تھے۔مولانا عبدالماجد دریابادی نے دور طالب علمی میں ''الکلام'' پر جو تنقید لکھی تھی، ماہنامہ الناظر میں انھیں نے شائع کی تھی۔مولانا دریابادی نے ''آپ بیتی'' میں لکھا ہے کہ علامہ شبلی سے ان کا دل صاف نہ تھا۔ممکن ہے اس وقت کچھ معاملہ رہا ہو، مگر انھوں نے اپنے الناظر بک ڈپو لکھنؤ سے علامہ شبلی کے تقریباً تمام کتب و مقالات شائع کئے بلکہ مستقل شائع کرتے رہے۔دوسرے اداروں سے علامہ شبلی کی جو کتابیں شائع ہوئی تھیں وہ بھی ان کے یہاں دستیاب رہتی تھیں۔

علامہ شبلی کے متعدد مقالات کو کتابچے کی صورت میں شائع کر کے عام کیا۔۱۹۲۴ء میں ماہنامہ الناظر کی طرف سے ایک انعامی مقابلہ ''سب سے بہترین انشا پرداز کون؟'' کا انعقاد کیا۔ اور جب سعید انصاری [۱۹۰۴- ۱۹۸۴ء] کا مقالہ ''مولانا شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز'' اول منتخب ہوا تو اسے مولانا دریابادی کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۲۵ء میں کتابی صورت میں شائع کیا اور اس کے بعد کئی ایڈیشن شائع کئے۔ان کی وفات کے بعد ان کی اولادوں نے بھی تصانیف شبلی کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔

علامہ شبلی کے اردو کلام کے کئی مجموعے دہلی لاہور اور علی گڑھ سے شائع ہوئے تھے۔ کلیات شبلی کی اشاعت سے پہلے سید ظفر الملک علوی ہی نے ان کا سب سے بہتر مجموعہ ''کلام شبلی'' کے نام سے مرتب کر کے ۱۹۱۸ء میں شائع کیا۔اس کے بھی انھوں نے کئی ایڈیشن شائع کئے۔اس پر انھوں نے دیباچہ بھی لکھا ہے، جس میں علامہ شبلی کی شاعری کے خاص خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ان کا خیال تھا کہ علامہ اپنی فارسی شاعری کے مقابلہ میں اردو شاعری کو مرزا غالب کی طرح ہیچ تصور کرتے تھے۔البتہ اس کا سبب انھوں نے قیاساً بیان کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ ایک طرف قدیم شاعری کا چمنستان امیر وداغ کی نغمہ سنجیوں کے لئے وقف تھا اور دوسری طرف نظم جدید کی مملکت میں مولانا حالی کا سکہ چل رہا تھا، مولوی شبلی صاحب کو اس کی کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ ان حریفوں کے مقابلے میں کوئی نمایاں امتیاز حاصل کر سکیں گے اور جو شہرت اپنی تاریخی تصانیف کی وجہ سے مولانا کو علمی دنیا میں حاصل ہو چکی تھی اس کے بعد وہ اسے مشکل ہی سے گوارا

کر سکتے تھے کہ شاعروں کی مجلس میں ان کی کرسی نیچی رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مولانا کے ابتدائی کلام میں سے ایک مثنوی اور چند قومی نظموں کے سوا کچھ نہ چھپنے پایا اور ان کی اشاعت میں بھی خود مولانا نے کوئی اہتمام نہیں کیا۔'' (کلام شبلی ص ب)

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''ایک مرتبہ راقم الحروف کو ایک قلمی بیاض سے مولانا شبلی کے کچھ اشعار کی نقل مل گئی، لیکن جب مولانا سے اس کا ذکر آیا اور الناظر میں ان کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا گیا تو انھوں نے باصرار اس سے باز رکھا بلکہ یہاں تک کہا کہ اگر ان کی اشاعت کی جائے گی تو راقم الحروف سے تمام تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ یہ ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے۔ یہ اشعار اتفاق سے تلف ہو گئے۔'' (ایضاً)

اس دیباچہ سے دو اور اہم باتوں کا علم ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ جنگ بلقان کے مجروحین کی امداد کے لئے لکھنؤ میں جو جلسہ ہوا تھا علامہ شبلی اس میں شریک تھے اور اس موقع پر چند اشعار بھی پڑھے تھے۔ دوسرے یہ کہ مسجد سانحہ کان پور اور بعض دوسرے قومی معاملات پر انھوں نے جو نظمیں لکھی تھیں ان میں جو زیادہ مقبول ہوئیں ان کی اشاعت پر پریس ایکٹ کے تحت روک لگادی گئی تھی۔ (ایضاً، ص: ج)

علوی صاحب نے جن نظموں کے ضبط کئے جانے کا ذکر کیا ہے وہ اب تک دستیاب نہ ہوسکیں۔ اسی طرح علامہ شبلی کی نظموں کا ایک مجموعہ تاریخی جواہر کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے مرتب اظہر دہلوی تھے۔ تلاش بسیار کے باوجود وہ بھی اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔

---

(۵۷)

محمود احمد عباسی

[۱۸۸۵-۱۹۷۴ء]

محمود احمد عباسی امروہوی نامور اہل قلم اور مصنف و مورخ تھے۔ امروہہ کی تاریخ و تہذیب

پر ان کے قلم سے متعدد تحریریں نکلیں۔ مذہبی موضوعات پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا، مگر اس میں ان کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں۔ اور اعتراضات لکھے گئے۔

محمود احمد عباسی علامہ شبلی کے قدر دانوں میں تھے۔ ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی کی قومی نظموں کا پہلا مجموعہ "نالہ شبلی" کے نام سے مرتب کر کے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی جانب سے انہیں نے شائع کرایا تھا۔ اس کا انتساب حلقۂ شبلی کے چند نمایاں اشخاص "مولانا ابوالکلام آزاد کی حریت، محمد علی کی ہمدردی، ڈاکٹر (مختار) انصاری کے ایثار، ظفر علی خاں کی اخوت کے نام کیا ہے۔" اس سے خود مرتب کی حریت فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مذکورہ بالا تمام حریت پسند اشخاص علامہ شبلی کے شیدائی اور ان پر جان چھڑکنے والے تھے۔

محمود احمد عباسی نے "نالہ شبلی" کے مختصر سے دیباچے میں اس مجموعہ کے مرتب کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "مسلمان بچوں کی اسلامی تربیت اور ان میں اخلاقی فضائل کے نشو ونما کے لئے خیر القرون کے آثار اور سلف صالحین کے کارنامے جس قدر زیادہ اہم اور ضروری ہیں افسوس ہے کہ اسی قدر ان کی طرف سے غفلت کی جارہی ہے۔ کچھ عرصہ سے شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کو اس ضرورت کی طرف توجہ ہوئی اور انھوں نے بزرگان سلف کے واقعات اور کارناموں کو نہایت مؤثر اور دل نشیں طریقے پر نظم کرنا شروع کیا ہے۔ تاریخی واقعات کا عمدہ اور مؤثر پیرایہ میں نظم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بڑی قادر الکلامی کی ضرورت ہے۔ علامہ ممدوح نے جس خوبی سے اس مشکل کام کو انجام دیا ہے اس کا اعتراف ہندوستان میں ہر سمجھدار شخص کر رہا ہے۔ درحقیقت مولانا ممدوح کا یہ احسان اس قدر عظیم الشان اور گراں بہا ہے کہ تمام افراد ملت اور ان کی آئندہ کی نسلیں ہمیشہ ان کی شکر گذار رہیں گی۔" (نالہ شبلی: مقدمہ)

محمود احمد عباسی کے حالات پر مالک رام نے تذکرہ معاصرین حصہ سوم میں مفصل مضمون لکھا ہے، مگر انھیں "نالہ شبلی" کی ترتیب واشاعت کا غالباً علم نہیں تھا۔

مولوی حکیم سید فرید احمد عباسی امروہوی طبیب ریاست بھیکم پور ضلع علی گڑھ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کی سوانح حیات ''سیرۃ العباس'' کے نام سے لکھی ہے۔اس کا مقدمہ انہی محمود احمد عباسی امروہوی کے قلم سے ہے۔اس میں انھوں نے علامہ شبلی کی فن سوانح نگاری سے متعلق خدمات کو سراہا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''خدا بھلا کرے حضرت علامہ شبلی کا جنہوں نے اردو زبان میں اس کام کی بنیاد ڈالی اور جن کے طفیل سے دو چار مشاہیر اسلام کے کارنامے ہماری نظر کے سامنے آگئے۔'' (سیرۃ العباس، ص:۶)

گویا ان کی نظر میں ہمارے ذخیرہ ادب میں مشاہیر اسلام کے تذکروں کا اضافہ علامہ شبلی کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

---

(۵۸)

مفتی محمد انوار الحق

[۱۸۸۵-۱۹۴۹ء]

مولانا مفتی محمد انوار الحق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات ریاست بھوپال بڑے عالم وفاضل شخص تھے۔انھوں نے بھوپال کے آخری حکمراں نواب حمید اللہ خاں کی اہلیہ میمونہ سلطان شاہ بانو کے ترجمہ ''آغاز اسلام'' کا دیباچہ لکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت ممدوحہ (سلطان جہاں بیگم) نے شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم کی سیرت نبوی کو ایک دینی فرض اور مذہبی عبادت کی طرح مکمل کرانے کا عزم کیا، لیکن سردست تو وہ کتاب ناتمام ہی ہے اور مکمل ہونے پر بھی غالباً اس کی ضخامت اس کی اشاعت کو اس قدر عام نہ ہونے دے۔جتنی کہ وہ ہونی چاہئے، غالباً اسی لئے حضور ممدوحہ کے ایما سے بیگم صاحبہ عالی جناب نواب حاجی محمد حمید اللہ خاں بہادر نے جو ابھی تک علیا حضرت کی خاص نگرانی میں طالب علمانہ زندگی بسر کرتی ہیں

اردو میں ایک مختصر تاریخ آغاز اسلام کا ترجمہ کیا ہے، اصل میں یہ کتاب مولانا شبلی مرحوم ہی نے عربی میں لکھی تھی اور اس کا ترجمہ فارسی میں مولانا حمیدالدین صاحب بی اے نے کیا تھا، لیکن چوں کہ بوجہ اجنبیت زبان یہ دونوں کتابیں عام فہم نہ تھیں اور خاص کر چھوٹے بچے جن کو آغاز اسلام کے واقعات جاننے کی سخت ضرورت تھی اس سے مستفید نہ ہو سکتے تھے، اس لئے جناب بیگم صاحبہ ممدوحہ نے اسے صاف وسلیس اردو کا لباس پہنا دیا جسے مبتدی لڑکے اور لڑکیاں بے تکلف پڑھ اور سمجھ سکتی ہیں۔ اس کتاب میں حضرت رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حالات تو کسی قدر اختصار سے لکھے گئے ہیں لیکن زمانہ رسالت کا بیان زیادہ مفصل ہے، مگر کتاب کی اصل خوبی تو یہ ہے کہ جو کچھ ہے نہایت صاف اور واضح ہے اور چونکہ تذکرہ اور وقائع کے سوا مسائل مختلف فیہ پر کچھ رائے زنی نہیں کی گئی ہے (اور یقیناً بچوں کے لئے اس کی کچھ ضرورت بھی نہ تھی) اس لئے کسی بات پر اعتراض بھی نہیں ہو سکتا، یوں بچوں کے لئے اس چھوٹی سی کتاب کا مطالعہ ایک دلچسپ تاریخ، ایک اخلاقی نصیحت اور ایک مذہبی عبادت کی مجموعی حیثیت رکھتا ہے اور یقیناً ہر پہلو سے ان کے لئے مفید اور نتیجہ خیز ہے۔''

(آغاز اسلام، دیباچہ ص: ج، د)

مفتی انوارالحق اور ان کے صاحبزادے دونوں سے علامہ شبلی کے مراسم تھے۔ البتہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اگرچہ مداح شبلی میں شامل ہیں، لیکن ان سے متاثر ہونے والوں میں غالباً شامل نہیں ہیں۔ ممکن ہے معاصرت کا کچھ دخل ہو۔ مولانا شبلی کی مخالفت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان حضرات کی ہے جو ان کے فضل وکمال کے حاسد تھے۔ شاید انہیں کے لئے علامہ شبلی نے یہ شعر کہا ہو:

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل وکمال
ورنہ حاسد تری خاطر میں یہ بھی گوارا کرلوں

(۵۹)

پروفیسر محمد طاہر فاروقی

[۱۸۸۷-۱۹۶۴ء]

چمنستان ادب کے نام سے حامد حسن قادری [۱۸۸۷-۱۹۶۴ء] نے اساطین اردو کی تحریروں کا ایک انتخاب کیا تھا جو آگرہ سے شائع ہوا۔ اس کا مقدمہ پروفیسر محمد طاہر فاروقی ایم اے سابق صدر شعبۂ فارسی و اردو آگرہ کالج آگرہ نے لکھا ہے۔

اس مقدمہ میں اردو کے آغاز، نشو ونما اور عہد بہ عہد ارتقا کی تفصیل لکھی گئی ہے۔ قدماو متاخرین اور عہد حاضر کے تمام معروف اہل علم وقلم کی ادبی خدمات کا سرسری تعارف پیش کیا ہے۔ متاخرین میں سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی خدمات کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ اور ایک مقام پر ان کے تمام کاموں کا ذکر بڑی خوبی اور جامعیت سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] ہمہ گیر قابلیت کے بزرگ تھے، لیکن بحیثیت نقاد، فلسفی، ادب اور سیرت نگار کے آپ یکتائے عصر تھے۔ ۱۸۹۲ء میں آپ کو شمس العلما کا خطاب ملا اور اسی سال حکومت عثمانیہ ترکیہ نے تمغہ مجیدیہ کا انعام بخشا۔ شبلی کی تصانیف سے ان کے علمی تبحر، وسعت نظر، مذاق سلیم اور تنقیدی ملکہ کا پتہ چلتا ہے۔...... سرسید تحریک کے سلسلہ میں شبلی نے کئی کتابیں لکھیں۔ الفاروق، المامون اسی سلسلہ کی مصنفات ہیں۔ سیرۃ النبیؐ مولانا کے لئے خود بھی مایہ ناز تھی اور سیرت کی کتابوں میں بھی بلند درجہ رکھتی ہے۔ شعرالعجم لکھ کر مولانا نے نہ صرف اردو زبان میں ایک بیش بہا اضافہ کیا، بلکہ فارسی شاعری پر بھی احسان فرمایا۔ آپ کو زبان سے بحث نہ تھی، پھر بھی آپ کی زبان نقائص سے بری ہوتی ہے اور ایک مخصوص طرز کی حامل ہے۔ آپ کی تحریروں میں سادگی وسلاست کے ساتھ آمد اور فصاحت ہے۔ الفاظ کا انتخاب موضوع کی مناسبت سے ہوتا ہے، اور زور اور اثر

اس درجہ کا ہوتا ہے کہ آپ کی عبارت محققانہ شان کے ساتھ قول فیصل کا بھی درجہ رکھتی ہے۔ مذکورہ بالا کتابوں کے سوا آپ کی تصنیفات نثر میں موازنہ انیس و دبیر، رسائل شبلی، الغزالی، سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم اور سفرنامہ روم و مصر و شام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔" (چمنستان ادب، ص:۱۲۔۱۳)

پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے اردو نثر کے نمونے کے عنوان سے ایک انتخاب شائع کیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کا بہت مشہور مقالہ "ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر" شامل کیا ہے۔ اس کے مفصل مقدمہ میں بھی علامہ شبلی کے متعلق مذکورہ بالا باتیں دہرائی گئی ہیں۔ البتہ اردو میں مقالہ نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ شبلی کی انفرادیت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"شرر کے ساتھ مقالہ نگاری میں جو شخص ممتاز نظر آتا ہے وہ صرف مولانا شبلی ہیں۔ ان کی محققانہ طبیعت، مبصرانہ نظر اور سحر کارانہ قلم نے مقالات کے ذریعہ سے تاریخ اسلام کے کتنے نکات و مقامات حل اور روشن کردئے۔" (اردو نثر کے نمونے ص ۲۷)

الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الذمیین اور سیکڑوں علمی و ادبی اور تحقیقی مقالات لکھنے والے علامہ شبلی سے معیار و وقار کے لحاظ سے مولوی عبدالحلیم شرر سے موازنہ شاید موزوں نہ تھا۔

---

(۶۰)

مولانا ابوالکلام آزاد

[۱۸۸۸-۱۹۵۸ء]

علامہ شبلی سے گہرا تاثر قبول کرنے والوں میں ان کے تلامذہ کے بعد سب سے اہم نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ ۱۳ رسال کی عمر میں مولانا آزاد نے انہیں پہلا خط لکھا۔ ۱۷ رسال کی عمر میں بمبئی میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد وہ علامہ شبلی کی خواہش پر لکھنو آئے۔ چند ماہ الندوہ کی ادارت کی۔ پھر لکھنو سے امرتسر چلے گئے مگر علامہ شبلی سے جو دلی ربط و تعلق قائم ہو گیا تھا وہ مدۃ العمر حرز جاں بنا رہا۔

مولانا آزاد صاحب طرز ادیب وانشا پرداز تھے۔ان کا بے مثال اسلوب نگارش انہیں سے شروع اور انہیں پر ختم ہوگیا۔شبلی وآزاد دونوں کا اسلوب نگارش بالکل جدا جدا ہے۔مگر علامہ شبلی کے جوفکری اثرات ان پر مرتب ہوئے وہ ہمیشہ قائم رہے۔عالم خوندمیری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ملت میں سربلند ہونے کی جوتمنا ہمارے دلوں میں مچل رہی ہے اس تمنا کی چنگاری علامہ شبلی نے سلگائی تھی۔(صبا،حیدرآباد،شبلی نمبر،ص:۵۶)

یہی نہیں انہوں نے علامہ شبلی کا اصل وارث ابوالکلام اور اقبال کو قرار دیا ہے۔(ایضاً)

خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی فکر بڑی حد تک علامہ شبلی کے افکار وخیالات سے عبارت ہے،جس کے فروغ میں وہ مدۃ العمر منہمک رہے۔دراصل ہندوستان میں اتحاد اسلامی اور ہندو مسلم اتحاد کے داعی اول علامہ شبلی تھے۔اوراس کا حقیقی نمونہ مولانا آزاد کی ذات تھی۔اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہاں مولانا آزاد کا ذکر ہی نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ ہم نے اس کتاب کو دیباچوں تک محدود رکھا ہے۔مولانا آزاد نے اپنی بیشتر کتابوں میں علامہ شبلی کا ذکر کثرت سے کیا ہے،مگر کسی دیباچے میں ان کا نام نہیں آیا ہے۔

---

(۶۱)

ملا واحدی

[۱۸۸۸-۱۹۷۷ء]

اردو زبان کے نامور ادیب اور مصنف ملا واحدی علامہ شبلی کے مداحوں میں تھے۔ ۱۹۰۹ء میں جب علامہ شبلی ایک ماہ کے لئے خواجہ حسن نظامی کے دہلی میں مہمان ہوئے تھے تو خواجہ صاحب نے ملا واحدی کو ان کی دیکھ ریکھ کے لئے مقرر کیا تھا۔البتہ خواجہ حسن نظامی سے علامہ شبلی کے بڑے گہرے مراسم تھے۔خط وکتابت بھی رہی۔خواجہ حسن نظامی کی وفات کے بعد ملا واحدی نے جوان کے حبیب خاص تھے،ان کی سوانح عمری لکھنے کا آغاز کیا اوراس کا پہلا حصہ جس میں ان کے ۱۹۲۴ء کے حالات ہیں،حلقہ نظام المشائخ دہلی کی جانب سے شائع کیا۔اس کے مختصر سے

دیباچہ میں صرف علامہ شبلی ہی کا ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دلی میں ندوۃ العلماء کا جلسہ ہو رہا تھا جسے مصر کے علامہ رشید رضا نے صدارت کی عزت بخشی تھی اور جس میں ہونے والے علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ عبد السلام ندوی سے بحیثیت جید طالب علم عربی کی تقریریں کرائی گئی تھیں۔

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابو الکلام آزاد مولوی عبد الاحد مالک مطبع مجتبائی کے ہاں برابر کمروں میں مقیم تھے میں اور خواجہ صاحب علامہ شبلی سے ملنے گئے۔ نظام المشائخ کا پہلا خاص نمبر (شہید نمبر) تازہ تازہ نکلا تھا، اس میں سرمد شہید پر مولانا ابو الکلام کا مضمون چھپا تھا۔ علامہ شبلی نے فرمایا سرمد کے حالات اتنے ہی ملتے ہیں جتنے ابو الکلام نے لکھ دیئے ہیں، لیکن حالات کو پھیلایا بہت ہے اکٹھے بیس صفحے لکھ ڈالے، میں لکھتا تو دو صفحوں سے زیادہ نہ لکھتا، مواد صرف دو صفحوں کا ہے، باقی ابو الکلام کی ادبیت ہے۔

اس کے بعد کہا کہ مورخ کی تحریر ایسی ہونی چاہئے کہ پڑھنے والا محسوس نہ کرے کہ یہاں لکھنے والے کی تیوری چڑھی ہے، اور یہاں لکھنے والے کا چہرہ کھل گیا ہے۔ میں نے علامہ شبلی کے ان فقروں کو گرہ میں باندھ لیا اور آج جب خواجہ صاحب کی سوانح عمری پیش کر رہا ہوں مجھے ان فقروں کی یاد بار بار آ رہی ہے۔''

(پیش لفظ، سوانح عمری خواجہ حسن نظامی از ملا واحدی دہلوی، ص: ۱۵-۱۶)

ملا واحدی کوچہ چیلان دہلی کے رہنے والے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے خاص دوست بلکہ عاشق تھے اور دہلی کے بزرگوں کے دیکھنے والوں میں تھے۔ اپنی کتابوں میں انھوں نے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔ خود نوشت بھی لکھی ہے، لیکن واقعات کے ہجوم میں کبھی کبھی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس میں ہوا ہے۔ ندوہ کا سالانہ اجلاس جس کی صدارت شیخ رشید رضا مصری نے کی تھی وہ دلی میں نہیں لکھنؤ میں ۱۹۱۲ء میں منعقد ہوا تھا۔ مولوی عبد الاحد کا مطبع مجتبائی دہلی میں واقع تھا۔ اجلاس ندوہ کے دوران شبلی و ابو الکلام کا قیام ان کے یہاں کیسے ممکن ہوگا۔ ایک قیاس یہ ہے کہ ندوہ ہی کا کوئی اور اجلاس دہلی میں منعقد ہوا ہو۔ اور یہ تمام بھی خواہان

ملت شریک بزم رہے ہوں گے۔ اور لکھتے وقت ملا واحدی کو التباس ہو گیا ہے۔

---

(٦٢)

محمد قربان علی بسمل دہلوی

[•••]

محمد قربان علی بسمل دہلوی دہلی کے رہنے والے اور مشہور شاہ جہانی پریس دہلی کے مالک تھے۔ یہ علامہ شبلی اور ان کی تصنیفات کے ایک بڑے قدرداں تھے۔ انھوں نے علامہ شبلی کی متعدد کتابیں اپنے پریس سے شائع کیں۔ انہوں نے علامہ کی نظموں کا مجموعہ ''مجموعہ نظم شبلی اردو مع سوانح عمری'' مرتب کیا ہے، جس کے کئی ایڈیشن خود انہوں نے شائع کئے۔ اس کے دیباچہ میں علامہ شبلی کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ اس میں مولوی سید احمد دہلوی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

> ''فارسی زبان کے آپ دھنی تھے۔ عربی کے کامل ادیب، ندوۃ العلماء کو بار آور بنایا۔ خزاں رسیدہ شجر کو پت جھڑ سے آپ نے محفوظ رکھا۔ از سر نو پروان چڑھایا، گو نااتفاقی نے اس پر پتھر برسائے۔ خود غرضانہ روڑوں کی بوچھاڑ کی جس کے سبب آپ اس سے کنارہ کش ہو گئے مگر جو کچھ کر گئے اور جس بات کی بنیاد ڈال گئے وہ آئندہ نسلوں کے حق میں آب حیواں سے کم نہیں۔''

(مجموعہ نظم شبلی اردو، ص:۱۰۱، شاہ جہانی پریس دہلی ۱۳۴۸ھ)

بسمل دہلوی کا جذباتی انداز ملاحظہ ہو:

> ''ہائے شبلی! اب ہم تمہیں کہاں پائیں گے، گو آپ کی تصانیف سے مکالمہ کا حظ اٹھائیں گے، رہتی دنیا تک فیض پائیں گے، سیرۃ النبیؐ کی ابتدائی جلد بھی ہماری نظر سے گذر جائے گی لیکن چار جلدوں کے واسطے آپ کی روح مبارک کس کس کے جسم میں حلول کرے گی، بلا سے مرتے مرتے سیرۃ النبی کو تو پورا کر دیا ہوتا۔''

(ایضاً، ص:۱۰۱-۱۰۲)

تلاش بسیار کے باوجود قربان علی بسمل دہلوی کے حالات راقم کو معلوم نہ ہوسکے۔ البتہ ان کی شبلی شناسی کی تفصیل راقم کے مجموعہ مضامین ''نقوش شبلی'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

---

(۶۳)

ڈاکٹر سید محمود

[۱۸۸۹-۱۹۷۱ء]

ڈاکٹر سید محمود ایک بڑے سیاسی رہنما تھے۔ بہار میں وزیر تعلیم اور حکومت ہند میں امور خارجہ کے وزیر رہے۔ وہ بڑے ذی علم اور صاحب شعور و دانش تھے۔ علم و ادب بالخصوص تاریخ ہند پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ کیمبرج کے بیرسٹر تھے۔ مغلوں کے سیاسی نظام پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند لی تھی۔ ان کا تحقیقی مقالہ غالباً شائع نہیں ہوسکا۔

دارالمصنفین سے انہیں بڑا لگاؤ تھا۔ اسی بنا پر ۱۹۵۰ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی وفات کے بعد دارالمصنفین کی انتظامیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس عہدہ پر وہ تا حیات فائز رہے۔ ان کے علامہ شبلی سے بھی تعلقات تھے۔ بعض علمی تحقیقات کے سلسلے میں انہوں نے علامہ شبلی سے خط و کتابت کی تھی۔ یہ خطوط راقم کی کتاب ''مکتوبات شبلی'' میں شامل ہیں۔ دور طالب علمی میں انھوں نے علامہ شبلی کی کتاب ''مضامین عالم گیر'' کا انگریزی میں ترجمہ یا خلاصہ کیا تھا، مگر وہ غالباً شائع نہیں ہوسکا۔ علامہ شبلی ان کے علمی شغف سے متاثر ہوکر سیرت نبویؐ کے اسٹاف میں انھیں شامل کرنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر سید محمود سیرۃ النبی اور الفاروق وغیرہ تصانیف شبلی کے بڑے مداح تو تھے ہی تحریک دارالمصنفین کے بھی روح رواں رہے۔ انھوں نے دارالمصنفین کی کئی کتابوں کے دیباچے لکھے ہیں اور اس قدر شاندار تحریریں لکھی ہیں کہ خیال ہوتا ہے کہ کاش وہ اسی میدان کے شہسوار ہوتے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی معرکۃ الآرا کتاب ''ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"دار المصنفین کو علامہ شبلی سے وراثت میں تاریخ ہندوستان کا کام بھی ملا۔ علامہ شبلی کی "مضامین عالم گیر" نے عالم گیر پر تحقیق کرنے والوں کو ایک خاص نقطہ نظر دیا، گو علامہ مرحوم نے اپنے اس خاص نقطہ نظر کو ثابت کرنے میں اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں پر اعتراضات کئے، لیکن ان کا یہ خاص نقطہ نظر مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا، پھر ان کے مضامین جہاں گیر، زیب النساء، عبد الرحیم خان خاناں اور ہندوستان پر اسلامی تمدن کے اثرات بہت اچھے تھے اور مقبول ہوئے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا۔"

(ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، پیش لفظ، ص:۱۴)

اب ایسی عمدہ اور مرصع نثر لکھنے والے کم از کم سیاسی رہنماؤں میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملیں گے۔

---

(۶۴)

مولانا سید طلحہ ایم اے

[۱۸۹۰-۱۹۷۰ء]

مولانا سید طلحہ ایم اے پروفیسر اورینٹل کالج لاہور بڑے عالم وفاضل شخص تھے۔ اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ خاص طور پر عربی میں ید طولی رکھتے تھے۔ والی بھوپال بیگم سلطان جہاں کی فرمائش پر ایک رسالہ سیرت ام المومنین حضرت ام سلمہؓ لکھا۔ انہیں اردو، عربی اور فارسی کے اشعار بکثرت یاد تھے۔ انہوں نے اپنی شعر فہمی کے ذکر میں ان کتابوں کی فہرست درج کی ہے جنہوں نے ان کی شعر فہمی میں اہم رول ادا کیا۔ اس میں علامہ شبلی کی شعر العجم کا نام بھی شامل ہے بلکہ انہوں نے صراحت سے لکھا ہے کہ "شعر العجم" نے مجھے سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا۔ (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص:۶۷)

---

(۶۵)

کیفی چریاکوٹی

[۱۸۹۰-۱۹۵۶ء]

مولانا محمد مبین کیفی چریاکوٹی بڑے عالم وفاضل اور اردو و فارسی کے شاعر و ادیب تھے۔ ان کی شہرت اردو کے ایک بڑے شاعر کی ہے۔

یہ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے صاحبزادے اور علامہ شبلی کے استاد بھائی تھے۔ نانیہال موضع ولید پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ نانا مولانا محمد کامل ولید پوری سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں گورکھ پور اور رائے بریلی میں تحصیل علم کیا۔ جرمن، فرانسیسی اور لاطینی زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کی۔ عربی زبان پر دست رس حاصل تھی۔ ایک کتاب بھی عربی میں لکھی ہے۔ ان کا شمار چریاکوٹ کے نامور علماء میں ہوتا ہے۔ انہیں آسی غازی پوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اوران سے اصلاح سخن کیا کرتے تھے۔ پھر ان کی ساری توجہ صحافت کی طرف ہوگئی، چنانچہ مختلف اخبارات ورسائل کی ادارت کی۔ یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء بروز اتوار انتقال کیا۔ اٹاوہ میں مدفون ہیں۔

کیفی چریاکوٹی نے چودھری نبی احمد سندیلوی کی کتاب وقائع عالم گیر پر دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ "اورنگ زیب عالم گیر کی حمایت میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں مدلل اور مستحکم مولانا شبلی علیہ الرحمہ کی کتاب ہے۔ (وقائع عالم گیر،ص:ک)

---

(۶۶)

احمد میاں اختر جوناگڑھی

[۱۸۹۰-۱۹۵۵ء]

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، جوناگڑھ کے ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ علوم مشرقی پر خاص دست رس حاصل تھی۔ تاحیات علم وادب کی خدمت کرتے رہے۔ متعدد

کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ ان میں اسلام کا اثر یورپ پر، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، حیات نظامی، مقالات اختر، ترجمہ: طبقات الامم، اسلامی کتب خانے، انار کلی بیگم، اور سر سید کی ابتدائی کتاب تذکرہ اہل دہلی کو مرتب کیا، جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا ہے۔

انہیں علامہ شبلی اور دبستان شبلی بالخصوص مولانا سید سلیمان ندوی سے بڑا تعلق تھا۔ علامہ شبلی کی اردو و فارسی شاعری پر ان کا مفصل مقالہ جو ماہی ہندوستانی الہ آباد اکتوبر ۱۹۳۶ء میں اور معارف اسلامیہ لاہور اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا اہل علم و ادب کو ابتک یاد ہے۔ یہ علامہ شبلی کی اردو و فارسی شاعری پر غالباً پہلا مقالہ ہے۔ انہوں نے علامہ شبلی کے سفرنامہ (روم و مصر و شام) پر بڑا عمدہ تبصرہ کیا ہے۔

علامہ شبلی کی متعدد اولیات کا ذکر کیا جاتا رہا ہے۔ قاضی صاحب نے بھی ایک اولیت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''اسلامی کتب خانوں پر اردو میں سب سے پہلے علامہ شبلی مرحوم و مغفور نے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو ان کے رسائل (رسائل شبلی) میں شامل ہے۔''

(اسلامی کتب خانے، ص:۱)

---

(٦٧)

مولانا ضیاء الحسن علوی

[۱۸۹۱-۱۹۴۵ء]

مولانا ضیاء الحسن علوی کاکوری کے علوی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی شد بد کے بعد ندوہ میں داخل ہوئے اور تمام تر تعلیم ندوہ میں حاصل کی۔ انہوں نے مولانا حفیظ اللہ، مولانا عبد الشکور، مولانا فاروق چریا کوٹی اور علامہ شبلی نعمانی وغیرہ سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ انہیں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور علامہ شبلی سے زیادہ شیفتگی تھی۔ یہ ندوہ میں مولانا سید سلیمان ندوی سے ایک سال آگے زیر تعلیم تھے۔

ندوے کے بعد علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۱۶ء میں عربی میں ایم اے کیا۔ یہاں پروفیسر ہارویز سے خصوصی طور پر استفادہ کیا۔ تحصیل علم کے بعد عربی مدرسوں کے انسپکٹر اور مشرقی امتحانات کے رجسٹرار مقرر ہوئے اور اس شعبہ کو بڑی ترقی دی۔ خاص طور پر اس کے نصاب کی اصلاح اور اسے مفید و کارآمد بنانے کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

"مرحوم نے عربی نصاب اور اردو و فارسی اور عربی کے سرکاری امتحانات کی اصلاح اور ترقی میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ جب وہ اس عہدہ پر فائز ہوئے تھے تو نام کے سوا اس صیغہ میں کچھ اور نہ تھا، لیکن انہوں نے چند برس کے اندر اپنی محنت، لیاقت، اخلاق اور محبت سے چالیس پینتالیس مدرسوں کو اپنا ہم نوا بنالیا اور اصلاح نصاب کا وہ خاکہ جو استاذ [شبلی] مرحوم صرف ندوہ کی حد تک کھینچ سکے تھے، ان کے لائق شاگرد کے ہاتھوں وہ پورے صوبہ کے دائرہ میں وسیع ہوگیا۔"

(یادرفتگاں، ص:۳۲۶)

ضیاء الحسن علوی علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں علامہ شبلی سے خصوصی لگاؤ تھا اور یہی سبب ہے کہ ان کی خودنوشت "یادایام" میں ان کا کثرت سے ذکر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بڑے وفا شعار شاگرد اور ان کی نجی محفلوں کے راز دار تھے۔ ان کی ہر ادا پر جان چھڑکتے تھے۔ "یادایام" ان کی آپ بیتی سے زیادہ ذکر شبلی پر مشتمل ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسے "شبلی اور ندوہ" کا عنوان دیا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔

۱۹۶۵ء میں سید محمد الحسنی [۱۹۳۵-۱۹۷۹ء] کی کتاب "سیرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوہ" شائع ہوئی تو اس پر مولانا مجیب اللہ ندوی نے ماہنامہ معارف [جولائی ۱۹۶۵ء] میں تبصرہ کیا۔ مولانا وحید الدین خاں [پ: یکم جنوری ۱۹۲۵ء] نے بھی ہفتہ وار الجمعیۃ دہلی [۱۹/جنوری ۱۹۶۸-۱۲/جولائی ۱۹۶۸ء] آٹھ قسطوں میں "شبلی کی فریاد" کے عنوان سے تنقید و تبصرہ لکھا۔ اسے شورش کاشمیری [۱۹۱۷-۱۹۷۵ء] نے چٹان لاہور میں "تاریخ ندوہ سے علامہ شبلی کا اخراج" کے عنوان سے قسط وار نقل کیا ہے۔ اس میں ایک بحث بانی ندوہ کی بھی تھی۔ ان کو اعتراض تھا کہ جب ندوہ کا تخیل علماء کی ایک جماعت کا تھا تو مولانا محمد علی مونگیری کو بانی ندوہ کیوں کر قرار دیا جاسکتا

ہے۔ مولانا ضیاء الحسن علوی جو ندوہ کے قدیم ترین طالب علم تھے، انہوں نے یاد ایام میں کئی مقامات پر انہیں بانی ندوہ ہی لکھا ہے۔ (یاد ایام، ص:۱۳۔ وغیرہ)

مولانا ضیاء الحسن علوی جنہیں علامہ شبلی کی نجی محفلوں میں بار حاصل تھا، یاد ایام میں ان کی کئی محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ ان کی باغ و بہار شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "مثنوی کے سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آگیا، سن لیجئے۔ ایک صاحب جو مراتب تصنیف میں قزاقی کے منصب پر فائز تھے، حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی کی صحبت میں سہ پہر کو بیٹھے تھے۔ شرر صاحب بھی تھے۔ نہ جانے مولوی ابوالکلام تھے یا نہیں مگر مولوی عمادی ایڈیٹر البیان ضرور تھے۔ فرمانے لگے، مولانا آپ نے جتنے کام کئے خوب کئے، مگر اس سائیں کی سوانح عمری [یعنی سوانح مولانا روم] لکھ کر اس کی تو عزت بڑھائی مگر اپنا وقت خراب کیا۔ حاضرین بہت محظوظ ہوئے، پھر لطائف کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرۃ الاستاذ کے علمی مذاکروں میں اکثر اس قسم کے لطائف نمک کا کام دیتے تھے اور ہمیشہ ان کی صحبت باغ و بہار رہتی۔"
>
> (ایضاً ص:۱۴-۱۵)

علامہ شبلی جس وقت ندوہ کے معتمد تعلیم منتخب ہوئے، اس وقت ان کے استاذ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی ندوہ کے صدر مدرس تھے۔ چنانچہ انہوں نے علامہ شبلی کے ندوہ آنے سے پہلے اس کو خیر باد کہہ دیا۔ مولانا ضیاء الحسن علوی لکھتے ہیں:

> "ہمارے مولانا کو جب اس انقلاب کی خبر ہوئی تو وہ اب یہاں ٹھہرتے ہوئے گھبرائے اور آخر کار اپنے خیر اندیشوں کے مشورہ سے خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ استاد شاگرد کی ماتحتی نہیں کر سکتا۔ علامہ نے جب سنا تو ان کو اس کا بے حد قلق ہوا۔ مگر میری رائے میں بہتر ہی ہوا۔ ورنہ نظم میں فتور آتا۔" (ایضاً ص:۲۱)

علوی صاحب نے علامہ شبلی کی زمانہ طالب علمی کی تصنیف اسکات المعتدی اور بعد میں لکھی جانے والی سیرۃ النعمان کو اسی غالی حنفیت کا نتیجہ قرار دیا ہے جو مولانا فاروق چریا کوٹی کی صحبت میں پیدا ہوا تھا۔ (ایضاً ص:۲۳)

نعمانی لقب کی نسبت لکھا ہے کہ یہ انہیں مولانا فاروق چریا کوٹی کا دیا ہوا ہے۔ (ایضاً)

۱۹۰۹ء میں مولانا فاروق چریا کوٹی نے وفات پائی۔ علامہ شبلی اس وقت ماہنامہ الندوہ لکھنؤ [اجراء جولائی ۱۹۰۴ء] کے ایڈیٹر تھے۔ وفیات لکھ کر اپنے استاذ کے غم میں آنسو بہائے اور یہ اعتراف کیا کہ میری تمام تر کائنات انہیں کے افادات ہیں۔ علوی صاحب نے لکھا ہے کہ

"علامہ فرماتے تھے کہ میری فارسیت جو کچھ ہے وہ انہیں کی جوتیوں کا طفیل ہے۔
نرے کھرے مولوی نہ تھے۔ قانون اور زمینداری خوب سمجھتے تھے۔ وکالت بھی کر چکے تھے۔" (ایضاً ص:۲۳)

مولانا فاروق چریا کوٹی علم و فضل کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ جیسا کہ علامہ شبلی نے اپنے وفیاتی مضمون میں لکھا ہے۔ علوی صاحب نے ان کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ استاذ سے علامہ شبلی کی شیفتگی کا بھی ذکر کیا ہے۔

ضیاء الحسن علوی نے یاد ایام میں علامہ شبلی کے تذکرہ سے پہلے ندوہ کی ایک سرسری تاریخ قلم بند کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ

"سب کچھ لکھ گیا مگر اس سلسلہ میں حضرۃ الاستاذ علامہ کا ذکر کہیں براہ راست نہیں آیا۔ یہ ذکر تو خیر بعد کو اپنی جگہ پورا پورا ہوگا، مگر اتنا تو سن ہی لیجئے علامہ کو ندوہ سے دلچسپی تھی، مگر علماء کو ان سے دلچسپی کم تھی۔ ان کے نزدیک وہ علی گڑھ رہ کر ساقط الاعتبار ہو چکے تھے۔ تاہم حضرت مولانا محمد علی صاحب ان سے برابر مشورے کرتے رہتے۔" (ایضاً ص:۳۱)

علامہ شبلی سے اپنی ابتدائی واقفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ تو کیسے کہوں کہ علامہ کے نام سے واقف کم سنی سے نہ تھا۔ اول تو میرے گھر میں ان کا چرچا رہتا تھا۔ سب سے پہلی کتاب ان کی المامون پڑھی تھی۔ اب تو نہیں مگر اس ایڈیشن میں سرسید کا لکھا ہوا دیباچہ بھی تھا۔" (ایضاً)

سرسید احمد خاں نے المامون طبع دوم پر دیباچہ لکھا اور یہ سچ ہے کہ شبلی کے اس دور شباب میں سرسید نے ان کی جتنی تعریف و تحسین کی ہے شبلیات میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔

علوی صاحب نے اپنی کم سنی کی ایک شام کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"علامہ ایک مرتبہ میری کم سنی میں ندوہ میں چند روز آ کر ٹھہرے۔ میں شام کو عم محترم (منشی احتشام علی کاکوروی) کے ساتھ ندوہ گیا تو وہ دفتر کے اوپر والے کمرے میں تھے۔ ان کے لئے میز کرسی کی نشست کا انتظام تھا۔ داڑھی کھچڑی تھی۔ سامنے میز پر چند مطبوعہ البم رکھے تھے اور کچھ کتابیں بھی بے ترتیب پڑی تھیں۔ عم محترم سے باتیں ہوتی رہیں۔ مجھ کو انہوں نے وہ البم دیکھنے کو دے دیئے۔ اس میں عمائدین مصر و شام کی تصویریں تھیں جو میں دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مصر و شام و روم کے سفر سے مراجعت کے بعد کا ہے۔" (ایضاً)

اس اقتباس سے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ علامہ شبلی نے اپنے سفر روم و مصر و شام کے دوران البم تیار کرائے تھے اور اس میں عمائدین مصر و شام کی تصویریں تھیں۔ ممکن ہے یہ البم ندوہ یا علی گڑھ کے کتب خانوں میں مل جائیں۔ کاش ایسا ہوتا تو سفر نامہ روم و مصر و شام کے حوالہ سے بعض نئی باتیں سامنے آتیں۔

ایک زمانہ میں مرزا ہادی رسوؔا کے ناولوں کی ہر طرف دھوم تھی۔ ضیاء الدین علوی صاحب نے علامہ شبلی سے امراؤ جان ادا کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا:

"بھائی میں نے ناول کبھی نہیں پڑھا، لاؤ ذرا دیکھوں تو، تعریف بہت سنی ہے۔ کتاب لاکر دے دی، صبح کو جب حاضر ہوا تو فرمایا کہ آج شب کی نیند گئی، اس کم بخت نے سونے نہ دیا، جب تک پورا نہ کرالیا۔" (ایضاً، ص:۴۳)

علوی صاحب نے مرزا ہادی رسوؔا اور ان کی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے میری زبان کی اصلاح کی اور ان کے حکم پر ان کے رسالہ الحکم میں مضامین لکھے۔ علوی صاحب پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جن لوگوں نے لکھا ہے انہوں نے ماہنامہ الحکیم میں ان کی مضمون نگاری کا ذکر نہیں کیا ہے۔

علامہ شبلی تھے تو ندوہ کے معتمد تعلیم، مگر اصلاً اور عملاً سب کچھ وہی تھے۔ علوی صاحب اس

کے شاہد ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''معتمد تعلیم کا اصلی کام تو تعلیم کی نگرانی تھی، مگر کام چلانے کے لئے بڑی چیز روپیہ ہے۔ اس کی فراہمی، چلت پھرت والے شخص پر پڑ جاتی ہے۔ ہمارے علامہ کی شخصیت نے خود ان سب کاموں کا ذمہ لے لیا، لہذا ایک سر ہزار سودا ہو گیا۔ دار العلوم کی نگرانی، ملک میں اس کی تبلیغ، روپیہ فراہم کرنا، رسالہ الندوہ جو خود ان کی ایجاد تھا، چلانا اور ابتدا میں اس کو خود ہی بھرنا، طباعت کی فکر اور نگرانی، شعر العجم کی تصنیف یہ کیا کچھ کم مشاغل تھے۔'' (ایضاً ص:۴۵)

یاد ایام کی ضخامت ۸۴ صفحے ہے، جس میں مختلف مقامات پر ذکر شبلی کے علاوہ یکجا ۲۸ صفحات پر ان کا مسلسل ذکر ہے۔ نہ صرف ان کی سیرت و شخصیت، کردار، اخلاق، تصنیفات و تالیفات، ندوہ، الندوہ، احباب و معاصرین متنوع موضوعات سپرد قلم ہوئے ہیں۔ اس کی تمام تفصیلات نہیں پیش کی جا سکتیں۔ البتہ چند اہم پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ضیاء الحسن علوی علامہ شبلی کے دور ندوہ کے سب سے زیادہ واقف کار تھے، حتی کہ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی زیادہ۔ خود سید صاحب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ (یاد رفتگاں، ص:۳۲۳-۳۲۴)

اس حوالہ سے خود اپنے بارے میں علوی صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ کو میرے ساتھ بڑی محبت اور خصوصیت تھی۔ ان کی نجی صحبتوں سے بہت کم جدا ہوتا، خواہ علماء کا مجمع ہوتا یا بے تکلف احباب اور طلبہ کا جمگھٹ۔ اسی وجہ سے ان کے ہر قسم کے حالات پر میری نظر رہی، جیسے وہ آئے تھے پھر آزاد ہو کر ندوہ کا پبلک کام کر کے، اس کے مشکلات دیکھ کر، رفتار زمانہ پیمان کران کے اگلے خیالات میں جو جو انقلاب اور جن وجوہ سے وہ پیدا ہوئے سب آئینے کی طرح میرے سامنے ہیں۔ اپنی اپنی جگہ ان کی جھلک آتی جائے گی اور جو کچھ لکھوں گا وہ صاف صاف بلا رو رعایت۔ انسان ایک تغیر پذیر مخلوق ہے اور تغیرات عالم سے جو کچھ متغیر ہو وہی کامل انسان ہے۔ ہوا سے لڑنا سر ہنگی ہے

انسانیت یا شجاعت نہیں ۔'' (یادِ ایام، ص: ۴۸-۴۹)

علامہ شبلی کے معمولات اور ان کی پسند و ناپسند کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا اور ان کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''علامہ کا یہ معمول تھا کہ شب میں ۹ر بجتے بجتے سو جاتے ۔ کھانا عموماً بعد مغرب تناول فرما لیتے ۔ کھانے میں گوشت وہ بھی بھنے ہوئے، تار پر مصالحہ دار کا شوق تھا، خود بھی کھانا پکا لیتے ۔ چار بجے صبح سے اٹھ بیٹھتے ۔ لیمپ کے چولہے پر چائے کی کیتلی رکھ دیتے ۔ شب کو خدمت گار سب سامان قرینہ سے رکھ کر چلا جاتا ۔ آپ ہی چائے بنا کر پیتے ۔ شاعری کا وہی وقت تھا۔ اول نماز سے فراغت کرتے، کچھ تلاوت بھی کر لیتے، پھر میز پر اور کبھی فرش پر بیٹھ کر تصنیف شروع ہو جاتی اور یہ مشغلہ صبح ۸ بجے تک ختم ہو جاتا ۔ فرماتے تھے کہ بھائی یہ وقت اپنا ہوتا ہے، بلا مداخلت غیرے جو چاہو کرو ۔ پھر تو جناب دنیا بھر کے مشغلے چھڑ جاتے ۔ لوگ آنے والے کیا کم تھے ۔ میرے لئے کوئی پابندی نہ تھی، کیوں کہ اگر بے وقت بھی چلا جاتا تو چپ چاپ ایک کونے میں ان کو مشغول پا کر بیٹھا رہتا ۔ جب وہ خود مخاطب ہوتے تو چونکتا ۔ مجھ کو اس علم کے دیوتا کے ساتھ محویت تھی ۔ اگر کوئی فکر کلام کرتے یا کوئی نئی تحقیق ہوتی تو سب سے پہلے میں ہی سن لیتا تھا ۔ جس زمانے میں کسی تصنیف کو تیز رفتاری سے ختم کرنا ہوتا یا الندوہ بھرنا ہوتا تو اس زمانے میں اس وقت میں توسیع ہو جاتی ۔ دس بجے تک ۔ میں نے ایک مرتبہ عرض کیا یہ بات نوٹس چاہتی ہے، لہٰذا دروازہ پر لکھ کر کہہ دیتے کہ احباب معاف فرمائیں، میں دس بجے تک مصروف ہوں ۔ دس گیارہ بجے کے درمیان کھانا کھاتے، اس وقت بھی وہی ایک مرغوب غذا ہوتی ۔ دو قسم کے کھانے کم ہوتے، اس کے بعد اگر کوئی بے وقت آنے والا نہ آ دھمکا تو دار العلوم میں اتر کر آتے اور تعلیم کی نگرانی فرماتے یا مدرسین کے خالی اوقات مدرسہ میں خود ان کے پاس چلے جاتے، ہر فن کی تعلیم کی بابت ان کو ہدایتیں فرماتے اور کبھی کتاب منگا کر خود پڑھ کر ان کو پڑھانا بتاتے ۔''

(ایضاً،ص:۴۵-۴۶)

علامہ شبلی تصنیف وتالیف کے اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ چاہے وہ سفر میں ہوں یا حضر میں، اپنے معمولات پر سختی سے کار بند رہتے۔ بیماری کے زمانہ میں بھی اس میں فرق نہیں آتا۔ دہلی کے زمانہ قیام کے اہتمام کا ذکر ملا واحدی اور ضیاء الدین احمد برنی نے بھی کیا ہے۔ مگر ضیاء الحسن علوی نے کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے کہ

> ''یہ بھی ان پر خدا کی رحمت تھی کہ باوجود صحت کی اتنی خرابی کے دماغ صاف رہتا کہ سخت سے سخت بخار کی حالت میں بھی وہ ساہی الفواد کبھی نہ ہوتے۔ فرماتے تھے کہ اس قدر سخت قبض اور باسوری تکالیف کے اثرات حلق تک رہتے ہیں، دماغ کی طرف صعود نہیں کرتے ہیں۔ لہذا بخار میں اور بخار تو کشمیری تحفہ تھا، اکثر آجاتا، تصنیف کا کام نہ رکتا۔ البتہ کتب بینی بند ہوجاتی، مگر باتیں کرنے کا شوق تھا، اس میں کوئی کمی نہ ہوتی۔ شدت تکلیف میں چند منٹ کراہ لیتے پھر ہلکے ہوجاتے۔ ملیریا کا بخار تھا، سردی بھی لگتی تھی، اس لئے لحاف یا کمبل بسترے سے کم ہٹتا۔ الکلام تو ساری کی ساری شدت بخاری میں تصنیف کی مگر اس کی ڈھنڈک تو دیکھیے کہ کسی پر بھی بخار نہ نکالا، حتی کہ ملاحدہ سے اعتراضات کے جواب میں بھی ان کا وہی اعتدال قائم رہا اور کہیں قلم تیز نہ ہوا۔ ۱۲-۴ تک کا وقت عموماً مطالعہ اور فراہمی مواد میں صرف فرماتے۔ اس کے بعد اگر احباب آجاتے تو خیر نہیں تو ٹہلنے کو نکل جاتے اور دور دور تک چلے جاتے، میں اکثر ساتھ ہوتا، دنیا بھر کے اگلے پچھلے عام دلچسپی کے واقعات کا ذکر رہتا۔'' (ایضاً ص:۴۷)

علامہ شبلی حقہ پان وغیرہ کے تکلف سے بری تھے۔ البتہ شکر دان سامنے رہا کرتا تھا اور اس سے شغل کیا کرتے تھے، حتی کہ تگنی کے چاولوں میں شکر ملا کر کھاتے۔ اس کی تفصیل بھی علوی صاحب نے لکھی ہے۔ ایک ڈاڑھ کے گر جانے اور ڈاکٹر اکرم حسین، امین آباد سے ڈاڑھ لگوانے اور پھر اسے استعمال نہ کرنے کی بھی تفصیل لکھی ہے۔ مزاج میں اضطراب اور لکھتے وقت اعضاو جوارح کے متحرک ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ مصنوعی پاؤں کے استعمال اور اس کی تکالیف کے

برداشت کرنے کی بھی بات لکھی ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

''مگر اس شخص کی ہمت کی داد دیجئے، پاؤں کٹا تو مصنوعی پاؤں اور اس کی بندشوں کو برداشت کرتے۔ تمام قومی تحریکوں میں حصہ لیتے۔ دور دراز کے سفر کرتے اور گھنٹوں کھڑے کھڑے تقریریں فرماتے۔'' (ایضاً، ص:۴۸)

اس کے بعد علوی صاحب نے دارالعلوم کے قدیم رنگ اور اس کی کمیوں کا ذکر کیا ہے اور تفصیل سے اسے بیان کرنے کے بعد علامہ شبلی کی ندوہ آمد اور اس میں انقلاب پیدا ہونے کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اب جب ہمارے علامہ دارالعلوم میں قدم رنجہ فرما چکے تو میری تکلیف جو ہمارے مولانا [محمد فاروق چریا کوٹی] کے تشریف لے جانے سے تھی رفع ہونے لگی اور نعم البدل پاکر یہ پژمردہ دل شباب علم کے ولولے سے لبریز ہوکر چھلکنے لگا۔ ہر مشکل کا حل سامنے تھا۔ ہر گتھی سلجھانے والی انگلیاں چلنے لگی تھیں۔ بندھے ہوئے عقدے ایک ادنی سا اشارہ میں کھل کھل جاتے۔ اس منزل علم کے لئے ایسے ہی رہبر کی ضرورت تھی۔'' (ایضاً، ص:۴۹-۵۰)

اس کے بعد علوی صاحب نے علامہ شبلی کے طریقہ تعلیم و تربیت، اصلاح نصاب اور قدیم نصاب کے نقصانات وغیرہ کی تفصیل لکھی ہے اور پھر ہر موضوع کی تعلیمی کیفیت اور اس میں علامہ شبلی کی ندوہ آمد سے رونما انقلابات کو بھی بیان کیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کے طریقہ تفہیم قرآن اور ان کے ماموزاد بھائی ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہمارے علامہ کو کسی آیت قرآنی کی بلاغت پر دائمی وجد آجاتا تھا اور پھر اس کے حسن کو بیان کرتے۔ بعض مرتبہ ہندی دوہے پڑھ پڑھ کر اس کی مثالوں کو ذہن نشین کرکے اس کے حسن کی توضیح کرتے تھے، مگر اپنے شاگرد اور عزیز علامہ فراہی کی تحقیق اور عمیق نظر کے ہمیشہ معترف رہتے۔ ان دونوں بھائیوں کے مکالمے جن کو سننے کا اتفاق ہوا ہے بڑے علم آموز اور وسعت نظر پیدا کرنے والے ہوتے

مگر فرق یہ تھا کہ علامہ ارسطو کی بوطیقا اور قواعد معانی و بلاغت سے گھرے تھے اور علامہ فراہی ان گرفتوں سے نکل چکے تھے۔ ان میں قرآن فہمی کا ایک حسن باطنی پیدا ہو گیا تھا۔ انہیں مکالموں کا نتیجہ ہے کہ شعرالعجم میں شعر کی حقیقت پر جو بحث ہے وہ اس صدی میں شاعری پر بہترین مقالہ ہے۔'' (ایضاً،ص:۵۳-۵۴)

شعرالعجم کی تصنیف کو علامہ شبلی اپنے بچپن کا شوق بتاتے تھے۔ چنانچہ علوی صاحب نے ان سے عرض کیا کہ آپ اپنے پیش نامے سے باہر کیوں جا رہے ہیں، ابھی تو وہ کام باقی ہیں فرمایا:

''اب تم لوگ کر لینا، مگر یہ تو میرا بچپن کا شوق ہے، اس کو تو پورا ہی ہو جانے دو، ورنہ رہ جائے گا۔'' (ایضاً،ص:۷۱)

شعرالعجم اور براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کا زمانہ تصنیف تقریباً ایک ہی ہے۔ بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ شبلی نے شعرالعجم کا خیال براؤن سے لیا ہے۔ مولوی عبدالرزاق کان پوری نے صراحت سے لکھا ہے کہ شعرالعجم کی بنیاد براؤن کی کتاب پر رکھی گئی ہے۔ علوی صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''براؤن کی ادبیات ایران شائع ہوئی، ادھر شعرالعجم کا بھی اشتہار ہو چکا۔ لوگ سمجھے کہ علامہ نے یہ خیال اسی سے لے لیا ہے، مگر اس سے پہلے شعرالعجم بہت کچھ ہو چکی تھی، تاہم بے چین مصنف نے براؤن کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھوا کر اس کا ترجمہ سن لیا، پھر کہا تو یہ کہا کہ الحمدللہ اس نے میرا کام نہیں کیا، حالاں کہ براؤن نے بعد کی جلدوں میں خود علامہ سے بڑے شکر و امتنان کے ساتھ بہت کچھ نقل کیا۔ یہ جواب تھا ان لوگوں کا جنہوں نے بدظنی کو دخل دیا۔ ان بعض الظن اثم۔ اس کے بعد شعرالعجم کی تنقیدیں میرے نزدیک وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو الفرق اور الفاروق میں ہے۔'' (ایضاً،ص:۷۱-۷۲)

حالی و شبلی کے حوالہ سے متعدد اہل قلم نے مضامین و مقالات لکھے ہیں۔ (کتابیات شبلی) مہدی افادی نے دونوں کے درمیان معاصرانہ چشمک کا شوشہ چھوڑا اور بعض اہل قلم نے حد سے متجاوز ہو کر حالی و شبلی کو پہلے مد مقابل قرار دیا، پھر حالی کو شریف النفس کہہ کر ساری تان علامہ شبلی پر

توڑی، مگر اصل معاملہ کیا تھا، مولانا ضیاء الحسن علوی کی زبانی سنئے:

"علامہ کو ہر ایک پر نکتہ چینی کرتے سنا ہے مگر حالی صاحب کی جب کی تو تعریف ہی کی۔ اگرچہ بعض عالمانہ اختلاف مقدمہ [شعر و شاعری] سے ان کو بھی تھے۔" (ایضاً، ص:۵۷)

ڈپٹی نذیر احمد [۱۸۳۶-۱۹۱۲ء] علامہ شبلی کے بڑے مداح تھے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "شبلی سخنوروں کی نظر میں"۔ ڈپٹی نذیر احمد نے نہ صرف علامہ شبلی کی تحسین و ستائش کی ہے بلکہ ان کے ندوہ آنے کو بھی پسند کیا اور ماہنامہ الندوہ کی تحسین میں عربی میں چند اشعار بھی کہے، اس کا ذکر بھی یاد ایام میں ہے۔ البتہ یاد ایام سے ایک نئی بات کا علم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد علامہ شبلی سے علمی مواد حاصل کرتے اور استفسارات کرتے تھے۔ علوی صاحب لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر نذیر احمد بڑے مصنف اور نثار تھے، مگر مواد کے لئے اپنی تصنیفات میں ان سے مستفید ہوتے۔ علامہ (شبلی) کی علالت کے زمانہ میں میں نے اس قسم کے استفسارات کے جواب لکھے ہیں۔" (ایضاً، ص:۷۰)

علامہ شبلی اپنے عہد میں مختلف حیثیتوں سے معروف تھے۔ لوگوں کو علمی کاموں کا مشورہ دینا، تصنیفی منصوبہ بنانا، مواد فراہم کرنا، طلبہ کے لئے ان کی نشاندہی کرنا، ان کی زندگی کا ایک بڑا نمایاں کام ہے۔ مکاتیب شبلی میں اس طرح کی باتیں بھری پڑی ہیں، لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے حوالہ سے یہ باتیں یاد ایام کے سوا کہیں اور نظر سے نہیں گذریں۔ اس سے دونوں کی عظمت اور بڑوں کے طریقہ کار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یاد ایام میں ڈپٹی نذیر احمد کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا، اس میں ملک کے متعدد اہل علم اور ارباب کمال جمع ہوئے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد بھی تشریف لائے تھے۔ علامہ شبلی اس وقت علاج کے لئے بمبئی گئے ہوئے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ملاقات نہ ہونے پر دکھ کا اظہار کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد سے علامہ شبلی کی پہلی ملاقات ۷۶-۱۸۷۵ء میں اعظم گڑھ میں ہوئی تھی۔ وہ برسوں اعظم گڑھ کی ایک تحصیل سکندر پور کے تحصیل دار رہے۔ [یہ سکندر پور اب ضلع بلیا کا حصہ ہے] بعد ازاں ڈپٹی کلکٹر ضلع اعظم گڑھ مقرر ہوئے۔ علامہ شبلی نعمانی لاہور سے مولانا فیض الحسن

سہارنپوری کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرکے واپس آئے تو ڈپٹی نذیر احمد نے کہا:

"اجی تم تو بڑے تگڑے نکلے، میرے استاذ سے بھی پڑھ آئے۔" (ایضاً، ص:۷۸)

اس سے ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی کی پہلی ملاقات کی تعین ہو جاتی ہے جو اس سے پہلے نہیں کی جاسکی تھی۔

مولانا ضیاء الحسن علوی نے ماہنامہ الندوہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ الندوہ کے دو ایڈیٹر تھے۔ علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی۔ انہوں نے شروانی صاحب کی شخصیت اور علم وادب پر ان کی گہری نظر، ذوق کتب بینی، کتب خانہ اور اس کے عجائبات کی فراہمی، زمیندارانہ مصروفیات وغیرہ کی تفصیل سپرد قلم کرنے کے بعد الندوہ سے ان کی بے توجہی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"علامہ اکثر جز بز ہوتے۔ ایک مرتبہ تو لکھ دیا کہ ان کو اپنے رئیسانہ مشاغل سے فرصت نہیں ملتی۔ بعد کو اس لفظ پر ندامت اور معافی چاہی۔ یہ ان کی خاص خصوصیت تھی۔ اپنی غلطی پر سخت انزجار ہوتا تھا، مگر علامہ کو علم کے سوا اور کام ہی کہاں تھا۔ ان کو تو بہت کام تھے، خانگی امور کا سرانجام، ایک شاہانہ طبیعت کے بزرگ چچا کی اطاعت اور خدمت، یہ کوئی معمولی کام نہیں ہوتا ہے۔ اس کو جو جانتے ہیں وہی جانتے ہیں۔ اس لئے الندوہ کا بوجھ بہت کچھ علامہ پر پڑتا۔ اس رسالہ کی اہمیت اس سے زیادہ کیا بیان کی جاسکتی ہے کہ اپنے زمانہ میں دنیا کا سب سے بڑا اسلامی مصنف اس کا ایڈیٹر تھا۔" (ایضاً، ص:۵۹-۶۰)

یاد ایام میں علامہ شبلی اور ان کے عظیم الشان کارناموں کا ذکر تو ہے ہی مستقبل کے لئے ان کی فکر مندی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایک دن شرر صاحب اور ہمارے علامہ بیٹھے تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے پرداز پر اسلامی ادبیات کی خدمت کی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ لوگوں نے اتنا کرلیا ہے کہ ہمارے لئے کیا رہ گیا؟ علامہ نے فرمایا ابھی ہوا کیا ہے۔ شرر صاحب جو ہمیشہ مبتدیوں کی ہمت افزائی کرتے تھے بولے ہم نے داغ بیل ڈالی ہے، اب کیاریاں تم لوگ بھرنا۔" (ایضاً، ص:۶۰-۶۱)

علامہ شبلی مردم سازی کے لئے معروف ہیں۔انہوں نے اپنی تربیت سے اردو کو متعدد نامور اہل قلم دیئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری فلسفی اور خود مولانا ضیاء الحسن علوی وغیرہ کی انہوں نے اسی طرح تصنیفی تربیت کی تھی۔

زبان کے سلسلے میں علوی صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی اپنی زبان کو مستند کبھی نہ سمجھتے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ الفاروق کا نیا ایڈیشن شائع ہونا تھا۔انہوں نے منشی واحد علی صاحب کے پاس بھیجا اور کہا کہ وہ اس کی زبان درست کردیں۔ چنانچہ منشی واحد علی نے کئی دن اس کو غور سے پڑھا اور چند مقامات پر کچھ بنا کر الفاروق کو واپس کیا اور کہا کہ شبلی خود صاحب طرز ہیں۔علوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ منشی واحد علی نے جو اصلاحیں کی تھیں علامہ شبلی نے وہ سب منظور کرلیں۔

راقم کو یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ منشی واحد علی کون بزرگ تھے؟ ہاں یادِ ایام سے یہ ضرور واضح ہے کہ وہ اہل زبان تھے، مگر اب واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی اور الفاروق کو ساری دنیا جانتی ہے اور منشی واحد علی سے کوئی واقف نہیں۔شاید کام کرنے اور نہ کرنے کا یہی بنیادی فرق ہے۔

علوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ شبلی نے ساری عمر دہلی والوں کے درمیان گذاری۔لکھنؤ آئے تو یہاں کی زبان کا چٹخارہ لینے لگے۔ایک مرتبہ کہا کہ یہ چاٹ پرانی ہے۔علی گڑھ سے بہت پہلے کی۔ (ایضاً،ص:۶۴)

علامہ شبلی کی زبان دانی کے ذکر میں علوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''انگریزی کے حرف شناس تھے۔کبھی کبھی الفاظ پوچھ کر صحیح جملے ادا کرلیتے۔فرانسیسی پروفیسر آرنلڈ سے سیکھی تھی اور اس کا اپنے مضمون اور موضوع کے مطابق کچھ مطلب حل کرلیتے تھے۔ان کی فارسیت ان کی عربیت سے بلند تھی،مگر عربیت بھی بہت اچھی تھی۔'' (ایضاً،ص:۷۱)

سرسید اور شبلی کے ربط و تعلقات پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔مضامین و مقالات کے علاوہ فاروق دیوانے ایک کتاب بھی سپرد قلم کی ہے۔ایک طبقہ شبلی کو سرسید کا مخالف اور حریف قرار دیتا ہے اور دوسرا انہیں سرسید کا پروردہ۔دونوں اپنی اپنی انتہاؤں پر ہیں۔علوی صاحب نے بھی اس

موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ علامہ شبلی کے سیاسی رجحانات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''سرسید کی کوششوں کا نتیجہ ان کے نزدیک ''وضع الشی فی غیر محلّہ'' ہو کر رہ گیا تھا، اسی وجہ سے ان کو رغبت ایجوکیشنل کانفرنس سے نہیں باقی رہی۔ نکتہ چینوں نے کہا کہ سرسید کے بنائے شبلی اب سرسید کے خلاف ہو گئے۔ اس میں جرم کیا تھا؟ کتنے سرسید کے پیدا کئے ان کے خلاف ہو چکے تھے۔ وہ ایک تجربہ کو کامیاب نہ پا کر مسلمانوں کے لائحہ عمل کو ضرور بدلنا چاہتے تھے۔ کسی وقتی سیاسی ضرورت سے اتحاد عمل دوسری قوم کے ساتھ جیسا کہ محمد علی اور شوکت علی مرحومین نے کیا اور پھر تائب ہو گئے۔ اس سے زیادہ پسند نہ فرماتے، وہ کانگریسی کبھی نہیں ہوئے۔''

(ایضاً ص: ٦٥-٦٦)

یادایام کے آخری صفحات میں علوی صاحب پھر ایک ذیلی عنوان ''حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی'' قائم کرتے ہیں اور اس میں علامہ شبلی کی تعلیم، ان کے اساتذہ اور تحصیل علم کا طریقہ، ان کا بے مثل حافظہ اور قوت آخذہ وغیرہ کی ایک ایک چھوٹی بڑی باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک سے زاید بار یہ لکھا ہے کہ انہیں مولوی پسند نہیں کرتے تھے۔ ندوہ میں بھی ایک طبقہ تھا جو ان کے خلاف ہیجان برپا کیا کرتا تھا۔ پھر انہوں نے ندوہ کی اسٹرائک کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل سید صاحب نے بھی حیات شبلی میں لکھی ہے۔ اس کی کسی قدر تفصیل علوی صاحب کے دلچسپ انداز تحریر میں ملاحظہ ہو:

''علی گڑھ میں تھا، بی۔اے کا امتحان دے چکا تھا کہ شب کو خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑی محفل میلاد منعقد ہے۔ عیدگاہ میں حضرت علامہ وہاں کھڑے بیان فرما رہے ہیں۔ دوسرے روز خبر وفات کی ملی، انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

اس خواب کی مناسبت سنئے علی گڑھ سے چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ندوہ میں اسٹرائک ہو چکی ہے۔ مولویوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ علامہ کنارہ کش ایک حد تک ہو چکے ہیں۔ ایک آنکھ میں نزول ماء شروع ہو گیا ہے، میں حاضر ہوتا ہوں، اسٹرائک کا قضیہ سنتا ہوں۔ قلق ہوتا ہے۔ ان کی معذوری پیش نظر

ہوجاتی ہے۔اب وقت اس قسم کے برداشت کرنے کا نہیں ہے۔عقیدت مند شاگرد مشورہ یکسوئی کا دیتا ہے۔........اب مخلصین لہ الدین کا وقت ہے، الامر بابخواتیم، استاد علامہ بے چین ہوجاتے ہیں۔استاذ شاگرد آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔استاذ فرط محبت سے شاگرد کو لپٹا لیتا ہے۔" (ایضاً،ص:۶۷-۶۸)

ندوہ میں علامہ شبلی کے خلاف ایک اور ہیجان انگیز منظر ملاحظہ فرمائیں۔وہ لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ بعض علما میں اس سے پہلے علامہ کے خلاف ہیجان پیدا ہوا، جس کی تحقیق اور تفتیش کے لئے ایک جماعت اراکین ندوہ کی آگئی۔صبح کو حضرۃ الاستاذ کی قیام گاہ پر چند علماء بیٹھے ہیں۔الکلام شائع ہوچکی ہے۔پروف کی جلد، نواب محسن الملک مرحوم آئے۔وہ نہ مانے۔کسی طرح اپنے ساتھ لے گئے۔وہی جلد میں نے بھی پڑھی تھی مگر اس کے بعد والی مجلد رکھی تھی۔جناب مولانا مسیح الزماں خاں صاحب نے اس کو اٹھالیا۔اتفاق دیکھئے صفحہ وہی کھلتا ہے جہاں علامہ نے ملاحدوں کے اعتراض نقل کئے ہیں۔اس وقت علامہ نے بعجلت بے چین ہوکر فوراً ان سے کہا کہ حضرت بس ملاحدہ کے اعتراض نقل کئے ہیں۔خوف ہوا کہ یہ عصبیت کی رو میں کہیں ان اقوال کو انہیں کے اقوال نہ سمجھ لیں تو سونے پر سہاگہ ہو، اگرچہ نقل کفر کفر نہ باشد۔" (ایضاً،ص:۶۸-۶۹)

مولانا علوی صاحب نے علامہ شبلی کی سادہ طبیعت اور سادگی پسندی اور اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔سادگی اور قناعت سے متعلق ان کے خیالات بھی نقل کئے ہیں۔ان کے والد شیخ حبیب اللہ بڑے سخی اور داتا تھے۔باوجود اس کے وہ مولانا شبلی کو دور طالب علمی میں اخراجات کے لئے محض پانچ روپئے دیتے تھے۔(ایضاً،ص:۷۰)

بعد ازاں علوی صاحب نے علامہ شبلی کے اضطراب اور سیماجی کیفیت کا ذکر کیا ہے اور ذکی الشعور لکھا ہے اور ان کی ایک ایک ادا جو انہوں نے دیکھی بیان کی ہے۔علامہ کی دلی کیفیت کا حال ملاحظہ ہو:

"ان کی طبیعت میں لوچ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور دل اس قدر نرم تھا کہ بعض

واقعات حیرت انگیز دیکھے، گرمیوں میں پنکھا نہ کھنچواتے، ایک مرتبہ کسی علالت کے موقع پر میں نے عرض کیا تو فرمایا کہ بھائی کسی دوسرے کا پنکھا کھینچنا اور غلامی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات میں سیاسی انقلاب ذہنی وجوہات سے زیادہ قلبی نزاکتوں پر مبنی تھا۔" (ایضاً ص:۶۸)

ندوہ کے حالات کے پیش نظر علوی صاحب نے انہیں سیرت کے لئے یکسو ہوجانے کا مشورہ دیا، جسے علامہ نے قبول کرلیا۔ سیرت کے سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"مولوی کچھ سمجھیں "انما الاعمال بالنیات" یہ میرا ایمان ہے کہ خلوص کی کوئی کمی نہ تھی۔ علم وفہم میں کیا کسر تھی۔ قبولیت کیوں نہ حاصل ہوتی۔ عشق رسولؐ سے ہر رگ پھڑکی ہوئی تھی۔" (ایضاً ص:۶۸)

یادایام بڑی عمدہ اور دبستان شبلی کے حوالہ انتہائی معلومات افزا خودنوشت ہے۔ راقم نے اس کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اس پر ضروری تعلیقات وحواشی لکھے ہیں۔ عنقریب ان شاء اللہ ادبی دائرہ سے شائع ہوگی۔

---

(۶۸)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

[۱۸۹۲-۱۹۷۷ء]

مولانا عبدالماجد دریابادی ایک جامع کمال شخص تھے۔ طالب علمی میں جو قلم ان کے ہاتھ میں آیا تو دم واپسیں تک نہ چھوٹا۔ قرآن، حدیث، تفسیر، کلام، فلسفہ، حکمت، ادب، شاعری، تذکرہ، تبصرہ، سیرت، سوانح، تنقید، تحقیق، تاریخ، تعلیم، خودنوشت کون سا ایسا موضوع ہے، جس پر انھوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ اور بلا مبالغہ ہزاروں صفحات نہ لکھے ہوں، جس میں ایک حرف بھی بیکار نہیں۔ وہ صرف اہل قلم نہ تھے، صاحب فکر ونظر عالم وادیب اور صاحب اسلوب اور ایک طرز خاص کے موجد تھے۔ ایسے ذی علم مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا کو علامہ شبلی سے والہانہ لگاؤ تھا۔ دور طالب علمی میں وہ مجالس شبلی کے حاضر باشوں میں تھے اور ایک دو ماہ نہیں ڈھائی برس تک یہ سلسلہ قائم رہا کہ ان کی مجلس میں گھنٹہ دو گھنٹہ ضرور گذارتے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی کے قیام لکھنؤ کے وہ سب سے بڑے واقف کار تھے۔ نہ صرف علمی، تعلیمی، سماجی زندگی کے بلکہ ان کی ذاتی زندگی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ علامہ شبلی کو بھی ان سے بڑا انس تھا۔ علامہ نے انھیں جو خطوط لکھے ہیں اور جو مکاتیب شبلی میں شامل ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کو ان سے قلبی لگاؤ تھا۔ اسی تعلق کی بنا پر سیرۃ النبیؐ کے لئے بامعاوضہ انگریزی کتابوں کے اقتباسات کے ترجمے کرائے۔

مولانا دریابادی نے ان سے فیض یاب ہونے کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ ان کی یادوں کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے اور انھیں اپنا معنوی استاد قرار دیا ہے۔ ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ الحاد سے نکلنے میں علامہ شبلی کی سیرۃ النبی نے بڑی مدد کی۔ اہل علم کی محسن کتابیں میں شامل اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ

> ''سنہ ۷ء میں نیاز مقالات شبلی اور الکلام سے حاصل ہوا اور اسی دم سے جادو مولانا شبلی کا چل گیا۔ تلاش ان کی اور تحریروں کی شروع ہوئی۔ انہیں پڑھتا نہ تھا بلکہ تلاوت کرتا تھا۔ الندوہ والد مرحوم کے نام جاری کرایا۔ پرانے پرچے منگائے۔ تازہ پرچہ کے دن گنا کرتا۔ مولانا کے ہر مضمون کی ایک ایک سطر بار بار پڑھتا۔ فقرے کے فقرے حفظ ہو گئے۔ ترکیبیں زبان پر چڑھ گئیں۔ ہم سنوں سے کہتا پھرتا بلکہ لڑتا پھرتا کہ علامہ شبلی اس دور کے مجدد ہیں۔''
>
> (اہل علم کی محسن کتابیں، ص:۱۲)

مولانا ماجد صاحب ایک زمانہ میں انگریزی تعلیم اور فلسفہ کے زیر اثر الحاد کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ علامہ شبلی کی سیرت النبی نے ان کی قلب ماہیت کی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہاں اسی درمیان مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی جلد اول شائع ہو چکی تھی۔ اسے خوب غور سے پڑھا تھا اور اس سے بھی یہ اثر قبول کیا تھا۔ صاحب سیرت کی رسالت پر ایمان تو اب بھی دور کی چیز تھی، لیکن مارگولیس وغیرہ کے اثر سے نعوذ باللہ جو ایک

خداع اور خونخوار سردار کا تصور قائم ہو گیا تھا، آنکھوں سے یہ زنگ اسی سیرت کے مطالعہ کی برکت سے کٹ چکا تھا اور اس کی جگہ ایک خوش نیت مصلح قوم کے تخیل نے لے لی تھی۔" (اہل علم کی محسن کتابیں، ص: ۱۷)

دار المصنفین کی گولڈن جبلی کے موقع پر انھوں نے جو مقالہ "شبلی، انسان، مصنف، مصنف گر" کے عنوان سے پڑھا تھا اور مزار شبلی کی طرف اشارہ کر کے جس شیفتگی کا اظہار کیا تھا وہ ان کے علامہ شبلی سے والہانہ تعلق کے جذبات کا اظہار تھا۔ یہ مقالہ اس قدر عمدہ مقالہ ہے کہ علامہ شبلی پر لکھنے والوں نے شاید ہی ایسا مقالہ لکھا ہو۔ اس کا مطالعہ ہمارا موضوع نہیں۔ یہاں ہم ان کے ایک دیباچہ کے مندرجات کا ذکر کریں گے جو انھوں نے ادیب شبلی نمبر میں ڈاکٹر ابن فرید کی فرمائش پر لکھا تھا۔ علامہ شبلی کے حوالہ سے یہ ان کی بہترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ علامہ شبلی پر لکھنے والوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور شاید خود ماہنامہ ادیب "شبلی نمبر" کے ناپید ہونے کے سبب ایسا ہوا۔ مولانا دریابادی پر کام کرنے والوں نے بھی اس قیمتی تحریر کی طرف توجہ نہیں دی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی جس زمانہ میں کیننگ کالج لکھنؤ میں فلسفہ کے طالب علم تھے اور علامہ شبلی کی مجلسوں میں حاضر ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں علامہ شبلی کی کتاب الکلام شائع ہوئی اور انھوں نے اس کا مطالعہ کیا اور اس پر "ایک طالب علم" کے نام سے تنقیدی سلسلہ مضامین شروع کیا جو ماہنامہ الناظر لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اس طرح گویا انھوں نے علامہ شبلی کے افکار کا مطالعہ عین شباب ہی میں کر لیا تھا۔ ادیب شبلی نمبر کے دیباچے میں انھوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے برعکس وہ فرماتے ہیں کہ مجھے جو کچھ بھی آیا وہ علامہ شبلی سے سیکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان سطور کے بے علمے راقم کو اردو لکھنا پڑھنا تھوڑا بہت جو کچھ بھی آیا وہ بڑی اور بہت بڑی حد تک فیض انھیں حضرت شبلی کا ہے۔ فیض الندوہ کے ایڈیٹر کا، موازنہ اور شعر العجم کے فن کار کا اور الفاروق، الکلام، سیرۃ النبیؐ کے مصنف کا، اس ذات کا جس میں بیک وقت ایک شاعر و سخن سنج، ایک مورخ و محقق، ایک مبصر و ناقد، ایک عالم و معلم، ایک ادیب و انشاء پرداز، ایک مصنف و اہل قلم کے کمالات جمع تھے۔

باضابطہ شاگردی کی سعادت اس کم سواد کے نصیب میں نہ تھی، لیکن طرز

تحریر کا چربہ اڑانے کی شعوری کوشش مدتوں برسوں کی، چلتے ہوئے فقروں کو نوک زبان کرلیا، ڈھلے ہوئے ترشے جملے ٹھونس ٹھانس حافظہ کے خزانے میں بند کر لئے، عبارتوں کی نقل کیا نقالی کو ایک مستقل مشغلہ بنائے رکھا۔"

(ماہنامہ ادیب شبلی نمبر،ص:۷)

مولانا دریابادی مجالس شبلی میں شرکت کو اپنی خوش نصیبی سے تعبیر کرتے ہیں:

"مزید خوش نصیبی یہ کہ لکھنؤ میں دو ڈھائی سال تک کہنا چاہئے کہ روزانہ سہ پہر کو ہمیشہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے حاضری کی توفیق ہو جاتی رہی، اس مجلس میں عموماً ادبی، علمی، شعری، تنقیدی نکتے بیان ہوتے رہے اور کبھی کوئی تاریخی یا دینی موضوع بھی چھڑ جاتا۔" (ایضاً)

"اپنا معمول تو اس زمانے میں یہ رہا کیا کہ جو شعر کہیں پڑھ کر یا سن کر پسند آ جاتا اسے کسی نہ کسی بہانے مولانا کو ضرور سنا دیتا، اب اگر مولانا نے بھی صاد کر دیا تو بس سند ہاتھ آ گئی اور وہ شعر ٹکسالی ہو گیا اور اگر کہیں مولانا نے بے اعتنائی سے سنا تو اسی دم وہ شعر اپنی نظر سے بھی گر گیا۔" (ایضاً،ص:۸)

علامہ شبلی کا لکھنؤ میں نو برس سے زیادہ قیام رہا۔ وہ کہاں کہاں اور کن مکانات میں رہے اس کی تفصیل علی العموم نہیں ملتی ہے۔ مولانا ماجد صاحب نے اس کی تفصیل لکھی ہے:

"لکھنؤ میں مکان کئی بدلے، پہلے دارالعلوم ندوہ ہی کی عمارت میں محلہ ماموں بھانجہ کی قبر میں رہتے تھے، پھر گوئن روڈ پر ایک بڑے وسیع ولق ودق مکان میں اٹھ آئے، باضابطہ نیاز پہلی بار یہیں حاصل ہوا۔ پھر مرزا حیدر روڈ پر ایک مکان میں نسبتاً چھوٹا مگر ایک آدمی کے لئے پھر بھی بڑا تھا مستقل آ گئے۔ یہ قصہ سنہ ۱۹۰۹ء کا ہوگا۔ مولانا ابوالکلام بھی ایک بار میرے ساتھ آ کر یہاں رہتے تھے، اس وقت ان کا شمار مولانا کے خوردوں میں تھا، مولانا انھیں آزاد کہہ کر آواز دیتے تھے، تین ہی سال بعد ۱۹۱۲ء میں الہلال نکل آیا تو بزرگی وخوردی کی یہ نسبت مساوات میں تبدیل ہوگئی۔ آزاد اب بھی کبھی کبھی لکھنؤ آتے اور مولانا ہی کے پاس ٹھہرتے

رہے، مولانا اب امین آباد پارک (گھنٹہ گھر پارک) میں اٹھ آئے تھے جو نیا نیا بن کر تیار ہوا تھا اور بہت پُر فضا تھا۔ قیام اس کے بالا خانے نمبر ۵۳ پر تھا، ایک پنجرے میں لال طوطے پلے ہوئے تھے اور پنجرا سامنے ٹنگا رہتا تھا۔ اس گستاخ نے پہلی حاضری میں قدم رکھتے ہی کہا ہاں اب یہ مصنف شعرالعجم کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ سالہا سال بعد تک اس بالا خانے کے ساتھ مولانا کی یاد وابستہ رہی۔"

(ایضاً ص:۱۰-۱۱)

علامہ شبلی کے اسلوب نگارش کی خوبی کا سارا زمانہ معترف ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"سلاست، متانت، شستگی، شبلی کے قلم کے جوہر تھے، دقیق بلکہ ادق سے ادق مسئلہ کو لیتے اور شرح و بیان میں اس ہنر مندی سے کام لیتے کہ معمولی استعداد والے کو بھی مسئلہ کے اطراف و جوانب مالہ وماعلیہ پر حاوی ہو جانے کا حوصلہ ہو جاتا، الکلام اور بعض مقالوں میں منطق و فلسفہ اور کلامیات کی اچھی خاصی علمی بحثیں آگئی ہیں۔ شبلی کے قلم کے اعجاز نے ہر جگہ ہنر کو بیان کر دیا ہے۔"

(ایضاً ص:۷)

مولانا دریابادی نے علامہ شبلی کی فارسی شاعری کی بہت تعریف کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ غزل کہتے تو نظیری سے ٹکر لیتے اور کہیں صائب کے رنگ کی بہار دکھاتے۔ معاملہ بندی میں داغ دہلوی [۱۸۳۱-۱۹۰۵ء] کے ہم پلہ تھے۔ غالب [۱۷۹۷-۱۸۶۹ء] کی طرح انھیں بھی اپنی فارسی شاعری کے مقابلہ میں اردو شاعری پسند نہ تھی۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ شاعر سے بڑھ کر سخن فہم تھے۔ ان کی کتابوں پر جو تنقیدیں کی گئی ہیں وہ درست سمت میں نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جس پایہ کے شاعر تھے اس سے بھی بڑھ کر سخن فہم، سخن سنج، ناقد و مبصر تھے۔ موازنہ و شعرالعجم میں وہ نکتہ سنجیاں کی ہیں کہ پڑھنے والا اپنے کو ایک نئے عالم میں پانے لگتا ہے، ان کتابوں پر یہ تنقید عجب سطحی اور بے مغز ہے کہ شبلی کے اصول نقد شعر کے ظاہری لوازم، فصاحت و بلاغت تک محدود ہیں۔ یہ اعتراض تو ایسا ہی

ہے، جیسے کوئی ارسطو کے فلسفہ ونفسیات سے متعلق یہ کہے کہ اس میں (Experimehta Psychology) کے اصول اور ضابطے نہیں ملتے۔ یا بقراط و جالینوس کی عظمت کو یہ کہہ کر کم کرنا چاہے کہ ان کے ہاں دوران خون کا مسئلہ نظر نہیں آتا۔'' (ایضاً ص:۸)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اردو وفارسی شعروادب میں ان کے کمالات کے ذکر کے بعد عربی زبان وادب میں ان کی مہارت کا ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انھیں فارسی وعربی میں نامور اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ

''فصیح عربی تحریر پر بے تکلف قادر تھے اور اس پر شاہد عدل ان کا عربی رسالہ الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی ہے۔ عربیت کا یہ وصف علمائے ہند میں کمتر ہی کسی کے حصے میں آیا ہے۔'' (ایضاً ص:۸)

مولانا دریابادی کا یہ بھی خیال ہے کہ انھیں جس شعبہ میں شہرۂ خصوصی حاصل ہوا وہ تاریخ وسوانح ہیں۔ المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان وغیرہ زمانہ گذرنے کے باوجود ان کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ انھوں نے علامہ شبلی کے تاریخی مقالات اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر اور الجزیہ اور کتب خانہ اسکندریہ جن کے انگریزی میں ترجمے ہو چکے ہیں بہت اہم ہیں۔ بعدازاں علامہ شبلی کی صحافتی خدمات اور اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تصنیف وتالیف کے علاوہ اونچے قسم کی صحافت میں بھی اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ علی گڑھ میگزین کے شعبہ اردو کی ادارت سے قطع نظر کوئی آٹھ سال تک ایک ماہ نامہ اپنے جیب خاص سے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی برائے بیت شرکت سے نکالتے رہے۔ الندوہ علمی صحافت میں اپنا نظیر آپ ہی رہا ہے۔ اردو میں اچھے خاصے رسالے اس سے قبل نکل چکے تھے اور اس وقت بھی موجود تھے، لیکن علمی، تنقیدی، تاریخی مضامین کا یہ شاداب وپُر بہار گلدستہ اپنے رنگ میں سب سے منفرد وکامل رہا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی بلکہ ایک حد تک مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی عبداللہ عمادی کہنا چاہئے کہ اس بلند پایہ

ماہنامہ کے ذریعہ علمی دنیا میں روشناس ہوئے۔ اس میں کسی کا مضمون چھپ جانا ہی اس کے امتیاز وافتخار کے لئے کافی تھا، چہ جائے کہ اس کے نائب مدیر کے منصب پر کسی کا پہنچ جانا اور یہ مرتبہ مولانا کے صرف دو شاگردوں ہی کے نصیب میں آیا۔" (ایضاً،ص:۸-۹)

مولانا عبدالماجد دریابادی علامہ شبلی کی جامع کمال شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ علامہ شبلی کی ساری حیثیتوں میں سب سے بڑی حیثیت ان کی مذہبی حیثیت ہے۔ الکلام، علم الکلام، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرۃ النعمان اور سیرۃ النبیؐ سب مذہبی کتابیں ہیں، یہاں تک کہ انھوں نے شعرالعجم کا آغاز بھی اسلام کے ابرکرم سے کیا وہ لکھتے ہیں:

"مذہب کے اجزاء میں کلامی حصہ سب سے غالب تھا، اسلام کی تائید ونصرت، اسلام کا غلبہ، وقت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اپنی زبان وقلم کے ہر لفظ سے دیکھنا چاہتے تھے، انگریزی دانوں سے مل کر ان سے معلومات اخذ کرتے۔ انگریزی کتابوں اور مقالوں کے ترجمے کرا کے سنتے اور پڑھتے، ہر طرح اس ٹوہ میں رہتے کہ اسلام پر مستشرقین کے اعتراضات کس کس نوعیت کے ہیں اور ان کے جواب میں کیا کیا پہلو اختیار کئے جاسکتے ہیں۔

تصنیف ومقالہ نگاری پر قانع نہ ہو کر تعلیم وتدریس کے بھی پہلو ڈھونڈا کرتے۔ چنانچہ خود مدرسہ ندوہ اسی خیال کا علمی ظہور تھا۔" (ایضاً،ص:۹)

علامہ شبلی کا ایک بڑا عظیم الشان کارنامہ ندوۃ العلما کی تعمیر وترقی اور اس کا فروغ تھا، دراصل یہی ان کے نقطۂ نظر کا ترجمان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لئے انھوں نے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ مولانا دریابادی نے لکھا ہے کہ

"مدرسہ ندوہ اور اس کے سارے متعلقات سے اتنا انہماک تھا کہ اب گویا یہی ان کی زندگی کا مشغلہ یا مقصود ہو کر رہ گیا تھا، یہ اور کہنا چاہئے کہ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۲ء تک شدومد سے قائم رہا، تا آنکہ مولانا ایک اور بھی اہم وعظیم الشان دینی خدمت

یعنی تالیف سیرۃ النبیؐ میں مشغول ہو گئے، اور پھر معاملات مدرسہ کی پیچیدگیوں
سے تنگ آ کر لکھنؤ ہی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔" (ایضاً)

سچ تو یہ ہے کہ ندوہ ان کے ذہن سے آخری سانس تک نہ نکلا۔

مولوی عبدالحق نے ان کو بے ضبط، اکھل کھرا، تنگ مزاج اور نہ جانے کن کن الفاظ سے یاد کیا ہے، مگر ان کے تمام تلامذہ نے ان کی شفقت و مروت اور حلم و بردباری کا ذکر کیا ہے۔ اب ایک چشم دید کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

"مزاج میں حدت و حرارت کے باوجود بڑی لطافت، بڑی مروت تھی اور شاگردوں اور خوردوں کے حق میں مجسم شفقت و عنایت تھے، زاہد خشک نہ تھے، دنیا کی رنگینیوں سے بھی حدود کے اندر لطف لیتے تھے، بعد کو معاندین نے بعض خطوط کی آڑ لے کر اس بات کا بتنگڑ بنا دیا۔" (ایضاً)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے معاصر شخصیات سرسید، حالی، محمد حسین آزاد، محسن الملک، اکبر الہ آبادی وغیرہ کی خوبیوں کا قائل بتایا ہے اور ان کی وسعت قلبی کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے مثال میں حیدرآباد میں عماد الملک سید حسین بلگرامی، سید حسن بلگرامی اور لکھنؤ میں مرزا عزیز لکھنوی اور ان کے باقیات الصالحات سے گہرے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح علامہ شبلی نے دو کاتب رکھے اور دونوں شیعہ تھے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اور نواب سید علی حسن خاں سے اخلاص تھا۔ مراسم مولوی عبدالحلیم شرر، خواجہ غلام الثقلین اور مرزا ہادی رسوا سے بھی رہے بلکہ ایک زمانہ تک رہے۔ اس کے بعد مولانا دریابادی نے ان کے رہن سہن اور طرز معاشرت کا ذکر کیا ہے، تصنیف و تالیف کے معمولات بیان کئے ہیں جو سننے کے لائق ہیں:

"صبح سویرے اٹھتے، کچھ ٹہلتے اور گنگناتے اور اس کے بعد قلم دوات سے دو چار صفحہ فل اسکیپ سائز کے لکھ ڈالتے اور مسودہ میں کاٹ پیٹ اچھی خاصی کرتے جاتے، معمولاً دو گھنٹہ سے زیادہ تصنیفی کام نہ کرتے۔ دن کا باقی وقت مطالعہ اور کتابوں کی الٹ پلٹ میں گذارتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب تک طبیعت تازہ دم رہے بس اسی وقت تک لکھو۔" (ایضاً ص: ۱۰)

علامہ شبلی چائے بہت گرم پیتے اور پانی بہت ٹھنڈہ۔ بعض لوگوں نے اس سے ان کے مزاج میں انتہا پسندی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا دریابادی نے بھی ان دونوں خصوصیات کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں اپنی ایک دعوت کا ذکر کیا ہے:

''برف کا معمول تو شاید کسی موسم میں بھی ترک نہ تھا، دسمبر ۱۹۱۳ء تھا اور سردی خوب پڑ رہی تھی، ایک دوست کی فرمائش پر شب کا کھانا کھانے کے لئے میں اپنے ہاں مولانا کو زحمت دی، عزیز لکھنوی، برج نرائن چکبست لکھنوی، اور پنڈت بشن نرائن بھی مدعو تھے۔ چکبست صاحب نے فرمائش کرا بھیجی کہ مرغ مسلم ضرور ہو، تعمیل کردی گئی، برف کی طرف کسی کا ذہن بھی نہ گیا جس کی بنا پر مولانا نے برف کی فرمائش کردی، میزبان شرم سے گڑ کر رہ گیا۔ دسمبر کی اتنی سردی میں نو بجے شب کو برف اس محلہ میں تو خیر کیا ملتی کئی میل بھی آدمی دوڑانے کے بعد ملنا مشکل ہی تھا۔'' (ایضاً ص: ۱۰)

شدید ٹھنڈے پانی کا تو معمول تھا ہی، چائے بھی خوب تیز اور کثرت سے پیتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''چائے کثرت سے اور خوب تیز پیتے اور اس کا سلسلہ فجر سے قبل ہی شروع ہو جاتا، بیوی کا انتقال کئی سال قبل ہو چکا تھا، لکھنؤ میں تنہا رہتے۔ ملازم کو سردی کے موسم میں صبح تڑکے چائے کے لئے پکارتے، وہ بیچارہ کڑکڑا کے رہ جاتا۔ چائے کے ساتھ دودھ کا التزام نہ تھا، البتہ شکر پیالی میں ڈالنے کے علاوہ چمچے سے بھی پھانک جاتے، مٹھائی سے بڑی رغبت تھی اور میٹھاس خوب چاہتے اور رساول کے تو رسیا تھے۔ آخر میں غذا بہت قلیل رہ گئی تھی، قبل مغرب ہم لوگوں کے ساتھ بازار سے دو قلچے اور ایک آدھ کباب منگا کر کھا لیتے اور یہی رات کا کھانا ہو گیا۔'' (ایضاً)

یہ دور کئی لحاظ سے ان کی صحت کے لئے اچھا نہیں رہا۔ ندوہ کے لئے رات دن تگ ودو، الندوہ کی ادارت، سیرۃ النبیؐ کی فکر، مخالفتوں بلکہ ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا مقابلہ اور پھر بھائی

کی وفات نے تو گویا انھیں زندہ ہی در گور کر دیا تھا۔ان کے آخری دور کا نقشہ مولانا دریابادی کی زبان سے سنئے۔وہ لکھتے ہیں:

''سن کے لحاظ سے تو کچھ ایسے ضعیف اب بھی نہ تھے۔کل ۵۶ سال کا سن تھا، البتہ ایک تو محبوب وعزیز حقیقی بھائی کی وفات اور پھر ندوہ کے سلسلہ میں مخالفت اور ناکامی نے مل ملا کر قویٰ پر یہ اثر ڈال دیا تھا کہ اصل سن سے دس بارہ سال بڑے معلوم ہونے لگے تھے اور طبیعت پر یاس واضمحلال دونوں کا غلبہ ہو گیا تھا، اس پر بھی وطن اعظم گڑھ جا کر بے کار نہ بیٹھے بلکہ اس ادارہ عظیم کی طرح ڈال دی جسے بعد کو خوب چمکایا اور فروغ دینے کی سعادت سیرۃ النبیؐ ہی کی تکمیل کی طرح شاگرد رشید وجانشین سلیمان ندوی کے نصیب میں لکھی ہوئی تھی۔کام کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ داعی اجل کا پیغام آپہنچا اور چند روز علالت کے بعد کل ۵۷ سال کی عمر میں نومبر ۱۹۱۴ء میں شبلی نعمانی حجۃ الاسلام بن کر اور کہلا کر اپنے مولا کے حضور پہنچ گئے۔'' (ایضاً،ص:۹)

۱۹۲۴ء میں ماہنامہ الناظر لکھنؤ کے ایڈیٹر ظفر الملک علوی نے 'اردو کا بہترین انشاپرداز کون' کے عنوان سے ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کیا۔چنانچہ اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے گئے جو پہلے الناظر میں شائع ہوئے، پھر کتابی صورت میں یکجا چھپے۔اس انعامی مقابلہ میں اعظم گڑھ کے ایک فرزند سعید انصاری جو اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم تھے،ان کا مقالہ ''مولانا شبلی اردو کے بہترین انشاپرداز'' منتخب ہوا اور الناظر کی طرف سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔اس کا دو صفحے کا دیباچہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے ہے،اس کا ایک اقتباس قابل توجہ ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک عناصر خمسہ (بشمول سید صاحب) میں سے ہر عنصر بجائے خود پوری اہمیت رکھتا ہے اور اپنے خصوصیات کے لحاظ سے بے نظیر ہے،ایک مرتب ومنظم سلسلہ ہے،کسی ایک کڑی کو بھی اگر بیکار یا ناقص قرار دیا جائے تو سارا سلسلہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔مولانا شبلی سب سے آخر میں ہوئے اس لئے قدرتاً ان کا رنگ سب سے زیادہ شستہ ہے اور علمی تحریروں کے لئے اب تک ان سے بہتر کوئی

نمونہ اردو میں موجود نہیں۔'' (مولانا شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز، دیباچہ ص۲)
اور واقعی آج علمی تحقیقات و مطالعات میں انھیں کا انداز تحریر رائج ہے۔

زندگی نامہ شبلی کا ایک نمایاں باب ان کی مکتوب نگاری ہے۔ اس پر بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔ سب سے پہلے جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کے خطوط دو حصوں میں مکاتیب شبلی کے نام سے شائع کئے۔ بعد ازاں منشی محمد امین زبیری نے فیضی خواتین کے نام کے مکاتیب ''خطوط شبلی'' کے نام سے شائع کئے۔ پروفیسر محمد حسنین نے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کے خطوط کتابی صورت میں شائع کئے۔ اس کے بعد ناچیز نے مکتوبات شبلی اور مراسلات شبلی مرتب کئے، جسے دارالمصنفین نے شائع کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی کتاب مشاہیر کے خطوط میں اپنے نام کے علامہ کے خطوط شائع کئے ہیں اور ان پر حواشی بھی لکھے ہیں۔ اس کے دیباچہ میں مکاتیب شبلی بنام دریابادی کی تفصیل خود ہی بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''بجز پہلے خط کے یہ سارے خط مولانا کی زندگی کے آخری دور کے ایک مختصر زمانہ کے ہیں۔ یعنی نومبر ۱۹۱۳ء سے لے کر جولائی ۱۹۱۴ء تک کل نو مہینہ کی مدت کے۔ مولانا اس زمانہ میں سیرت النبی کی تالیف میں مشغول بلکہ منہمک تھے۔ اور ندوہ کے اندرونی اختلافات سے ملول و مایوس ہو کر اس سے گویا ہٹتے جارہے تھے۔ خطوط میں ان دونوں چیزوں کے اثرات قدرتاً نمایاں ہیں۔''
>
> (خطوط مشاہیر، ص:۹)

---

(۶۹)

صاحبزادہ ظفر حسین خاں

[۱۸۹۲-۱۹۶۱ء]

صاحبزادہ ظفر حسین خاں اردو کے انتہائی ممتاز اہل قلم تھے۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں فلسفہ کی تعلیم پائی تھی۔ اور فلسفہ پر ان کی نظر گہری تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی طرح یہ بھی علامہ شبلی

کے صحبت گزیدہ اور مجلس شبلی کے حاضر باشوں میں تھے۔فلسفہ ان کا خاص موضوع مطالعہ تھا۔متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے کئے جو علمی حلقوں میں خاصے پسند کئے گئے۔انواع فلسفہ، مقالہ روسو، مآل ومشیت، ذہنی امتحانات، خونی تعلیم وغیرہ ان کی تصانیف اوتراجم کے نام ہیں۔مآل ومشیت پرجسے دارالمصنّفین نے شائع کیا ہے ۱۹۵۵ء میں انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔یہ اردو کے پہلے ادیب تھے جنہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔

ظفر حسین خاں علامہ شبلی اور دارالمصنّفین کے بڑے قدردانوں میں تھے۔اپنی مختصر گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مختصر گوئی کا یہ مرض نہایت کہنہ ہے۔سب سے پہلے ابتدائے زندگی ہی میں علامہ شبلی مرحوم نے اس کے مہلک نتائج پر متنبہ لیا تھا۔میرا طالب علمی کا زمانہ تھا جو مضامین رسائل میں لکھتا تھا علامہ مرحوم کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔خدمت میں حاضری کا وقت دوپہر مقرر تھا، اس لئے کہ صبح کے وقت علامہ مرحوم سیرت نبویﷺ کی تالیف میں مشغول رہتے تھے۔اور شام کو اس شمع علم وادب کے گرد پروانوں کا ہجوم ہوتا تھا۔علامہ موصوف مسہری پر لیٹے ہوتے اور میں فرش پر زانوے ادب تہہ کئے اپنا کوئی مضمون سناتا ہوتا۔ایک روز اخلاقیات پر مضمون جو ادیب الہ آباد میں شائع ہوا تھا پڑھ رہا تھا۔پڑھتے وقت مجھے بھی محسوس ہوا کہ وہی تار والی عبارت ہے جس پر علامہ مرحوم کئی بار ٹوک چکے ہیں۔جب میں مضمون سنا چکا، علامہ مرحوم نے دریافت فرمایا کہ سرسید کے مقالات اور خطبات (جن کے پڑھنے کی پہلے فہمائش کی جاچکی تھی) پڑھے یا نہیں۔جو کچھ پڑھا تھا عرض کیا۔ارشاد ہوا ''سرسید کو بار بار پڑھو۔ان سے بہتر بات کھول کر اردو میں بیان کرنے والا دوسرا نہ پاؤ گے۔'' کچھ فارسی تراکیب کی بندشیں سست تھیں، اس سلسلہ میں سہ نثر ظہوری کا نسخہ تجویز فرمایا۔'' (مآل ومشیت، ص:۲)

مقالہ روسو کا انہوں نے ترجمہ کیا تو اسے بھی دارالمصنّفین نے اہتمام سے شائع کیا۔وہ علامہ شبلی اور دارالمصنّفین سے کس درجہ تعلق رکھتے تھے۔اس کا ذکر مقدمہ میں خود انہی کے قلم سے

آ گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''روسو اگر آج زندہ ہوتا تو اس کو اپنی خوش نصیبی پر آپ رشک آتا کہ اگر اس کا اصل رسالہ فرانس کی ایک ممتاز انجمن کی بارگاہ علم میں مقبول ہوا تھا تو اس کا ترجمہ ہندوستان کی ممتاز بزم فضل یعنی دارالمصنفین کی جانب سے شائع ہو رہا ہے۔

صید از حرم کشد خم جعد بلند تو

انصاف کا خون ہوگا اگر اس موقع پر روسو کا مترجم دارالمصنفین کی اس علمی رواداری کے اعتراف میں ادائے شکر سے قاصر رہے، اگر دل کا راز بتانا کچھ بیجا نہ ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ جذبات کا تقاضا تو یہاں تک تھا کہ یہ ترجمہ بانی انجمن ہذا کے نام نامی کے ساتھ معنون کر دیا جاتا، لیکن مشکل یہ تھی کہ ''علم'' پرچوں کا ایک علامہ کی ذات کے ساتھ انتساب عقیدت مندی کی نظر میں گویا علم کے دیوتا سے گستاخانہ ٹھٹھول کا کم از کم پہلو رکھتا تھا۔ پس اس احتیاط نے ضبط جذبات فرض کر دیا، ورنہ یہ ترجمہ علامہ شبلی نعمانی کے برگزیدہ نام کے ساتھ منتسب کر دیا جاتا۔''

(مقالہ روسو، ص: ۵-۶)

ہائے! زمانہ اب ایسے استاد اور قدرداں کو ترسے گا اور چراغ رخ زیبا لے کر ڈھونڈے گا تب بھی نہ پائے گا۔

---

(۷۰)

ڈاکٹر سید محمد یوسف الدین

[...]

ڈاکٹر سید محمد یوسف الدین ایم اے۔ پی ایچ ڈی، استاد شعبہ اسلامی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد صوبہ دار گلبرگہ بڑے لائق و فائق شخص تھے۔ متعدد کتابیں نادر موضوعات پر قلم بند کیں۔ الخط الاسلامی، اسلام کے معاشی نظریے (دو حصے)، سیرت طیبہ پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے عثمانیہ یونیورسٹی

میں لکچر، ان کی مشہور تصنیفات وتالیفات ہیں۔انہوں نے فارسی میں ایک تقویم بھی تیار کی تھی اور اس کا کچھ حصہ ماہنامہ الندوہ میں علامہ شبلی کے پاس اشاعت کی غرض سے بھیجا تھا۔خدا معلوم وہ تقویم شائع ہوئی یا نہیں۔

نواب سید تاج الدین نے نواب اقبال یار جنگ کی سوانح پر دو حصوں میں کتاب لکھی ہے۔اس کا نام ''اقبال یار جنگ: علمی وسماجی خدمات'' ہے۔اس کے پہلے حصہ کا مقدمہ ڈاکٹر سید محمد یوسف الدین صاحب سابق صدر شعبہ مذہب وثقافت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے قلم سے ہے۔ان سے علامہ شبلی سے روابط اور خط کتابت کا سلسلہ بھی تھا۔

اہل علم واقف ہیں کہ نواب اقبال یار جنگ سے علامہ شبلی کے علمی تعلقات تھے۔اس کا آغاز اس وقت ہوا جب علامہ شبلی روم ومصر وشام کے سفر سے واپس آئے اور سفرنامہ لکھا اور سفرنامے میں نواب اقبال یار جنگ اور دائرۃ المعارف العثمانیہ کا ذکر کیا۔محمد یوسف الدین صاحب نے اپنے دیباچہ میں علامہ شبلی کا وہ اقتباس نقل کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی کے دل سے یہ بات نکلی تھی۔نواب اقبال یار جنگ کے دل میں اتر گئی اور نواب اقبال یار جنگ معتمد بنے تو انہوں نے ان نادر کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا جن کی طباعت کی جانب مولانا شبلی مرحوم نے نواب اقبال یار جنگ مرحوم کی توجہ مبذول کرائی تھی۔''

(اقبال یار جنگ: علمی وسماجی خدمات حصہ اول، ص:۶)

مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی حیات شبلی میں لکھا ہے کہ دائرۃ المعارف سے علامہ شبلی نے جو توقعات کی تھیں وہ بالآخر پوری ہوئیں۔

پروفیسر محمد یوسف الدین نے یہ بھی لکھا ہے کہ دائرۃ المعارف کی مطبوعات دنیا کے بڑے بڑے اہل علم اور ارباب کے سامنے فخر سے پیش کی گئیں۔اسی طرح بغداد، دمشق، بیروت اور استنبول یونیورسٹیوں کے علمی حلقوں میں بھی ان کی بڑی پذیرائی ہوئی۔اس کامیابی کا سہرا پروفیسر محمد یوسف الدین نے مولانا شبلی نعمانی، نواب اقبال یار جنگ اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے سر باندھا ہے۔(ایضاً، ص:۷)

نواب اقبال یار جنگ کے صاحبزادے نے بھی کتاب کے مقدمہ علامہ شبلی کے سفرنامہ روم ومصروشام کا ذکر کیا ہے اور پروفیسر محمد یوسف الدین ہی کے حوالہ سے کیا ہے۔ (ایضاً،ص:۱)

---

(۷۱)

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی

[۱۸۹۲-۱۹۶۸ء]

گیارہ بارہ جلدوں پر مشتمل تاریخ ملت کے مصنف مولانا مفتی انتظام اللہ شہابی مدیر دائرہ معارف قرآنیہ آگرہ، اپنے عہد کے ممتاز عالم اور علم وادب کے تابندہ ستارے تھے۔ ان کا شمار اردو کے نامور اہل قلم اور ممتاز مصنفین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کی تعداد ۱۲۹ر لکھی ہے۔ ان میں تاریخ ملت، انشائے بے خبر، داعی اسلام، خواجہ معین الدین چشتی، لطائف الشعرا، حیات خواجہ، غدر کے چند علما، فاطمہ کا لال، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ماہتاب اجمیر، جغرافیہ قرآن، غالب کے لطیفے، علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستان، مشاہیر جنگ آزادی، سلاطین اندلس، حیات علامہ فضل حق خیرآبادی، خلافت ہسپانیہ، ملکہ ممتاز محل، بزم آخر اور قافیہ سنجان اکبر آبادی وغیرہ کتابیں شامل ہیں۔

اکبرآباد، آگرہ ان کا وطن تھا۔ یہیں پیدا ہوئے اور یہیں تحصیل علم کیا اور یہیں علمی وادبی خدمات انجام دیں اور انجمن اسلامیہ آگرہ کے صدر منتخب رہے۔ ۱۹۴۹ء میں ہجرت کر کے کراچی میں جا بسے تھے۔ وہاں کچھ دنوں ماہنامہ انجمن اسلامیہ میگزین کی ادارت کے فرائض انجام دئے۔

مفتی شہابی نے شہزادی زیب النساء کی مفصل سوانح عمری سپرد قلم کی ہے جو خاصی ضخیم ہے۔ زیب النساء پر علامہ شبلی نعمانی کا بھی ایک رسالہ متعدد اشاعتی اداروں سے شائع ہوا ہے۔ اس کے بارہ میں مفتی صاحب لکھتے ہیں:

> ''شہزادی زیب النساء مرحومہ کی چند سوانح عمریاں نظر سے گذریں ان میں سے رسالہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کا تو محققانہ ہے۔ باقی ہر ایک خرافات کا مجموعہ

ہے۔'' (سوانح عمری شہزادی زیب النساء، ص:۱)

---

(۷۲)

میاں بشیر احمد

[۱۸۹۳-۱۹۷۱ء]

میاں بشیر احمد بی اے آکسن، بیرسٹر، مدیر ہمایوں لاہور بڑے پایہ کے ادیب اور ممتاز اہل قلم تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں کچھ عرصہ تاریخ کے استاد رہے۔ کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں ''مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل'' اور ''طلسم خیال'' نے بڑی مقبولیت پائی۔ انگریزی میں اپنے والد جسٹس شاہ دین ہمایوں کی سوانح بھی لکھی۔ ۳۵ برس [۱۹۲۲ - ۱۹۵۷ء] تک ہمایوں کو جاری رکھا، جس نے اردو زبان وادب کی بڑی خدمات انجام دیں۔ وہ الفاروق سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''وہ کتاب جس نے اوائل عمر میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا شبلی کی الفاروق تھی۔ اسلام، تاریخ، کہانی، سیاست، راست بازی، اس میں یہ سب کچھ تھا، گویا لڑکپن میں مجھے ایک رہنما مل گیا۔ میں نے جانا بس یہی اسلام ہے۔ برسوں گذر گئے، کئی مرتبہ الحاد نے کامیابی کے ساتھ میرے دماغ پر حملہ کیا، لیکن دل جس الفاروقی رنگ میں پہلی عمر میں رنگا جا چکا تھا وہ رنگ کچھ نہ کچھ باقی رہا۔ ایک تو عمر ایسی تھی کہ جو اثر پڑا وہ مٹ نہ سکا اور دوسرے کتاب بھی ایسی عظیم الشان تھی کہ جب میرے ایک دہلوی ادیب دوست نے اس پر دو سال ہوئے نکتہ چینی کی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مجھ پر ذاتی حملہ کیا گیا ہے۔ سیرۃ النبیؐ پڑھنے کے بعد بھی میری پسند کی کتاب الفاروق ہی رہی۔ حضرت عمرؓ کا وہ صحرا میں اپنے غلام کو اونٹ پر بیٹھا کر اس کے آگے آگے چلنا، وہ راتوں کو گشت کرنا، وہ ایک بڑھیا کا دلیری سے کہنا اتق اللّٰہ یا عمرؓ، اسلام کا وہ دو بڑی سلطنتوں پر چھا جانا، ان کا اثر آج تک

طبیعت سے زائل نہیں ہوا۔'' (اہل علم کی محسن کتابیں، ص:۵۳)

---

(۷۳)

میمونہ سلطان شاہ بانو

[۱۸۹۴-۱۹۶۰ء]

آخری فرماں روائے بھوپال نواب حمید اللہ خاں کی بیگم میمونہ سلطان شاہ بانو نے علامہ شبلی کے عربی رسالہ ''بدء الاسلام'' کا اردو میں ''آغاز اسلام'' کے نام سے ترجمہ کیا جو مطبع سلطانی بھوپال سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ''سیرت طیبہ'' کے عنوان سے ۱۹۴۰ء میں یونیورسل بکس لاہور نے شائع کیا۔ میرے پیش نظر طبع اول ''آغاز اسلام'' ہے۔ اس میں وہ گذارش کے عنوان سے لکھتی ہیں:

''عرصہ سے میرا خیال تھا کہ میں اپنی بہنوں کی کوئی مذہبی خدمت انجام دوں۔ علیا حضرت کو بھی میرا یہ ارادہ معلوم تھا، اس بنا پر حضور ممدوحہ شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کے رسالہ بدء الاسلام کا ترجمہ فارسی عطا فرما کر ارشاد فرمایا کہ میں اس کا اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرادوں، چنانچہ میں نے ترجمہ شروع کر دیا اور الحمد للہ کہ اب وہ شائع ہو رہا ہے۔

اس مختصر رسالہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک کے سلسلہ وار حالات نہایت اختصار کے ساتھ درج ہیں، جن سے عام مسلمان بچوں کو واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔

میں اس کتاب کی ناظرات سے یہ بھی امید رکھتی ہوں کہ وہ مطالعہ کرتے وقت سرکار عالیہ، مولانا مرحوم اور مجھ کو ضرور دعائے خیر سے یاد کریں گی۔''

(آغاز اسلام، ص:ہ)

یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے کہ کسی فرمانروا نے تصانیف شبلی کا اثر لیا ہو۔ اس سے پہلے

افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ کی والدہ نے الفاروق کا فارسی میں ترجمہ کیا اور بڑے اہتمام سے کابل سے شائع کرایا۔ تفصیل ملاحظہ ہو راقم کی تصنیف ''تصانیف شبلی کے تراجم''۔

---

(۷۴)

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی

[۱۸۹۴-۱۹۷۳ء]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے سابق صدر پروفیسر ضیاء احمد بدایونی علامہ شبلی سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے علامہ کی تاریخی اور واقعاتی شاعری کا تتبع کیا بلکہ وہ اس میدان میں سب سے بڑے متبع تھے۔ علامہ سے متاثر ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ تذکار سلف علامہ شبلی کے نام معنون کیا ہے۔ اس سے ان کی شیفتگی شبلی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

علامہ شبلی کے تتبع کا آغاز اس طرح ہوا کہ وہ لسان العصر اکبر الہ آبادی کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ بزم اکبر کے مصنف قمر بدایونی [۱۸۹۱-۱۹۷۹ء] نے ان کا تعارف کرایا تو اکبر نے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ چنانچہ انھوں نے ایک نظم سنائی، جسے سن کر اکبر نے فرمایا:

> ''بالکل ہمارے شبلی کا سا رنگ ہے۔ کاش آپ اس کو کسی کارآمد مصرف میں استعمال کرتے۔'' (تجلیات، ص:۴)

اس واقعہ کے بعد ضیاء احمد بدایونی نے علامہ شبلی کے سلسلہ منظومات کو آگے بڑھایا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس واقعے کے بعد راقم کو علامہ شبلی کی تقلید میں تاریخ اسلام کے سبق آموز واقعات نظم کرنے کا خیال ہوا، چنانچہ متعدد نظمیں، قطعہ یا مثنوی کی شکل میں تحریر کیں جو ملک کے مشہور رسائل میں شائع ہو کر خواص وعوام میں مقبول ہوئیں۔''
>
> (ایضاً ص:۴-۵)

ضیاء احمد بدایونی کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کا پیش لفظ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مقدمہ مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی مرحوم پہلے شخص تھے جنھوں نے آج سے پندرہ سال قبل اس قسم کا سلسلہ نظم اردو میں صحیح اصول پر شروع کیا اور سرور کائناتؐ، صحابہ کرامؓ ومشاہیر تاریخ اسلام کے بیسیوں واقعات دلکش انداز میں نظم کرڈالے۔ مرحوم کے بعد ان کے تتبع میں کہنے والے متعدد پیدا ہوئے، لیکن اس طرز میں اس رسالے کے مؤلف سے زیادہ کامیاب میں نے اب تک کسی کو نہیں پایا۔ انھوں نے نہ صرف نوعیت عنوانات میں بلکہ انداز بیان، نشست الفاظ، بحور نظم، مصرعوں کی ترکیب، غرض ہر شے میں مولانا شبلی کا چربہ اتار لیا ہے اور اس کامیابی پر وہ مستحق تہنیت ہیں۔'' (تجلیات، ص:۶)

''تجلیات'' میں ان کے پہلے مجموعہ نظم ''تذکار سلف'' کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ اس کے مرتب ان کے لائق صاحبزادے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ہیں۔ مگر اس میں مولانا دریابادی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے مقدمے شامل نہیں ہیں۔ اسے آزاد کتاب گھر دہلی نے شائع کیا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں ضیاء احمد بدایونی کا کلیات شائع ہوا تو اس میں بھی یہ تحریریں شامل نہیں کی گئیں۔ بہر حال ''تجلیات'' میں اثرات شبلی کی نشاندہی پر اب تک کوئی تحریر سامنے نہیں آئی ہے۔

---

(۷۵)

مولانا سعید انصاری نشترؔ

[۱۸۹۴-۱۹۶۲ء]

مولانا سعید انصاری بڑے عالم، فاضل، ادیب، شاعر اور محقق ومصنف تھے۔ وہ مختلف اداروں سے وابستہ رہے۔ دارالمصنفین کی رفیق رہے اور بڑی معرکہ آرا کتابیں لکھیں۔ سلسلہ

سیر الصحابہ کی کئی جلدیں ان کے قلم سے وجود میں آئیں۔ وہ شاعر تھے اور اردو فارسی دونوں میں داد سخن دیتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ''جمالیاتی شاعری'' طبع ہو چکا ہے۔ ناچیز نے ان کی شخصیت اور خدمات پر دو مقالے لکھے ہیں اور دونوں میرے مضامین کے مجموعوں میں شامل ہیں۔

انہیں علامہ شبلی سے بڑی عقیدت تھی۔ فرماتے ہیں:

ہزار آواز و پیش طوطی ہندوستانی آید
سخن دانی وخوش خوانی بر شبلی نعمانی آید

آخر میں مولانا سعید انصاری صاحب دائرہ معارف اسلامی سے وابستہ ہو کر لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہاں انہوں نے علامہ شبلی سے منسوب ایک ادارہ ''شبلی مرکز'' قائم کیا۔ اور ان کے نام پر ایک سہ ماہی رسالے کے اجرا کا بھی اعلان کیا۔ شبلی مرکز سے شائع دو ایک کتابیں راقم کی نظر سے گذری ہیں۔ البتہ مجلّہ ''شبلی'' کا کوئی شمارہ نہیں دیکھا۔ اس سے ان کی عقیدت شبلی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

علامہ شبلی کا تحقیقی مقالہ الجزیہ دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ اور دوسری زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہوئے۔ مولانا سعید انصاری نے بھی اسی نام یعنی'' الجزیہ'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے۔ اس کی تمہید میں لکھا ہے کہ

> ''جزیہ کے متعلق غیر مسلموں میں مدتوں سے جو غلط فہمی چلی آ رہی تھی اس کو سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے الجزیہ لکھ کر دور کیا۔ لیکن اس کے بعض پہلو تشنہ تحقیق تھے، اس مضمون میں تمام ضروری پہلوؤں پر مفصل بحث کر کے جزیہ کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔'' (الجزیہ، ص:۱)

''الجزیہ'' لکھتے ہوئے علامہ شبلی کے پیش نظر مخالفین جزیہ اور ان کے الزمات تھے۔ اس لئے بہت سے ایسے پہلو جو جزیہ اور اس کے متعلقات سے تھے وہ قلم بند ہونے سے رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر سعید انصاری استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے رسالہ میں ان کا اضافہ کر دیا ہے۔ اسے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے شائع کیا ہے۔

---

(۷۶)

پروفیسر نصیر الدین ہاشمی

[۱۸۹۵-۱۹۶۴ء]

پروفیسر نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو کے نامور اہل قلم اور مصنف و محقق گذرے ہیں۔ انہوں نے سیکڑوں کتابیں لکھیں یا مرتب کیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ماہنامہ سب رس حیدر آباد کا نصیر الدین ہاشمی نمبر۔

پروفیسر نصیر الدین ہاشمی صاحب نے امجد حیدر آبادی کے مکاتیب ''مکتوبات امجد'' کے نام سے شائع کیا۔ اور اس پر ایک بہت عمدہ اور مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے علامہ شبلی کے مجموعہ خطوط مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''۱۔ مکاتیب شبلی: مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے دار المصنفین کی جانب سے ان کو شائع کیا ہے۔ یہ خطوط اپنے ادبی، علمی، تاریخی، اخلاقی اور سیاسی حیثیت سے زبان اردو میں ایک رائے خاص درجہ رکھتے ہیں۔
>
> ۲۔ مولانا شبلی کے خطوط موسومہ عطیہ بیگم فیضی ایک علاحدہ رسالے میں شائع ہوئے ہیں۔ اس پر مولوی عبد الحق صاحب بی اے معتمد انجمن ترقی اردو نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔
>
> یہ خطوط مولانا شبلی کی سیرت کے ایک خاص حصہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور عورتوں سے متعلق مولانا کے جو خیالات تھے ان کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ خاتون کی صحبت کا کس قدر عمدہ اثر ہوتا ہے۔''
>
> (مکتوبات امجد، ص:۳-۴)

پرنسپل عبد الشکور نے اپنی کتاب تنقیدی سرمایہ میں لکھا ہے کہ ان کی ''سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی نے شبلی مرحوم کی تصانیف سے بہت گہرا اثر قبول کیا ہے کہ یہی تصانیف مدت تک ان کے مطالعہ میں رہیں۔ (اردو ادب میں تنقیدی سرمایہ، حصہ دوم، ص:۱۹۲)

(۷۷)

مولانا غلام رسول مہر

[۱۸۹۵-۱۹۷۱ء]

علامہ شبلی نعمانی کا مشہور مقالہ ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' کا ایک ایڈیشن مولانا غلام رسول مہر کے مقدمہ کے ساتھ لاہور سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا ہے۔ جسے آئینہ ادب لاہور نے مولانا غلام رسول مہر کی وفات کے بعد شائع کیا۔ مہر صاحب نے اس مقدمہ میں عالم گیر کے ولادت سے وفات تک کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ اس میں علامہ شبلی کا دو جگہ ذکر آیا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح کیا ہے:

> ''عالم گیر اعظم کے متعلق مولانا شبلی مرحوم کی کتاب کے بعد مختلف اصحاب کے تاثرات میں خاصی اصلاح ہوگئی، تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی ایسے لوگ بہ کثرت ہیں جنھیں اس عظیم القدر شخصیت کی حقیقی حیثیت یا اس کی عظمت کے مبانی کا کوئی صحیح اندازہ نہیں۔''
>
> (اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص:۵، لاہور ۱۹۷۲ء)

خدا جانے کس کی اصلاح ہوئی۔ آج بھی عالم گیر کے مفروضہ مظالم کی داستان بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ یہاں تک کہ حال ہی میں اسی بنا پر دہلی میں اورنگ زیب روڈ کا نام بدل دیا گیا ہے؛ دراصل اس میں ہم سے کوتاہی ہوئی، جس وقت علامہ شبلی نے یہ رسالہ لکھا تھا اسی وقت اس کا ترجمہ کم از کم ہندی اور انگریزی میں ہو جانا چاہئے تھا اور اسے ہر پڑھے لکھے شخص تک پہنچانا چاہئے تھا، مگر ایک عرصہ کے بعد غالباً ۱۹۸۴ء میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اسے انگریزی میں منتقل کیا جسے دلی کتاب گھر نے شائع کیا۔ ہندی ترجمہ تو آج تک نہیں ہو سکا۔

مولانا غلام رسول مہر کے مقدمہ میں دوسرا اندراج ''مولانا شبلی کا فیصلہ'' کے عنوان سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''خود مولانا شبلی مرحوم نے بھی کتاب کے آخر میں ایسی عبارت لکھ دی جسے عالم گیر

کی حقیقی حیثیت سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ شاید اس خیال سے کہ یہ نہ سمجھا جائے اسے خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام مرحوم نے ایک مقام پر فرمایا ہے:

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم (مولانا شبلی) کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی معاملہ ہو وہ اس کی ابتدا شک اور تردد سے کیا کرتے تھے اور جب تک یقین کرنے کے لئے مجبور نہ ہو جائیں یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔'' (ایضاً)

عالم گیر کے معاملہ میں بھی تمام بے سروپا غلط بیانیوں کی تردید اور حقائق و وقائع کی توضیح کے بعد مولانا مرحوم کی طبیعت کا وہ پہلو نمایاں ہو کر رہا جس کی طرف مولانا ابوالکلام مرحوم نے اشارہ کیا ہے۔'' (ایضاً ص:٦)

علامہ شبلی کی کتاب اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر وہ پہلی جامع کتاب ہے جس میں عالم گیر پر عائد تمام الزامات واعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ عالم گیر کی برأت پر ایسی کتاب نہ اس سے پہلے لکھی گئی اور نہ بعد میں یہ کام ہو سکا۔ اسی وجہ سے مورخین اور تجزیہ نگاروں نے علامہ شبلی پر یہ اعتراض کیا کہ انھوں نے مورخ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عالم گیر کے ایک وکیل کی حیثیت سے یہ کتاب لکھی ہے۔ گو یہ بھی درست نہیں ہے تاہم غلام رسول مہر کے بے دلیل خیالات سمجھ سے پرے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا جو قول نقل کیا گیا ہے، وہ انھوں نے کسی اور پس منظر میں کہا تھا اور اس کا مفہوم بھی کچھ اور ہے جو یہاں چسپاں کیا گیا ہے۔ پھر اس کی کوئی مثال بھی نہیں دی گئی ہے۔

مولانا آزاد کا ذوق نظر ہی کچھ اور تھا۔ وہ تو عالم گیر کے نقاد اور داراشکوہ کے بڑے حامی تھے۔ کیا ان کا قول تسلیم کیا جا سکتا ہے اور اگر ہوں بھی تو تاریخ نگاری میں ان کا علامہ شبلی سے کیا تقابل۔ عقیدت ابوالکلام کے لئے عقیدت شبلی بھی ضروری ہے۔ اہل علم واقف ہیں کہ علامہ شبلی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ بہر حال غلام رسول مہر کے خیالات بالکل لغو اور بے بنیاد ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ کتاب کا جائزہ پیش کرتے۔ علامہ شبلی نے الزامات کی

تردید میں جو دلائل دیے ہیں ان کو پرکھتے اور جن حالات اور پس منظر میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس کی وضاحت کرتے، لیکن یہ سب کچھ انھوں نے نہیں کیا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب ''سوانح ابن تیمیہ'' پر تقدیم لکھی ہے۔ مولانا برق نے ابن تیمیہ پر پی ایچ ڈی کی تھی اور انگریزی میں مقالہ لکھا تھا۔ کہیں صراحت نہیں ہے کہ یہ وہی پی ایچ ڈی کا مقالہ یا کوئی اور کتاب ہے۔

علامہ شبلی کی اولیات میں امام ابن تیمیہ اور ان کی فکر پر مقالہ لکھنا بھی شامل ہے۔ مولانا غلام رسول مہر اس سے واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''ظنون فاسدہ واوہام باطلہ کے اس ظلمت زار میں احقاق حق کی پہلی مشعل شمس العلما مولانا شبلی نے روشن کی۔ نور اللہ تعالیٰ مرقدہ۔ یعنی امام کے احوال وسوانح پر ایک مختصر سا مقالہ بہ زبان اردو رقم فرمایا۔ جو ان کی مشہور کتاب مقالات شبلی میں موجود ہے۔ اس میں جزم کے ساتھ دعویٰ کیا کہ مجددیت کی جس قدر خصوصیتیں امام کے وجود مبارک میں جلوہ گر ہیں ان کی نظیر بہت کم مل سکتی ہے۔ اور ریفارمر یا مصلح ومجدد کا اگر کوئی اصلی مصداق ہو سکتا ہے تو وہ ابن تیمیہ ہیں۔''
>
> (سوانح ابن تیمیہؒ، ص: ۱۸-۱۹)

---

(۷۸)

حامد اللہ افسؔر

[۱۸۹۵-۱۹۷۴ء]

حامد اللہ افسؔر میرٹھی اردو کے نامور ادیب وشاعر، افسانہ نگار اور مصنف ومولف تھے۔ ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''نقد الادب'' کے نام سے ۱۹۳۳ء میں نول کشور لکھنو سے شائع ہوا ہے۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے جہاں تنقید کا ذکر کیا ہے وہاں مولانا حالی، علامہ شبلی اور محمد حسین آزاد وغیرہ کی انفرادیت اور دیگر کارناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ علامہ شبلی کے بارہ میں

لکھتے ہیں کہ

''آزاد اور شبلی کا درجہ بھی بہ حیثیت نقادان ادب کے کچھ کم نہیں۔ گو آزاد کے تنقیدی جواہر کو ان کی لطافت اور خوش طبعی نے مغلوب کر لیا، لیکن شبلی کے موازنہ انیس و دبیر نے ہماری زبان کے تنقیدی ادب میں مستقل جگہ حاصل کر لی ہے۔''

(نقد الادب، ص:۲)

حامد اللہ افسر میرٹھی نے اگر چہ عمدہ اور بلند پایہ تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور انہیں سراہا بھی گیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کا میدان نہیں۔ البتہ بچوں کے لئے جو نظمیں انہوں نے کہی ہیں، ان میں بعض بچوں کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہیں جو ان کی ایک اہم کاوش ہے۔

---

(۷۹)

مرزا احسان احمد

[۱۸۹۵-۱۹۷۲ء

ممتاز ادیب و شاعر مرزا احسان احمد ایم اے، ایل ایل بی علیگ، علامہ شبلی کے دوست مولوی مرزا محمد سلیم بیگ فاضل دیو بند وکیل اعظم گڑھ کے صاحبزادے تھے۔ ابتدائی تعلیم علامہ شبلی کے قائم کردہ نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں قاضی عبدالرحمٰن حیرت کی سرپرستی میں حاصل کی۔ انٹر میڈیٹ کے بعد علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مدۃ العمر اعظم گڑھ کچہری میں وکالت کرتے رہے۔ اور اپنی ساری صلاحتیں ضائع کر دیں۔

بہت عمدہ شاعر تھے۔ پیام کیف اور پیام زندگی ان کے دو مجموعہ کلام شائع ہوئے۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ بلند رتبہ ادیب اور نقاد تھے۔ ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''مقالات احسان'' اور خود نوشت ''میں اور میری ادبی صلاحیت'' بھی ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے۔ ان کی نثر بہت خوب صورت ہے اور ان کا اسلوب بالکل علامہ شبلی کے مشابہ ہے اور یہ کہ انہوں نے اس کی مشق بہم پہنچائی تھی۔ پیام کیف کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ

''میرے نزدیک اردو انشاپردازی کا بہترین نمونہ علامہ شبلی مرحوم کا طرزِ تحریر ہے۔میں نے اپنے مضامین میں اسی انداز انشا کی تقلید کی ہے۔اور بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔'' (پیام کیف،ص:٦)

انہوں نے کثرت سے مضامین ومقالات رسائل وجراید میں لکھے ہیں۔مقالات احسان کے علاوہ ایک اور مجموعہ شائع ہوسکتا ہے۔ناچیز نے ''باقیات احسان'' کا ایک بڑا حصہ یکجا کرلیا ہے جو جلد ہی ان شاء اللہ ادبی دائرہ سے شائع ہوگا۔

مرزا احسان احمد کا شمار علامہ شبلی کے اثرات قبول کرنے والے ممتاز لوگوں میں ہوتا ہے۔ خاص طور پر اسلوب نگارش میں پرتو شبلی صاف نظر آتا ہے۔

---

(۸۰)

مولانا محمد یونس فرنگی محلی

[۱۸۹۶-۱۹۲۲ء]

مولانا محمد یونس فرنگی محلی بڑے عالم وفاضل شخص تھے۔کم عمری میں وفات پائی۔انہوں نے ابن رشد پر اردو میں پہلی جامع اور مبسوط کتاب لکھی ہے۔اس کی اشاعت کے لئے انہوں نے دارالمصنفین کا انتخاب کیا اور مسودہ بھیج بھی دیا تھا،لیکن اشاعت سے پہلے مصنف نے داعی اجل کو لبیک کہا۔یہ کتاب دارالمصنفین نے ۱۹۲۴ء میں شائع کی۔

ابن رشد پر اردو میں سب سے اول نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی نے مضمون لکھا تھا۔اس پر بطور استدراک علامہ شبلی نے ایک مفصل مقالہ لکھا جو شوق قدوائی کے اخبار آزاد لکھنو میں شائع ہوا۔بعدازاں ۱۹۰۵ء میں علامہ نے ماہنامہ الندوہ میں ان پر ایک سلسلہ مضامین لکھا جس کا آخری ناتمام مضمون ماہنامہ معارف جون ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔مولانا محمد یونس فرنگی محلی نے اپنی کتاب میں اس سے استفادہ کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ

''جا بجا علامہ شبلی مرحوم کے مضمون سے بھی اقتباسات بجنسہ درج کئے گئے ہیں،

اور یہ محض اس بنا پر کہ میں ان سے زیادہ بہتر اور خوش نما الفاظ میں اس موقع کے مضمون کو ادا کرنے سے قاصر تھا۔'' (ابن رشد، ص:۷)

مولانا محمد یونس فرنگی محلی کے حالات ان کی کتاب ''ابن رشد'' میں لکھے گئے ہیں۔

---

(۸۱)

ڈاکٹر سید عابد حسین

[۱۸۹۶-۱۹۷۸ء]

ڈاکٹر سید عابد حسین اردو کے ادیب، ناقد، محقق، مترجم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ترجمان ماہنامہ جامعہ دہلی کے مدیر تھے۔ ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکلیں اور بعض کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ ادبی حلقوں میں ان کے ترجمے خاص طور پر پسند کیے گئے۔ رسالہ جامعہ کے مدیر کی حیثیت سے بھی انھوں نے بڑی عزت اور نیک نامی حاصل کی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا شمار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ممتاز اشخاص میں ہوتا ہے۔ اور انھوں نے جامعہ کو ترقی دینے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ

> ''مسلمانوں میں ایسے افراد کی تعداد بڑھتی رہنی چاہئے جو طرز کہن کے ساتھ آئین نو کی روح کو بھی سمجھیں اور قدیم وجدید کا ایسا خوش گوار امتزاج پیش کریں کہ عصر حاضر کے فکری، علمی، سماجی اور اجتماعی تقاضے مسلمانوں کی راہ میں روڑا بننے کے بجائے ان کی فلاح وترقی کے لئے سہارا بن جائیں۔''

اس نقطۂ نظر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فکر شبلی سے کس قدر قریب تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے عبداللطیف اعظمی [۱۹۱۷-۲۰۰۲ء] کی کتاب ''مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' پر پیش لفظ لکھا تو علامہ شبلی کے ذہن وفکر کا بڑا عمدہ تجزیہ کیا اور لکھا کہ

> ''قوموں کی زندگی جب تاریخ کے ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہونے لگتی ہے تو اس کے ذہنی قائدوں میں قدامت پسندوں کے علاوہ دو قسم کے لوگ

اور نظر آتے ہیں ایک وہ جو قدیم وجدید میں امتزاج کی کوشش کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ قدامت میں کوئی ترمیم کیے بغیر محض تھوڑی سے تاویل کرکے اسے جدت کے رنگ میں پیش کریں۔ مولانا شبلی مرحوم دوسری قسم کے ارباب فکر کے سرگروہ تھے۔"

(مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص:۱)

ڈاکٹر سید عابد حسین علامہ شبلی کی جامعیت کے معترف تو تھے ہی انھیں وہ بنیادی طور پر اسلامی تہذیب وتمدن کا ترجمان قرار دیتے ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان کے اسلوب بیان اور افکار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شبلی نے مجرد منطقی فکر کو مصور شاعرانہ تخیل میں سمو کر ایک ایسا دلکش اسلوب بیان ایجاد کیا جس نے ان کی تحریر کے دائرہ اثر کو بہت وسیع کردیا، یہ اسلوب تخیل کے تاریک گوشوں پر عقل کی روشنی ڈالتا ہے۔ فکر کے بے رنگ خاکوں میں شعر کا رنگ بھرتا ہے اور جس طرح دوربین مکان کے فصل کو مٹا دیتی ہے یہ زمانے کے فصل کو مٹا کر ماضی کو حال بنا دیتا ہے۔ یوں تو شبلی شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، مورخ بھی تھے اور سیرت نگار بھی، معلم بھی تھے اور مصلح بھی، مگر ان کی یہ سب حیثیتیں تابع تھیں ایک مرکزی حیثیت کے۔ وہ اسلامی تہذیب کے ترجمان تھے جو ماضی کی زبان میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس ترجمے کی علمی صحت یعنی حرف بہ حرف اصل سے مطابقت ایک الگ بحث طلب امر ہے، لیکن اس کی ادبی لطافت، زور اور اثر میں کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا، اپنے کمال انشاپردازی کو انھوں نے اس مقصد کے لئے استعمال کیا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے تہذیب مغرب سے مسحور دل ودماغ کو تہذیب اسلامی کے تصور سے مانوس کردیں اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔" (ایضاً، ص:۱-۲)

اس سے ڈاکٹر سید عابد حسین کی شیفتگی شبلی کا تصور کیا جاسکتا ہے۔

(۸۲)

پروفیسر شیخ عطاء اللہ

[۱۸۹۶-۱۹۶۸ء]

پروفیسر شیخ عطاء اللہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۸ء تک شعبہ معاشیات میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر اسلامیہ کالج چینوٹ کے بانی پرنسپل مقرر ہوئے۔ تعلیم اور اقتصادیات کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ خالص علمی آدمی تھے۔ مصنف، مرتب اور مترجم ان کی کئی حیثیتیں تھیں۔ ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں:

1- The Co- aperatiue Movment in The Panjab

۲۔ اقبال اور شاہان اسلام

۳۔ اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ۱۹۴۴ء

۴۔ اقبال نامہ۔ جلد دوم۔ 1951ء

۵۔ انتخاب مکاتیب سرسید، شبلی، اقبال۔ ۱۹۵۸ء

۶۔ خطوط اورنگزیب عالم گیر (ترجمہ)

۷۔ خطابات مدراس، از مارماڈیوک پکتھال (ترجمہ)

۸۔ فلسطین تحریک

علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کے بڑے مداح تھے۔ اقبال نامہ کے دیباچے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالیات پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی۔

اقبال کے علاوہ علامہ شبلی کے بھی وہ بڑے شیدائی تھے۔ ان کے افکار و خیالات نیز ان کی تصنیفات پر ان کی بڑی نظر گہری تھی۔ علامہ شبلی پر ان کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ شبلی غالباً فکر و نظر کی ہم آہنگی کی بنا پر تھا۔ ان کے شبلی اور تصانیف شبلی پر درج ذیل مقالات شائع ہوئے ہیں:

۱۔ شبلی ایک پین اسلامسٹ۔ مقالات یوم شبلی

۲۔ الفاروق۔ //

۳۔ شبلی مفکر و مبلغ۔ //

۴۔سفرنامہ روم و مصر و شام۔ //

۵۔ شبلی اور سیرۃ النبی۔ //

۱۹۵۷ء میں جب ہند و پاک پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی یاد میں تقریبات کا اہتمام کر رہے تھے، پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے اس موقع پر علامہ شبلی کا صد سالہ جشن ولادت علمی انداز میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ واضح رہے کہ علامہ شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۵/دسمبر ۱۹۵۷ء کو علامہ شبلی کے صد سالہ جشن ولادت کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی، تاہم اس موقع پر اسلامیہ کالج چنیوٹ نے اپنے مجلّہ البصیر کا شبلی نمبر بھی شائع کیا جسے بے حد پسند کیا گیا اور متعدد رسائل میں اس پر بڑے وقیع تبصرے شائع ہوئے۔ اس کا تفصیلی مطالعہ راقم کی کتاب ''شبلی شناسی کے سو سال'' میں پیش کیا گیا ہے۔ (ص: ۸۵-۹۴)

علامہ شبلی کے جشن ولادت کے انعقاد اور مجلّہ البصیر کی خصوصی اشاعت شبلی کا سبب یہ ہے کہ پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے علامہ شبلی کی خواب میں زیارت کی۔ اس کی تفصیل انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مارچ ۱۹۵۷ء کی ایک رات میں نے لاہور میں مولانا شبلی مرحوم کو خواب میں دیکھا کہ باقاعدہ جبہ و عمامہ پہنے، عینک لگائے، چھڑی ہاتھ میں لئے ایک کرسی پر جلوہ افروز ہیں اور ان کے فاضل شاگرد و جانشین سید سلیمان ندوی مرحوم کرسی کے پیچھے کھڑے ہیں۔ میں کچھ دیر اس روح پرور نظارے سے خواب میں ہی فیض اندوز ہوتا رہا۔ سید سلیمان ندوی صاحب سے تو علی گڑھ میں کئی مرتبہ شرف ملاقات حاصل کر چکا تھا لیکن مولانا شبلی مرحوم کی زیارت کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی اور اس سلسلہ میں اپنی کم نصیبی، پہ میں اکثر پروفیسر براؤن کے الفاظ:
>
> وائے کہ از زیارت آں علامہ عصر محروم ماندیم
>
> دہرایا کرتا ہوں۔ استاذ و شاگرد کی ایسی یکجائی تصویر بھی میری نظر سے کبھی نہیں

گذری۔ یہ کیفیت کچھ دیر قائم رہی تو خواب ہی میں میری زبان پر ایک فارسی مصرعہ جاری ہوگیا، حالانکہ شعر سے ذوق کے باوجود شاعری کی نعمت سے یکسر محروم ہوں۔ چونکہ اس مصرعہ کا تعلق خود میری ذات ہے، اس کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا۔ دونوں بزرگ بالکل خاموش رہے اور کچھ دیر کے بعد یہ سماں خواب و خیال ہوگیا۔'' (البصیر شبلی نمبر، ص:۱)

پروفیسر شیخ عطاء اللہ اس خواب کی تعبیر پر غور کرتے رہے۔ اپنے بعض بزرگ احباب سے اس کی تعبیر دریافت کی۔ پھر حیات شبلی کا مطالعہ کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ

''مولانا کے سے مرتبہ وشان اور عشق ملت سے مخمور و سرور بزرگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ایسی تقریب پر ان کی خدمت میں ہدیہ عقیدت نہ پیش کرنا قوم کی بے حسی اور محرومی کی دلیل ہوگی۔

میں نے طے کرلیا کہ اور کچھ نہیں تو اسلامیہ کالج چینوٹ کے مجلّہ البصیر کا شبلی نمبر اس تقریب کی یادگار میں شائع کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو اس سلسلہ میں ایک جلسہ اہل علم کا چینوٹ اسلامیہ کالج کے زیر اہتمام منعقد ہونا چاہئے۔''

(ایضا، ص:۵)

چنانچہ انھوں نے دونوں کاموں میں کامیابی حاصل کی اور خاص طور پر مجلّہ البصیر کا شبلی نمبر ایک دستاویزی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

ایک سال بعد ۱۹۵۸ء میں پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے سرسید، شبلی اور اقبال کے خطوط کا انتخاب لاہور سے شائع کیا۔ اس میں انھوں نے مکاتیب کے انتخاب کے ساتھ مکتوب نگاروں کا تعارف اور مکاتیب پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ دیباچہ میں اس انتخاب کے اسباب لکھے ہیں۔ علامہ شبلی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم کے جوہر ذاتی، جذبہ ملت دوستی، مقابلہ انقلاب اور ولولہ اصلاح حال تھے۔ علی گڑھ میں سرسید ہی کے دامن تربیت میں نشو ونما پائی۔ مولانائے مرحوم نے اپنی زندگی ان مختلف میدانوں میں جو ان کی طبیعت و

صلاحیت کے جولان گاہ تھے، خدمت ملت کے لئے وقف کردی اور تنہا تعلیمی، مذہبی، ادبی اور تاریخی شعبوں میں اتنا کام کر گئے کہ بڑی بڑی انجمنیں مدتوں میں انجام نہیں دے سکتیں۔ وہ اپنے زمانہ میں عالم اسلام کے چند ممتاز علماء میں سے تھے۔ ان کا ایک کارنامہ ارباب علم وبصیرت کی وہ جماعت ہے جو اسی نوعیت کی خدمات دارالمصنفین اعظم گڑھ کے نام سے انجام دے رہی ہے اور جس کے پایہ کی کوئی دوسری جماعت کسی اسلامی ملک میں موجود نہیں۔ تقسیم ہند کے بعد اس جماعت سے پاکستان کا تعلق گویا ختم ہو چکا ہے اور خود پاکستان میں اس قسم کے ایک ادارہ کی تشکیل کی اشد ضرورت ہے۔"

(انتخاب مکاتیب سرسید، شبلی اور اقبال، ص:۳)

---

(۸۳)

محمد عبدالرزاق راشد

[۱۸۹۶-۱۹۶۷ء]

مولانا محمد عبدالرزاق راشد۔ ایچ، ایس، سی، حکومت آصفیہ حیدرآباد میں سینئر کنٹرولر اکاؤنٹس وآڈٹ کے عہدہ پر فائز رہے۔ بڑے عالم فاضل اور ادیب ونقاد تھے۔ مولوی حیدر علی نظم طباطبائی کی کتاب "اصلاحات غالب" مرتب کی۔ اس کے علاوہ انتخاب غالب، اور کلیات اقبال بھی مرتب کیں۔ ان پر انہوں نے جو مبسوط اور مفصل مقدمے لکھے ہیں، وہ ان کی وسیع النظری کی مثال ہیں۔ اصلاحات غالب کے مقدمہ میں دو جگہ انہوں نے علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے اور دونوں باتیں حیات شبلی میں اضافہ شمار ہوتی ہیں۔ مولانا عبدالرزاق راشد لکھتے ہیں:

"۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی حیدرآباد تشریف لائے۔ اس زمانے میں میرے ایک ہم نام نے نامپلی کے محلہ میں مدرسہ انوارالعلوم کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ کرنل سر افسرالملک کمانڈرانچیف افواج آصفیہ کی پیشی میں کام کرتے تھے۔ کرنل صاحب

موصوف نے مولانا شبلی کے لئے مصنوعی پاؤں تیار کرایا تھا۔ جبکہ وہ بندوق کی گولی اتفاقیہ چل جانے سے حادثہ کا شکار ہو گئے تھے۔ میں ان دونوں علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھا اور موسم گرما کی تین مہینوں کی تعطیلات میں گھر آیا تھا۔ بانی مدرسہ نے مجھ سے خواہش کی کہ میں تین مہینوں تک مدرسہ کی صدارت سنبھال لوں۔ وہ فوج کے دفتر میں میرے بڑے بھائی کے رفیق کار اور ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے مجھ سے انکار بن نہ پڑا اور میں مدرسہ کی ہیڈ ماسٹری کے فرائض انجام دینے لگا۔..................

موقع غنیمت جان کر بانی مدرسہ کے ساتھ مولانا شبلی سے شرف نیاز حاصل کر کے میں نے مدرسہ کے معائنہ اور طلبہ کو مخاطب کرنے کی درخواست کی۔ مولانا نے مہربانی سے معاً آمادگی ظاہر کی اور معائنہ مدرسہ کی تاریخ خود ہی مقرر فرمائی اور تاریخ مقررہ پر پر شام کے پانچ بجے مدرسہ میں رونق افروز ہوئے۔ لوگ تین ہی بجے سے جوق در جوق آنے لگے اور پانچ بجے تک مدرسہ کا سب سے بڑا ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ میں نے مولانا کو مدرسہ دکھانے کے بعد تعارف کے طور پر کہا کہ ''یوں تو ملک میں بہت سے علماء ہیں مگران کے کام درس و تدریس یا وعظ و پند و نصائح تک محدود ہیں۔ وہ اقتضائے زمانہ سے بالکل بے خبر اور پرانی لکیر کے فقیر ہیں۔ ہم کو ایسے روشن خیال علماء کی ضرورت ہے جیسے مولانا شبلی ہیں۔ جن کے علم و فضل کی دھاک سارے ملک میں بیٹھی ہوئی ہے اور جن کی بصیرت افروز تصنیفات کا حوالہ براؤن جیسے مستشرق نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران میں دیا ہے۔ صرف ہند ہی میں نہیں بلکہ بیرون ہند بھی مولانا کی کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ مولانا کرسی صدارت کو زینت بخشیں اور اپنے گراں قدر خیالات سے حاضری جلسہ کو مستفید فرمائیں۔ مولانا جب تقریر کرنے کو اٹھے تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ تالیوں کا شور کم ہونے پر جو تقریر کی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

بانی مدرسہ، صدر مدرسہ و معزز حاضرین!

صدر مدرسہ اور بانی مدرسہ نے مجھ سے خواہش کی کہ مدرسہ انوار العلوم کا معائنہ کروں تو ایک تو مدرسہ کے نام کی کشش ہوئی اور دوسرے تیمور ہونے کے باوجود مجھ سے عذر لنگ نہ ہوسکا اور میں معائنہ کے لئے تیار ہوگیا۔

آج یہاں آیا تو مجھے مدرسہ کی تمام جماعتیں دکھائی گئیں اور بتایا گیا کہ حکومت کی امداد کے بغیر مدرسہ چلایا جارہا ہے۔ طلبہ میں نظم وضبط اور اساتذہ میں انہماک و مستعدی دیکھ کر میں بہت محظوظ ہوا۔ اور اس بات سے بھی مجھے بہت خوشی ہوئی کہ بانی مدرسہ نے اپنی زندگی مدرسہ کی فلاح و بہبودی و ترقی کے واسطے وقف کردی ہے۔ اور صدر مدرسہ ایک پرجوش نوجوان خود علی گڑھ کالج میں سائنس کی تعلیم پارہے ہیں قومی خدمت پر کمربستہ ہیں۔ نوعمری میں ان کا یہ جذبہ خدمت ملک وملت قابل قدر ہے۔ اس کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔

مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب ان کی بے دینی ہے۔ اگر وہ صحیح معنوں میں اسلامی ضابطہ پر عمل پیرا رہتے تو آج اس پس ماندگی سے دوچار نہ ہوتے۔ ان میں نہ قوت علمیہ باقی ہے نہ طاقت سپہ گری۔ ان کی ترقی کی واحد تدبیر یہی ہے کہ انہیں اسلامی تعلیمات سے آراستہ کیا جائے۔ اور جدید علوم فنون سکھائے جائیں اور انگریزی تعلیم لازم کردی جائے۔ اس خصوص میں یہ امراز بس ضروری ہے کہ ہماری تعلیم ہمارے ہی ہاتھوں میں رہے۔ غیروں پر تکیہ نہ کیا جائے۔ اور ہم اپنی طرز زندگی قدیم وجدید تعلیم کے مرکب سانچے میں ڈھالیں۔ جدید علوم وفنون سے طلبہ کو بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔ اور ہماری درس گاہوں سے قابل افراد نکلیں گے۔ جس کے سبب سے ہماری قوم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کا مقابلہ کرسکے گی۔

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدائے کارساز مدرسہ کو ایسا فروغ بخشے کہ یہ کالج بن جائے۔ ایسا ہی جیسا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بنا اور آج علی گڑھ کالج

کے نام سے مشہور ہے اوراس مدرسہ کے طلبہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملک وملت کا نام روشن کریں۔اور ہر جگہ عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جائیں۔"

یہ کہہ کر مولانا کرسی پر بیٹھ گئے تو پھر دیر تک تالیوں کے شور سے پورا ہال گونج اٹھا۔اس کے بعد بانی مدرسہ مولوی محمد عبدالرزاق صاحب نے مختصر تقریر میں فرمایا کہ" آج ہم اپنی خوش قسمتی پر جس قدر ناز کریں بجا ہے، کیونکہ ہمارے درمیان ایسی شمع علم موجود ہے جس کے نور سے ملک کے تمام خطے منور ہیں۔اور علمی حلقے مولانا کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ جو مشورے مدرسہ کی ترقی کے بارے میں مولانا نے دئے ہیں ہمارے حق میں گنج گراں مایہ ہیں۔ہم ان پر ان شاء اللہ عمل کریں گے۔مولانا نے آج یہاں رونق افروز ہونے کی جو زحمت گوارا فرمائی ہے ہم اس کے لئے تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ مولانا صدوی سال زندہ رہیں اور اپنے انوار علم وکمال سے ہمارے ظلمت کدوں کو روشن رکھیں۔" (اصلاحات غالب، ص:۱۸-۲۱)

مولانا مزید لکھتے ہیں:

"بحمد للہ مولانا شبلی کی دعا بارگاہ رب العزت میں مقبول ہوئی۔آج مدرسہ انوار العلوم کالج کے درجہ تک پہنچ گیا ہے اوراس میں سیکڑوں طلبہ زیر تعلیم ہیں۔کیا عجب ہے کہ آئندہ چند سالوں میں یونیورسٹی کا قالب اختیار کرلے۔"

(ایضاً،ص:۲۲)

مولنا عبدالرزاق راشد نصاب تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی کئی روز تک جدید نصاب تعلیم کو مرتب کرنے میں مشغول رہے اور ایک مفصل رپورٹ لکھی جس کو حضور نظام نے بہ طلب رائے علامہ نظم طباطبائی کے پاس بھیجنے کا حکم صادر فرمایا۔اس رپورٹ پر علامہ نے جو رائے دی اس کا کچھ حصہ کاغذات میں دستیاب ہوا جو درج ذیل ہے:

شمس العلما مولانا شبلی کی اصلاح نصاب دارالعلوم کے متعلق سرکار نے

مجھ سے بھی رائے پوچھی ہے۔ اس رپورٹ کے ساتھ نصاب تعلیم کا نقشہ نہیں تھا، اس سبب سے میں مفصل رائے نہیں دے سکتا، لیکن بالاجمال عرض کرتا ہوں کہ اصلاح نصاب کی ضرورت کس وجہ سے لاحق ہوئی ہے۔

۱۔ صرف ونحو کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں طلبہ کا وقت بہت صرف ہو جاتا ہے۔

۲۔ قرآن شریف کا درس میں داخل کرنا مقصود ہے کیونکہ یہ مدرسہ مسلمانوں کا ہے اور قرآن شریف پڑھنے میں معتقدات احکام دین معلوم ہونے کے علاوہ عربی بھی معتدبہ حاصل ہو جاتی ہے۔

۳۔ علم کلام کی بھی کوئی کتاب نصاب میں داخل کرنا منظور ہے کیونکہ عالم دین نہیں ہو سکتا جو علم کلام کو نہ جانے اور بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اجسام طبعی اور غیر طبعی کے حقائق سے باخبر نہ ہو۔

۴۔ مولانا نے منطق ونحو کی کوئی کتاب اپنی تجویز کی ہوئی فہرست میں نہیں لکھی۔ میں شمسیہ اور شیدیہ کی تحریک کرتا ہوں۔ کیونکہ دونوں کتابیں نصاب پنجاب میں داخل ہیں۔ اور اب بھی ان کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ نحو میں البتہ جو کتابیں کہ انتخاب پنجاب میں ہیں ان کی عبارت معمی سے کم نہیں، جس کی تحصیل میں طلبہ کو ایک عمر صرف کرنا پڑتی ہے۔ ان کتابوں کے بدلے صرف میر ونحو میر مبتدی کے لئے اور مفصل زمخشری منتہی کے لئے مقرر کرنا بہتر ہوگا۔

مصر و عراق و یمن میں جو عربی بولی جاتی ہے اس میں اعراب کی زحمت بالکل نہیں ہے۔ اور اشتقاق و تعطیلات بھی بہت کم ہیں۔ عربی داں کو اس سے بالکل بیگانہ نہیں رہنا چاہئے۔ اس سبب سے میری گذارش ہے کہ فکاہات مفیدہ پانچ چار جز کی ایک کتاب جو مصر کے صوتی میں ہے مولوی کے درجہ میں الف لیلہ کے بدلے مقرر کی جائے۔ اور کتاب کے ساتھ صرف میر ونحو میر طلبہ کو پڑھائی جائے، اس کے بعد قرآن شریف ترکیب و تصریف کے ساتھ اور قدوری پڑھائی

جائے۔اس کے بعد اخوان الصفا کا ایک حصہ دروس اولیہ کا، تین برس میں یہ کتابیں بخوبی نکل جائیں گی۔

مولانا نے علم کلام میں ''معالم'' امام رازی کو پسند فرمایا ہے۔میری رائے ناقص میں ''موافق'' سے بہتر کوئی کتاب علم کلام میں آج تک نہیں تالیف ہوئی، بیان اس کا بہت واضح ہے اور اس کے علاوہ متداول کتاب ہے اور امور عامہ اس کے نصاب قدیم میں بھی داخل ہیں۔پھر یہ خوبی ہے کہ موافق پڑھ لینے کے بعد ہدیہ سعیدیہ اور میبذی اور شرح ارشادات طوسی ورازی کے پڑھانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ان کتابوں کے سب مباحث اس میں موجود ہیں۔اور محض اس غرض سے کہ یورپ میں روز بروز انکشافات علمی ہوتے رہتے ہیں اور دروس اولیہ وغیرہ پچیس تیس برس ادھر کی تالیف ہے یہاں کے طلبہ کو یورپ کی کوئی بھی زبان سیکھنا چاہئے ،لیکن بقدر ضرورت مثلاً انگریزی پڑھیں تو چوتھی کتاب تک پڑھنا کافی ہے۔چار کتابوں میں اتنی انگریزی آسکتی ہے علوم کی کتابوں کو کسی سے پڑھ سکیں۔اس سے زیادہ انگریزی سیکھنے میں اوقات صرف کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ہم لوگوں کو اس کا تجربہ عربی میں ہو چکا ہے کہ بغیر اس کے کوئی کتاب ادب کی پڑھیں،عربی میں علمی کتابیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور بخوبی چلتی ہیں۔علمی کتابوں میں کان یکون کے سوا زبان دانی کام بھی زیادہ نہیں پڑتا۔

(ایضاً،ص:۲۲-۲۵)

مولانا شبلی کی رپورٹ نصاب دارالعلوم میں علامہ نے جو ترمیمات تجویز کی تھیں ان کا علم مولانا سیلیمان ندوی کو شاید نہ تھا ورنہ وہ حیات شبلی میں ان کا ذکر ضرور کرتے۔مجوزہ ترمیمات کے بموجب نصاب کو حکومت نے منظور کرلیا اور اسی نصاب کے موافق تعلیم ہونے لگی اور ریاست میں امتحانات کا آغاز ہوا۔''

(ایضاً،ص:۲۵)

(۸۴)

عبدالشکور بریلوی

[۱۸۹۸-۱۹۷۰ء]

عبدالشکور بریلوی سابق پرنسپل گورنمنٹ رضا ڈگری کالج رامپور، اردو کے نامور ادیب، نقاد اور متعدد کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ اردو زبان و ادب کا بڑی گہرائی اور دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ خاص طور پر تنقید پر ان کی بڑی عالمانہ اور محققانہ نظر تھی۔ چنانچہ اس موضوع پر کئی کتابیں اور مضامین لکھے۔ جو اہل علم کے درمیان قابل قدر ٹھہرے۔ دیگر موضوعات پر بھی انہوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی تصانیف کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ، دو جلدیں (۲) دور جدید کے چند منتخب ہندو شعرا (۳) اصغر (۴) حسرت موہانی (۵) روضۃ الرضوان (۶) شاہ غمگین حضرت جی اور ان کا کلام (۷) فانی (۸) نظام رامپوری (۹) یاران میکدہ۔

عبدالشکور بریلوی علامہ شبلی اور دبستان شبلی کے بڑے مداح نظر آتے ہیں۔ تنقیدی سرمایہ کے دیباچہ میں انہوں نے نقادوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ علامہ شبلی کی تنقید نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آزاد و حالی کے بعد شبلی منظر عام پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ شبلی شاعر بھی تھے، ادیب بھی۔ مورخ بھی تھے، سیرت نگار اور نقاد بھی۔ ان کی تصانیف ملک میں بھی بہت مقبول ہوئیں۔ حیدرآباد اور بھوپال نے ان کی قدر افزائی کی اور ان کو عطیات دئے۔ ندوہ لکھنو اور دارالمصنفین اعظم گڑھ دونوں ادارے شبلی ہی کے ذریعہ عالم وجود میں آئے۔ اور اب تک کامیابی اور سرسبزی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ دارالمصنفین خصوصیت کے ساتھ ہمارے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس کے ذریعہ اردو ادب کی خدمت کا سلسلہ پابندی اور مستعدی سے جاری ہے۔ اور اس کا تنقیدی لٹریچر قابل ستائش ہے۔

"............ شبلی کی تصنیف شعرالعجم بہت مشہور ہوئی۔ اردوداں پبلک نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہاں تک کہ وہ اب اردو کے کلاسیکل ادب میں شمار کی جاتی ہے۔ شبلی کی تنقید نگاری کا طریقہ ملک میں اس قدر مقبول ہوا کہ کم ازکم بیس پچیس سال تک اردو کے نقادان ہی کے نظام تنقید کی پیروی کرتے تھے۔"

(تنقیدی سرمایہ، ص: ۱۲۷-۱۲۸)

حالی اور شبلی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نقاد کی حیثیت سے حالی کا مرتبہ شبلی سے اونچا تھا، اگرچہ جب تک شبلی زندہ رہے حالی کی شہرت کا چراغ روشن نہ ہوسکا۔ شعرالعجم اور موازنہ انیس ودبیر شائع ہوتے ہی بہت مشہور ومقبول ہوئے۔ شبلی کی ذات ایک انجمن تھی۔ ان کے مداحوں، پرستاروں اور شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ پہلے وہ ندوہ کے افق پر چمکے، پھر دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کی بنیاد ڈالی۔ جہاں شبلی کی ادبی روایات اب تک محفوظ ہیں۔ اس کے برخلاف حالی تنہا آئے، تنہا رہے اور تنہا چلے گئے۔ نقاد کی حیثیت سے شبلی کا رنگ تاثراتی ہے۔" (اردوادب کا سرمایہ حصہ دوم ص ۱۴-۱۵)

علامہ شبلی کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شبلی کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنی تنقیدی نگارشات میں شاعر کے کلام کی تحلیل اس طرح کرتے کہ عنوانات قائم کر لیتے اور ان عنوانات کے تحت اشعار منتخب کر کے مزے لے لے کر ان کی بھرپور تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے پرستاروں نے بھی تنقید نگاری کا یہی رنگ ڈھنگ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ اقبال احمد خاں سہیل اور مرزا احسان احمد صاحب نے اسی طرز پر تنقیدیں لکھی ہیں مگر مولانا شبلی کے حلقہ میں اچھے اچھے ناقدین پیدا ہوئے۔ مثلاً سید سلیمان ندوی مرحوم، مولوی عبدالسلام وغیرہ ان کی تنقیدی تصانیف بڑی قابل قدر ہیں۔"

(تنقیدی سرمایہ، حصہ دوم، ص: ۱۵)

(۸۵)

مولانا حامد ندوی

[***]

مولانا حامد ندوی ندوۃ العلماء کے فاضل اور رئیس احمد جعفری ندوی کے ہم عصر اوران کے خاص احباب میں تھے۔ان کے بارہ میں اور کسی قسم کی معلومات دستیاب نہ ہوسکیں، حتیٰ کہ تاریخ ولادت ووفات بھی معلوم نہ ہوسکی۔

مولانا حامد ندوی نے ۳۰-۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے ایک علمی وادبی ماہنامہ ''خضر راہ'' جاری کیا۔ اوراس کی ترسیل واشاعت کے لئے خضر راہ بک ایجنسی بھی قائم کی تھی۔ علامہ شبلی سے عقیدت کی بناپر انہوں نے ماہنامہ خضر راہ کا ''شبلی نمبر'' شائع کیا۔ علامہ شبلی کی شخصیت اور فکروفن پر یہ پہلا رسالہ تھا جس نے خصوصی شمارہ شائع کیا۔ اس کا مفصل جائزہ راقم کی کتاب ''شبلی شناسی کے سوسال'' میں شامل ہے۔ یہاں بس اتنا عرض کردوں کہ اس میں چند مضامین ایسے ہیں، جن کا عموماً لوگوں کو علم نہیں۔ جیسے مولانا محب اللہ لاری اور ملارموزی وغیرہ۔ ملارموزی کی تحریر گلابی اردو میں ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ندوی فضلاء کی طرح وہ بھی علامہ شبلی کے بڑے شیدائی اوران کے کاموں کے معترف ومداح تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی نعمانی دنیائے علم وادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، نہ صرف ہندوستان بلکہ ترکی، مصر، فرانس، انگلستان اور دیگر مہذب ومتمدن ممالک کے باشندے بھی آپ کی شخصیت اور آپ کے علمی وادبی اور تاریخی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، پھر یہ اعتراف محض زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ اب تک آپ کی متعدد تصانیف دوسری زبانوں میں منتقل کی جاچکی ہیں اوران کو ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا ہے۔'' (ماہنامہ خضر راہ، نومبر ۱۹۲۹ء، ص:۷۶)

ماہنامہ خضر راہ کے سوا ان کی کسی اور کاوش کا علم نہیں ہوسکا۔

(۸۶)

شاہ معین الدین احمد ندوی

[۱۹۰۴-۱۹۷۴ء]

جانشین سلیمان مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ندوہ کے ممتاز فرزند، دار المصنفین کے ناظم اور بڑے عالم، ادیب، مصنف اور تذکرہ نگار تھے۔ ان کے قلم سے تقریباً دو درجن علمی، ادبی اور تاریخی کتابیں نکلیں۔ چار حصوں میں تاریخ اسلام اور سیر الصحابہ ان کی بلند پایہ کتابیں ہیں۔ برسوں ماہنامہ معارف کی ادارت بھی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ان کا ایک اہم کام شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا اردو ترجمہ بھی ہے، جسے ۱۹۵۲ء میں دار المصنفین نے ''اسلام اور عربی تمدن'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے علامہ شبلی کے ایک اہم کارنامے کا ذکر کیا ہے۔ علامہ شبلی کی کتاب زندگی کا ایک بڑا روشن اور تابناک باب مستشرقین کی زہرافشانیوں کی پردہ دری اور ان کی تردید ہے۔ انھوں نے مستشرقین کے متعدد اعتراضات کا بڑا مدلل جواب لکھا ہے۔ ''اسلام اور عربی تمدن'' کے دیباچہ میں شاہ معین الدین صاحب نے اس کا اختصار سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کی تردید کی جانب ہندوستان میں سب سے پہلے سرسید احمد خاں، مولوی چراغ علی، مولانا شبلی اور سید امیر علی وغیرہ نے توجہ کی، اس کام میں اگرچہ اول الذکر دونوں بزرگوں سے غلطیاں بھی ہوئیں، مگر اپنی فہم وبصیرت کے مطابق ان سب نے اس فرض کو انجام دیا اور مولانا شبلی نے تو اس کو مقصد زندگی بنا لیا، چنانچہ ان کی تمام علمی و تعلیمی جد و جہد اور تالیف و تصنیف کا مرکز یہی دائرہ تھا اور ان کی بیشتر تصانیف کسی نہ کسی پہلو سے اسی دائرہ میں آتی ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کام کے لئے ایک مستقل مکتبہ فکر قائم کر دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مذہب اسلام، اسلامی تمدن اور اسلامی تاریخ کو اس طرز سے اور ایسے محققانہ انداز میں پیش کیا جائے کہ خود بخود اس کی عظمت و برتری نمایاں

ہو جائے اور اس قسم کے اعتراضوں کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔اس طرح انھوں
نے اردو میں ایک نیا علم کلام پیدا کر دیا اور ہندوستان میں اس راہ کے سارے راہ
روان کی قائم کی ہوئی شاہراہ پر قائم ہیں۔" (اسلام اور عربی تمدن، ص:۲)

شاہ صاحب بڑے ادیب اور انشا پرداز تھے۔متعدد منفرد ادبی وتنقیدی مضامین لکھے، جن کا ایک مجموعہ "ادبی نقوش" کے نام سے ادارہ فروغ اردو لکھنو سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔

قاضی تلمذ حسین جنہیں مولانا جلال الدین رومی کے افکار سے بڑی دلچسپی تھی اور جنہوں نے مراۃ المثنوی اور صاحب المثنوی جیسی اہم اور بلند پایہ کتابیں لکھیں، ان کی دوسری کتاب "صاحب المثنوی" جسے دارالمصنفین نے ان کے ورثا سے خرید کر شائع کی۔اس پر شاہ صاحب کا دیباچہ شامل ہے۔اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"اردو میں سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے مولانا روم کی سوانح عمری لکھی، لیکن
اس میں سوانح کا حصہ بہت مختصر ہے، زیادہ زور مثنوی کی خصوصیات دکھانے میں
صرف کیا گیا ہے، جو مصنف کا اصل مقصود تھا۔سوانح کی اس کمی کو قاضی تلمذ حسین
مرحوم سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد نے پورا کیا ہے۔" (صاحب المثنوی، ص:۱)

مولانا سعید انصاری مرحوم نے اگرچہ اپنے ایک مضمون مشمولہ ماہنامہ ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر میں علامہ شبلی نعمانی کی متعدد اولیات کا ذکر کیا ہے، مگر اس میں ان کی تمام اولیات کا ذکر نہیں آسکا ہے۔ مذکورہ بالا اور اس کتاب میں مذکور دیگر اولیات شبلی پر ایک مفصل مقالے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

---

(۸۷)

ڈاکٹر عندلیب شادانی

[۱۹۰۴-۱۹۶۹ء]

سید وجاہت حسین معروف بہ عندلیب شادانی شاعر وادیب اور نقاد تھے۔آبائی وطن

سنبھل تھا۔ لاہور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی لکچرر منتخب ہوئے۔ بعد میں اردو و فارسی دونوں شعبوں کے صدر رہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں سبکدوش ہوئے۔

بہت اچھے شاعر تھے۔ نشاط رفتہ ان کا شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ اردو کے اہم شعری مجموعوں میں شمار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں کئی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ ان میں نقش بدیع، تحقیقات، نوش و نیش، اردو غزل گوئی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے ستارۂ امتیاز سے نوازا۔

ربیعہ سلطانہ کی کتاب مکاتیب جمیل جس میں خواتین شعرا کے خطوط یکجا کیے گئے ہیں، اس کا مقدمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے لکھا ہے۔ پرائیویٹ خطوط کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> "پرائیویٹ خطوں میں مصلحتوں کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں، اور قلم کی زبان صحیح معنی میں دل کی ترجمان بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر علامہ شبلی نعمانی کے وہ خطوط پیش کیے جاسکتے ہیں جوانہوں نے زہرہ بیگم صاحبہ فیضی اور عطیہ بیگم فیضی کے نام تحریر فرمائے۔ ان خطوط میں موصوف نے تعلیم نسواں، پردہ، موسیقی اور بعض دوسرے معاشرتی مسائل کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ان کی کسی دوسری تصنیف میں نہیں ملتے۔ اور اس کی وجہ وہی پبلک لائف کی مجبوریاں اور مصلحتیں ہیں۔" (مکاتیب جمیل، ص: ۱۱-۱۲)

---

(۸۸)

مولانا سید ریاست علی ندوی

[۱۹۰۴-۱۹۷۶ء]

مولانا سید ریاست علی ندوی ندوہ کے ممتاز فرزند اور دبستان شبلی کے ایک ممتاز مصنف و مورخ تھے۔ ندوہ میں تعلیم پائی اور ۱۹۲۴ء میں فراغت کے بعد دارالمصنفین آئے اور برسوں رفیق اور ماہنامہ معارف کے معاون مرتب رہے۔ یہاں جب تک رہے فکر شبلی وسلیمان پر کام کرتے

رہے۔انہوں نے متعدد بلند پایہ کتابیں سپرد قلم کیں۔ان میں چار جلدوں میں تاریخ اندلس اور دو جلدوں میں تاریخ صقلیہ ان کی بہت مقبول و مشہور کتابیں ہیں۔ان کی مقبولیت کا سبب اپنے موضوعات پر ان کی انفرادیت تھی۔صقلیہ پر تو اب بھی ایسی گراں مایہ کتاب اردو میں نہیں لکھی جاسکی ہے۔

ان کی ایک اور تصنیف ''اسلامی نظام تعلیم'' ہے جس کا مقدمہ لکھتے ہوئے انہوں نے اسلامی نظام تعلیم کے حوالہ سے علامہ شبلی کی خدمات جلیلہ کا ذکر کیا ہے۔اور لکھا ہے کہ

> ''درحقیقت اس وقت تک اسلامی نظام تعلیم پر جو کچھ مواد فراہم ہوا ہے وہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے چند مضامین کے مجموعہ کے باہر نہیں ہے، لیکن علامہ موصوف نے ان میں زیادہ تر اسلامی مدارس پر توجہ رکھی ہے۔اگر چہ اسلامی نظام تعلیم پر بھی انہوں نے مضامین لکھے ہیں لیکن ان میں ندوۃ العلما کے تعلق سے زیادہ تر ہندوستان کی اسلامی درس گاہوں کے نصاب پر نظر ڈالی گئی ہے۔نفس اصول وطریق تعلیم ،اسلامی نظام تعلیم کے رو سے اساتذہ وطلبہ کے فرائض اور مدارس اور دارالاقامہ کے نظم ونسق وطرز بود وماند وغیرہ پر انہیں ابھی توجہ فرمانے کا موقع نہیں ملا۔'' (اسلامی نظام تعلیم ،ص:۲)

بلاشبہ علامہ شبلی ماہر تعلیم بھی تھے اور اس فن پر بالخصوص قدیم علوم وفنون پر ان کی بڑی گہری نگاہ تھی۔مولانا سید ریاست علی ندوی کے تجزئے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بوریہ نشینوں نے ملت کے کیسے کیسے سرمائے پر محنت کی۔اور کیسی کیسی لازوال کاوشیں یادگار چھوڑی ہیں۔

مولانا سید ریاست علی ندوی علامہ شبلی کتابوں کے بہت بڑے پارکھ تھے۔متعدد کتابوں سے اہل علم ان کی بدولت واقف ہوئے۔مسٹر محمد شفیع کے تذکرہ میں ''میخانہ'' سے متعارف کرانے کا ذکر آچکا ہے۔مولانا سید ریاست علی ندوی نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعہ ''چند تنقیدیں'' میں ایک اور تاریخی کتاب ''عمر نامہ' کا ذکر کیا ہے۔اس کا ذکر علامہ شبلی نے شعرالعجم میں کیا ہے۔فاضل مضمون نگار نے اس پر مفصل مضمون لکھا ہے۔(چند تنقیدیں،ص:۶)

(۸۹)

مجنوں گورکھپوری

[۱۹۰۴-۱۹۸۸ء]

نامور ادیب ونقاد اور شاعر مجنوں گورکھپوری جو اپنی تنقیدی بصیرت اور تنقیدی کتب تاریخ جمالیات، دوش وفردا، غالب شخص وشاعر، اور افسانوں کے لئے یاد رکھے جائیں گے، انہوں نے بھی نقوش وافکار کے دیباچہ میں علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ذکر میں لکھا ہے ''مجھے فوراً احساس ہوا کہ اردو میں تنقید کی زمین ابھی بالکل بے کاشت پڑی ہوئی ہے اور شبلی کی کاوشوں کے بعد اس میں کسی نے کوئی کوشش نہیں کی ہے۔'' (نقوش وافکار، ص: ۷)

ان کا یہ بیان اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی کے بعد کی تنقیدی کاوشوں کو شاید اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے تنقید کے میدان میں جو کچھ کیا اس کا علامہ شبلی کی کاوشوں سے کوئی میل نہیں ہے۔

---

(۹۰)

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

[۱۹۰۵-۱۹۶۲ء]

ادارہ ادبیات اردو کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ سے کون ہے جو واقف نہیں ہوگا۔ ان کا شمار ان کے عہد میں اردو کے اساطین میں ہوتا تھا اور انھوں نے شعر وادب کی بڑی اہم اور گوناگوں خدمات انجام دیں۔ ان کی شبلی اور فکر شبلی پر بڑی گہری نظر تھی۔ اپنی کتاب روح تنقید میں انھوں نے علامہ شبلی کی تنقید نگاری کا بڑا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے ادارہ ادبیات میں علامہ شبلی کے بہت سے غیر مطبوعہ خطوط اور دیگر تحریریں محفوظ کرائی تھیں اور ان پر ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ غالباً اسی بنا پر ڈاکٹر معین الدین انصاری نے اپنی کتاب ''شبلی: مکاتیب شبلی کی روشنی میں'' کے

مقدمہ کے لئے ان کا انتخاب کیا۔ڈاکٹر معین الدین انصاری[پ:۲۹/جولائی ۱۹۲۵ء] حیدرآباد سندھ سابق ایڈیٹر ماہنامہ سب رس حیدرآباد کی یہ کتاب ہندوستان میں علی العموم دستیاب نہیں ہے۔اسے اردو اکیڈمی سندھ پاکستان نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔اس کا تعارف مصنف کے قلم سے ملاحظہ ہو۔وہ لکھتے ہیں:

"زیر نظر کتاب میں مولانا شبلی کو ان کے مکاتیب کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان کے خطوط کی مدد سے ان کی سیرت اور اخلاق و کردار کا مطالعہ کیا گیا اور ان کے خیالات اور نظریات، خدمات اور مصروفیات کا جائزہ لیا گیا ہے تا کہ شبلی کی شخصیت خطوط کے آئینہ میں صاف طور پر نظر آسکے۔یہ ایک مکمل سوانح حیات نہیں کہلائی جاسکتی اس لئے کہ اس کے ذرائع علم صرف شبلی کے مکاتیب ہیں جن کو رہنما بنایا گیا ہے، دیکھا جائے تو یہاں ان کے خطوط کے اقتباسات کو اس طرح مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ مولانا شبلی کی خود نوشت سوانح بن جائے، اس اعتبار سے اس میں جو کچھ پیش کیا گیا وہ مستند ہے، یعنی جو کچھ لکھا گیا اس کی توثیق میں خود مولانا کی تحریروں کو پیش کیا گیا ہے۔"

(شبلی مکاتیب شبلی کی روشنی میں اظہار مؤلف)

سندھ ہی میں سید یحیٰ احمد ہاشمی[۱۹۲۵-۱۹۹۵ء] نے خطوط کی روشنی میں شبلی کا ذہنی ارتقاء کے نام سے معرکہ آرا کتاب لکھی، اسی کی ارتقائی شکل ڈاکٹر خالد ندیم صاحب کی کتاب "شبلی کی آپ بیتی" ہے، جسے دارالمصنفین نے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے ڈاکٹر معین الدین انصاری کی کتاب کی تعریف و تحسین کی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس سے دوسرے ادیبوں کی زندگی کا مطالعہ ان کے خطوط کی روشنی میں کیا جائے گا۔ڈاکٹر زور نے اپنے مقدمہ میں تصانیف شبلی کو ادب عالیہ قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

"شبلی نعمانی اردو کے ایک ایسے باغ و بہار ادیب تھے جنھوں نے تاریخ، ادب، تحقیق، تنقید اور انشا پردازی کے گوناگوں میدانوں کو گل و گلزار بنا دیا۔ان سے

پہلے اردو ادب کا دامن ان تمام اصناف انشا پردازی کے گلدستوں سے خالی تھا۔ آج ان کی اکثر کتابیں اردو کے ادب عالیہ میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔''

(ایضاً،ص:الف)

ڈاکٹر زور بھی علامہ شبلی کے اسلوب پر فریفتہ ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''مضمونوں اور موضوعوں کی رنگا رنگی کے علاوہ اسلوب بیان کی شگفتگی کے باعث بھی وہ اردو کے ایک بہت بڑے ادیب مانے گئے ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ زبان کی رنگینی اور طرز بیان کی دلکشی ان کی بڑی سے بڑی کتاب سیرۃ النبی سے لے کر ان کے چھوٹے مضمون بلکہ ایک مختصر سے خط میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے اور میری نظر میں ان کی ذات مجمع الصفات تھی اور وہ اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز تھے۔'' (ایضاً،ص:الف)

ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب روح تنقید کے دیباچہ میں شبلی کے بارے میں لکھا ہے کہ

''علامہ شبلی نعمانی ایک اور ہی فضا کے لئے پیدا کیے گئے تھے، لیکن آفریں ہے ان کی ہمت پر کہ انھوں نے جہاں ایک طرف مذہبی قدس حاصل کیا دوسری طرف ادبیات کا دامن بھی نہیں چھوڑا اور سر سید اور آزاد کی طرح اس کو اپنے ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے جانشینوں کی ایک مستقل جماعت تیار کر دی جو انہی کی طرح ایک ہاتھ میں مذہب اور دوسرے ہاتھ میں ادبیات سنبھالے ہوئے ہے۔

شبلی کا دماغ علم و کمال کا گہوارہ تھا اپنے زمانے کی بساط کے موافق انھوں نے حتی الامکان فارسی شعریات پر دستگاہ حاصل کر لی تھی اور کیا یہ کچھ تعجب کی بات ہے کہ ان کی ایک شخصیت میں شاعر، نقاد، سیرت نگار اور فلسفی کی شاندار حیثیتیں جمع ہو گئی تھیں۔''

(روح تنقید،ص:۲۵،حیدرآباد،۱۹۲۵ء)

(۹۱)

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

[۱۹۰۵-۱۹۸۱ء]

مولانا امتیاز علی خاں عرشی اردو کے نامور ادیب، محقق ومصنف اور ماہر غالبیات تھے۔ تاحیات رام پور رضا لائبریری سے وابستہ رہے۔ ان کی پوری زندگی علم وادب اور تحقیق وتدقیق میں بسر ہوئی۔ متعدد اہم اور بلند پایہ کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ اسی سلسلہ تصنیفات کی ان کی ایک کاوش ''فہرست مخطوطات اردو'' حصہ اول بھی ہے۔ جو رام پور رضا لائبریری سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا مقدمہ انہوں نے بہت محنت سے اور جی لگا کر لکھا ہے۔ اس میں مذکورہ کتب خانہ کی تاریخ کا خلاصہ آگیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کے ریاست رامپور اور رضا لائبریری سے گوناگوں تعلقات رہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے فہرست مخطوطات کے مقدمہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ علامہ شبلی نے اس کے متعلق جو یادداشتیں لکھیں، مولانا عرشی نے انہیں بھی نقل کیا ہے۔ علامہ شبلی کئی بار رام پور گئے۔ ۱۸۹۰ء میں جب وہ گئے تھے تو کتب خانہ کا ایک معائنہ لکھا تھا جو درج ذیل ہے:

> ''میں نے کتب خانہ کو کسی قدر تفصیل سے دیکھا۔ چونکہ میں کتب خانہ کی ایک مفصل رپورٹ لکھنا چاہتا ہوں اس لئے اس موقع پر اسی قدر لکھنا کافی ہوگا کہ یہ ایک بے مثل کتب خانہ ہے۔ منتظمان کتب خانہ مستعد اور کارگذار ہیں۔ خصوصا مہدی علی خاں صاحب کو اس قدر واقفیت اور تجربہ ہے کہ ایسے عظیم الشان دار الکتب کی ایک ایک کتاب کا نمبر ونشان اور اس کی حالت گویا ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ فہرست کی اگر معقول ترتیب ہوجائے تو نہایت آسانی ہو۔ مولوی عبداللہ صاحب نے بہت کچھ کام کیا ہے جو قابل مدح ہے، لیکن ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔
>
> محمد شبلی نعمانی
>
> پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ۔ ۹ر ستمبر ۱۸۹۰ء

(مقدمہ فہرست مخطوطات اردو، اول ص:۱۴-۱۵)

اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے کتب خانہ رامپور کی ۱۸۸۸ء میں پہلی رپورٹ لکھی تھی۔ اب دس سال بعد انہوں نے دوسری رپورٹ لکھی ہے۔ مگر اول الذکر رپورٹ کا اب تک کہیں سراغ نہیں ملا۔

علامہ شبلی تیسری اور آخری بار ۱۹۱۴ء میں کتب خانہ رام پور تشریف لے گئے اور کتاب الرائے میں اپنے تاثرات بھی سپرد قلم کیے اور لکھا کہ

"میں اس کتب خانہ سے بارہا متمتع ہوا ہوں۔ ہندوستان کے کتب خانوں میں اس سے بہتر کیا اس کے برابر بھی کوئی کتب خانہ نہیں۔ میں نے روم و مصر کے کتب خانے بھی دیکھے ہیں، لیکن کسی کتب خانہ کو مجموعی حیثیت سے میں نے اس سے افضل تر نہیں دیکھا۔ اہل کاران کتب خانہ کی محنت اور وسعت اطلاع کی داد دینی چاہئے۔ خصوصاً مہدی علی خاں صاحب تو خود ایک زندہ کتب خانہ ہیں۔

شبلی نعمانی

۶/اپریل ۱۹۱۴ء

(ماہنامہ معارف اکتوبر ۱۹۳۴ء، ص:۳۰۲)

کتب خانہ رام پور سے متعلق علامہ شبلی نعمانی کی درج بالا تینوں تحریریں غیر مدون ہیں، یعنی علامہ شبلی کی تحریروں کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔ البتہ راقم نے انہیں حال میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "افادات شبلی" میں شامل کیا ہے۔

---

(۹۴)

ڈاکٹر سید عبداللہ

[۱۹۰۶-۱۹۸۶ء]

ڈاکٹر سید عبداللہ نامور ادیب اور محقق و نقاد تھے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کی بڑی

اہم اور قابل قدر خدمات انجام دیں۔ وہ کتب خانہ جامعہ پنجاب اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور کے مدیر رہے۔ اس حوالہ سے بھی ان کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

وہ ایک بڑے مصنف تھے۔ ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکلیں اور مقبول ہوئیں۔ چند اہم تصانیف کے نام یہ ہیں:

اردو ادب کی ایک صدی، اطراف غالب، نقد میر، سخنور، اردو ادب جنگ عظیم کے بعد، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، طیف اقبال، مباحث، سرسید اور ان کے نامور رفقاء، مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ، مقامات اقبال، مسائل اقبال، تفہیم اقبال، ولی سے اقبال تک، شعرائے اردو کے تذکرے، اشارات تنقید۔ وغیرہ

ان کا شمار ماہرین اقبالیات میں ہوتا ہے۔ اور بلاشبہ وہ اقبالیاتی ادب پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ البتہ وہ سرسید اور عہد سرسید بالخصوص شبلیات میں بھی درک رکھتے تھے۔ اس کی بہترین مثال ان کی محققانہ کتاب ''سرسید اور ان کے نامور رفقاء'' میں شامل علامہ شبلی سے متعلق ان کی تحریریں ہیں۔ علاوہ ازیں علامہ شبلی سے متعلق ان کے درج ذیل مضامین بھی شائع ہوئے:

(۱) شبلی نعمانی (۲) شبلی کے کام کی مجموعی قدر و قیمت (۳) شبلی کا اسوب بیان (۴) شبلی فکر جدید سے کیونکر روشناس ہوئے (۵) شبلی نے پھول مارا۔

اس سے ان کی شبلی شناسی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑے شبلی شناس تھے۔ انہوں اختر وقار عظیم کی مشہور کتاب ''شبلی بحثیت مورخ'' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

> ''میں اکابر کی تعریف میں کبھی کبھی مبالغہ بھی کرتا ہوں لیکن شبلی کے سلسلے میں یہ کہنا مبالغے میں شامل نہیں کہ انیسویں صدی میں جن تین چار بزرگوں کے نام ممتاز ترین کی فہرست میں شامل ہیں ان میں شبلی کو کسی دوسرے سے نیچے نہیں رکھا جا سکتا اور بعض خاص شعبوں میں تو انہیں یکتائی کا اعزاز حاصل ہے۔
>
> آج سے تیس سال قبل جب میں نے سرسید کے رفقائے کار کے حالات اور کارناموں کا مطالعہ کیا تو میں نے محسوس کیا کہ شبلی جیسے افراد صدیوں کے بعد

ظہور میں آتے ہیں۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

میر

تاریخ، سوانح عمری، علم الکلام، ادب، تاریخ ادب، تنقید شاعری، سیاسی تبصرہ نگاری، مضمون نگاری، تعلیمی تبصرہ نگاری، ان فنون میں سے ہر ایک میں شبلی امتیاز کامل کے مالک نظر آتے ہیں۔ قدیم روایت کی نئی تعبیر اور نئی پیش کش تو ان کا کارنامہ خاص معلوم ہوا۔" (شبلی بحیثیت مورخ، ص:۱)

---

(۹۳)

مالک رام

[۱۹۰۶-۱۹۹۳ء]

مالک رام اردو کے نامور ادیب، محقق اور ماہر غالبیات تھے۔ انھوں نے اردو کی متنوع خدمات ایک عرصے تک انجام دیں۔ کتابیں لکھیں۔ تذکرے لکھے۔ معاصرین کی بزم سجائی، انہوں نے تذکرہ ماہ و سال مرتب کر کے اہل قلم کو انتہائی گراں قدر علمی تحفہ پیش کیا جس سے شاید ہی کوئی اہل قلم بے نیاز ہوگا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اسلامیات پر بھی قلم اٹھایا۔ اور "عورت اور اسلامی تعلیم"، جیسی کتاب لکھی جو کافی پسند کی گئی۔

مالک رام کی ایک حیثیت ابوالکلام شناس کی بھی ہے۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] سے بہت متاثر تھے۔ ان کی تصانیف کو انھوں نے بڑی دقت نظری سے پڑھا اور مرتب کیا اور اس کے محقق ایڈیشن شائع کیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

تذکرہ، غبار خاطر، تفسیر اور خطوط ابوالکلام آزاد کو انہوں نے جس طرح جی لگا کر مرتب کیا ہے وہ بس انہی کا حصہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر چلے اور بات علامہ شبلی تک نہ پہنچے؟ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ مالک رام نے ''غبار خاطر'' ایڈٹ کیا تو اس پر ایک بڑا شاندار تحقیقی اور انتہائی معلوماتی مقدمہ لکھا، چونکہ غبار خاطر کے مکتوب الیہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے جو حبیب شبلی سے معروف ہیں اور ان کی آزاد سے ملاقات علامہ شبلی ہی کی وساطت سے ہوئی تھی۔ چنانچہ مالک رام نے اس ملاقات کی تاریخ کی تعیین کی ہے اور اس پس منظر میں انھوں نے علامہ شبلی کی اور بھی خصوصیات لکھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''نواب صدر یار جنگ سے مولانا آزاد کے تعلقات ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں مولانا شبلی مرحوم واسطۃ العقد ثابت ہوئے، جن سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء کے وسط میں بمبئی میں ہوئی تھی۔ جب یہ مولانا شبلی سے ملے تو وہ ان کی وسعت مطالعہ، ذہن کی براقی اور حافظے سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ خود ان دنوں حیدر آباد میں ملازم تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کو دعوت دی کہ یہاں آجاؤ اور الندوہ کی ترتیب وتدوین اپنے ہاتھ میں لے لو، لیکن مولانا آزاد کسی وجہ سے یہ دعوت قبول نہ کر سکے۔'' (مقدمہ غبار خاطر، ص:۱۲)

علامہ شبلی کی اس پیشکش پر تبصرہ کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

> ''یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا شبلی کی عمر اس وقت ۴۸ رسال تھی اور مولانا آزاد کی ۱۷ ر کے لگ بھگ۔ اس وقت ملک کے علمی حلقوں میں شبلی عالم اور ادیب اور مصنف کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے، اور الندوہ بھی یکسر علمی پرچہ تھا ایسی صورت میں ان کا اس نوجوان کو اپنا ہم کار بننے اور اس علمی رسالے کی باگ ڈور سنبھالنے کی دعوت دینا، جہاں ایک طرف ان کی اپنی وسعت قلب اور علم دوستی، قدر شناسی اور خورد نوازی کا بین ثبوت ہے، وہیں مولانا آزاد کے غیر معمولی علم وفضل اور صلاحیتوں کا بھی بہت بڑا اعتراف ہے۔'' (ایضاً، ص:۱۲-۱۳)

اس کے بعد مالک رام نے مولانا آزاد اور شروانی صاحب کی ملاقات کی تاریخ معین کرنے کی کوشش کی ہے اور علامہ شبلی ہی کے ذکر سے اس کا آغاز کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس کے تھوڑے دن بعد مولانا شبلی حیدر آباد سے مستعفی ہو کر اگست ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں دار العلوم ندوۃ العلما کے معاملات میں گویا کرتا دھرتا بن گئے۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے تجدید دعوت کی۔ اب کی مولانا آزاد نے اسے قبول کر لیا، چنانچہ یہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک سات مہینے الندوہ لکھنؤ کے ادارہ تحریر سے منسلک رہے۔ نواب صدر یار جنگ سے ملاقات اسی ۱۹۰۶ء کی پہلی سہ ماہی میں ہوئی تھی۔ مولانا شبلی اور نواب صاحب مرحوم کے باہمی تعلقات کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ مولانا آزاد بھی لکھنؤ کے دوران قیام میں دار العلوم میں مولانا شبلی ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ اسی لئے میرا گمان ہے کہ جب نواب صاحب اس زمانے میں لکھنؤ گئے تو مولانا شبلی کے مکان پر ان دونوں کی ملاقات ہوئی ہو گی۔'' (ایضاً)

اگرچہ مالک رام صاحب کا خیال قرین قیاس ہے، تاہم قطعی تو بالکل نہیں ہے۔ البتہ یہاں شبلی و آزاد کی ملاقات کا مالک رام نے قطعیت سے ذکر کیا ہے۔ مالک رام کی قطعیت کے بعد شاید اس پر طویل مقالہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہو گی۔

مالک رام کا ایک مفصل مقالہ ''اردو میں تحقیق'' ہے۔ اس میں انہوں نے تحقیق کی تاریخ اختصار سے قلم بند کی ہے۔ اس میں علامہ شبلی کو بحیثیت محقق شامل کیا گیا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے تازیانہ ہے جو لوگ علامہ شبلی کو محقق خیال نہیں کرتے۔ یہی نہیں انہوں نے ان کے معاصر اہل قلم پر انہیں ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ علامہ شبلی محقق تھے اور بڑے محقق تھے۔ اس کی بہترین مثال ان کی تصنیفات کے علاوہ ان کے تاریخی اور تحقیقی مقالات ہیں۔ اب ہم مالک رام کا اقتباس نقل کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ انہوں نے علامہ شبلی کو محققین میں کیونکر شامل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حالی کا کام محدود سطح پر تھا، انہوں نے سیرت سے باہر قدم نہیں رکھا۔ ان کی مثال زیادہ سے زیادہ اسی میدان میں لوگوں کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ اس سے عام تحقیقی ذوق اور تجسس کی خواہش نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ کام ان کے ہم عصر مولانا

شبلی نعمانی (ف: نومبر ۱۹۱۴ء) نے کیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جو پرانے ماحول میں پیدا ہوا، جس کی پوری تعلیم پرانے مکتبی انداز میں ہوئی، جسے مغربی زبانوں کی کچھ یونہی برائے نام سی شدبد تھی، اس نے تحقیق کے میدان میں ایسے دیرپا آثار چھوڑے ہیں! اس میں شک نہیں کہ یہ علی گڑھ کے قیام اور سرسید کی صحبت کا فیضان تھا۔ حالی کی طرح انہوں نے بھی چند سوانح عمریاں لکھیں لیکن ان کے علاوہ انہوں نے تذکرہ نویسی اور تحقیقی مقالات میں بھی قابل قدر کام کیا۔ شعرالعجم (۱۹۰۸-۱۹۱۰ء) اگرچہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے، لیکن اردو میں لکھا گیا ہے۔ یہ اردو داں طبقے کے لئے فارسی زبان میں کی عہد بعہد ترقیوں اور مختلف اصناف سخن سے تعارف کا بہت اچھا ذریعہ ثابت ہوا۔ اس کی تدوین میں ان سے بعض تاریخی غلطیاں ہوئیں، کچھ تو اس لئے کہ کئی ماخذ اور مراجع کی کتابیں شعرالعجم کے زمانہ تالیف تک شائع نہیں ہوئیں تھیں، یا آسانی سے دستیاب نہیں ہوسکتی تھیں، اور کچھ اس لئے بھی کہ خود شبلی نے سہل انگاری سے کام لیا۔ انہوں نے دوسروں کی لکھی لکھائی باتوں اور تاریخوں پر اعتماد کر کے خود جستجو کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور انہیں بجنسہ شعرالعجم میں درج کر دیا۔ شبلی بے شک مورخ تھے۔ ان کا تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حافظہ بہت اچھا پایا تھا، جو پڑھا تھا وہ مستحضر تھا، لیکن ان میں ایک بات کی افسوس ناک کمی ہے کہ وہ بالعموم اختلافی مسائل میں اپنی رائے دینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی نظریے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اور انہیں اپنی تائید میں کچھ دلائل وشواہد مل جائیں، تو پھر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ زیادہ تگ و دو کر کے مخالف کے دلائل بھی دیکھ لیں، یا ان کی تردید کی کاوش کریں۔ مثال کے طور پر شعرالعجم کو لیجئے۔ اس میں انہوں نے سنین سے متعلق بیشتر یہ روش اختیار کی ہے کہ اگر مختلف تذکروں میں کسی شخص کی ولادت یا وفات کی مختلف تاریخیں ہیں تو انہوں نے یہ سب جوں کی توں نقل کر دی ہیں۔ اور یہ محاکمہ کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ ان میں سے کون سی

درست ہے اور کون سی غلط۔ یا مثلاً موازنہ انیس و دبیر کو لیجئے، اس میں انہوں نے انیس کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں، ان کے مقابلے میں دبیر کے کسی ایک آدھ شعر کی مثال دے کر انیس کے لئے وجہ ترجیح پیدا کر لی ہے۔ حالاں کہ دبیر کے کلام سے اس سے بہتر مثالیں مہیا ہو سکتی تھیں، لیکن چونکہ اس سے ان کے نظریے کے کمزور یا غلط ثابت ہو جانے کا اندیشہ تھا، ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ بے شک انیس اس سے بھی زیادہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں جتنی شبلی نے کی ہے۔ لیکن یہ دبیر کے صحیح کمالات سے چشم پوشی کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتی!

شبلی کے تحقیقی کام کی بہترین مثال ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ہیں۔ المامون [م:۱۸۸۷ء]، سیرۃ النعمان [۱۸۹۲ء]، الفاروق [۱۸۹۸ء]، الغزالی [۱۹۰۲ء] سوانح مولانا روم [۱۹۰۶ء] سیرۃ النبی انہوں نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں لکھنا شروع کی تھی۔ صرف پہلی جلد مکمل ہوئی تھی اور دوسری پر کام جاری تھا کہ 'خاتمہ بالخیر' کا پیغام آ گیا۔ یہ دونوں جلدیں ان کی وفات کے بعد ان کے تلمیذ رشید مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۹۱۸ء میں اور اس کے بعد شائع کیں۔ ان سب کتابوں میں واقعات کی تحقیق، ان کی ترتیب اور در و بست، اخذ نتائج وغیرہ ہر ایک بات قابل تعریف ہے۔ اب ان موضوعوں سے متعلق کچھ اور لکھنا محال ہے۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ انہوں نے کچھ خاص موضوعات سے متعلق بھی داد تحقیق دی ہے۔ اس ذیل میں ان کے بعض مضامین بڑے معرکے کے ہیں۔ مثلاً ایک زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ مسلمانوں نے مصر فتح کرنے کے بعد اسکندریہ کا کتاب خانہ جلا دیا تھا۔ مولانا نے تحقیق سے ثابت کر دیا [۱۸۹۲ء] کہ یہ مسلمانوں پر افترا اور اتہام ہے۔ یہ کتاب خانہ فتح مصر سے مدتوں قبل رومیوں کے زمانے میں جل چکا تھا۔ اسی طرح ان کے مضامین مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم [۱۸۸۷ء] اسلامی کتاب خانے [۱۸۹۲ء]، اسلامی

حکومتیں اورشفا خانے [۱۸۹۵ء]، الجزیہ [۱۸۹۵ء] وغیرہ بڑی دیدہ وری اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔ان میں سے بعض مضامین دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوکر مقبول ہوئے۔

شبلی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت ان کے اسلوب بیان کی شگفتگی اور دلکشی ہے۔بلاغت کے اصول جانتے ہیں۔انہوں نے ہر موقع پر اس کی مناسبت سے زبان استعمال کی ہے۔اسی باعث ان کی بیشتر کتابیں انشا کا بہت اچھا نمونہ ہیں اور آج بھی اسی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں، جس طرح جب وہ پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھیں۔

اردو کی خوش قسمتی، شبلی کو شاگرد بھی ایسے میسر آ گئے جنہوں نے ان کے کام کو آگے بڑھایا۔دارالمصنفین کا منصوبہ ان کے ذہن میں پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں آیا تھا، لیکن اس تجویز کی اشاعت انہوں نے اپنی وفات سے چند مہینہ پہلے ۱۹۱۴ء میں کی۔اور تکمیل موت سے شاید دو ہفتہ قبل ہوئی۔بارے ان کے تلامذہ نے ان کے کام کو جاری رکھا۔اسلامی تاریخ پر بہت بلند پایہ کتابیں یہاں سے شائع ہوکر قبول عام کا مقام حاصل کر چکی ہیں۔خود سید سلیمان ندوی مرحوم [ف: نومبر ۱۹۵۳ء] نے ارض القرآن، عرب وہند کے تعلقات، سیرت عائشہ، خیام وغیرہ کی سی تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔انہیں نے اپنے استاد کی مفصل اور مستند سوانح عمری بھی حیات شبلی کے عنوان سے لکھی۔شبلی کے ایک دوسرے شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی [ف: اکتوبر ۱۹۵۶ء] نے بھی اس سلسلے میں مفید کام کیا۔ان کی کتابیں سیرت عمر بن عبدالعزیز، امام رازی، سیر الصحابہ کے پہلے دو حصے وغیرہ محنت سے لکھی گئی ہیں۔انہوں نے شعر العجم کے تتبع میں شعر الہند بھی لکھی تھی، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔دارالمصنفین کا فیضان اب بھی جاری ہے۔"

(اردو میں تحقیق، ص: ۱۱-۱۳)

---

(۹۴)

یحییٰ اعظمی

[۱۹۰۶-۱۹۷۲ء]

معتقد شبلی یحییٰ اعظمی مرحوم دبستان شبلی کے نہایت ممتاز اور خوش فکر شاعر تھے۔ان کی قومی وملی نظموں نے ایک زمانہ میں بڑی مقبولیت پائی۔سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی، ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ جیسے ارباب کمال ان کی شاعری کے مداح تھے۔مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور فخر الدین علی احمد سے یحییٰ اعظمی کی خط وکتابت بھی تھی۔ناچیز نے ان کے نام ان ارباب کمال کے متعدد خطوط دیکھے ہیں۔

یحییٰ اعظمی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں داد سخن دیتے تھے۔ان کے کلام کے دو مجموعے ''نوائے حیات'' اور ''نوائے عصر'' شائع ہوئے۔جس میں نظمیں غزلیں اور متفرق اصناف میں طبع آزمائی موجود ہے۔وہ بھی کمال فن کے ساتھ۔یحییٰ اعظمی کو علامہ شبلی سے بڑی عقیدت تھی۔ان کے مجموعہ میں علامہ شبلی پر جو نظم شامل ہے وہ اس کا ایک بڑا ثبوت ہے۔راقم الحروف نے اپنی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' میں بھی اس نظم کو شامل کیا ہے۔اس کا یہ شعر بہت مقبول ہوا تھا اور اب بھی جا بجا نقل کیا جاتا ہے:

کہیں صدیوں میں ہوتا ہے یہ فیض خاص ربانی
نہیں اٹھتے ہمیشہ دہر میں شبلی نعمانی

یحییٰ اعظمی نے اپنے ذوق ووجدان کو شبلی وسہیل سے متاثر بتایا ہے۔''نوائے حیات'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

> ''ارباب نظر جانتے ہیں کہ نوائے حیات اس دور ادب کا ایک مرقع ہے جسے حضرت شبلی سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔چونکہ ملک میں نئے ادب کے غلو کے باوجود ابھی شبلی مکتب ادب کے ذوق شناس موجود ہیں اس لئے امید ہے ایک معتقد شبلی کی یہ حقیر ادبی کوشش حسن قبول سے محروم نہ رہے گی۔''

(نوائے حیات دیباچہ، ص:۳، طبع دوم ۱۹۵۰ء)

یحیٰ اعظمی دارالمصنفین کے دفتر میں ملازم تھے۔اور مدۃ العمر دارالمصنفین سے وابستہ رہے۔۱۹۷۲ء میں انتقال کیا۔شہر اعظم گڑھ میں مسلمانوں کے عام قبرستان میں مدفون ہیں۔

---

(۹۵)

سید عابد علی عابد

[۱۹۰۶-۱۹۷۱ء]

سید عابد علی عابدؔ ادیب، شاعر، افسانہ نگار، نقاد، محقق، مدون، مترجم اور ایک بڑے مضمون نگار تھے۔ ان کے قلم سے کئی کتابیں نکل کر شائع ہوئیں۔ان میں انتقاد، اصول انتقاد ادبیات، شعر اقبال، تلمیحات اقبال، تنقیدی مضامین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

وہ ایک بڑے مضمون نگار بھی تھے۔دو سو سے زاید علمی وادبی مضامین لکھے جو ادبی مجلات کی زینت بنے۔ بہت سے غیر مطبوعہ مضامین بھی ان کی یادگار ہیں۔

وہ دیال سنگھ کالج لاہور میں اردو و فارسی کے استاد اور پرنسپل رہے۔مجلس ترقی ادب اور مجلّہ صحیفہ لاہور سے بھی وابستہ رہے۔انہوں نے محض دو کتابیں مرتب کیں اور دونوں علامہ شبلی کی تصنیف ہیں، جنہیں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔موازنہ انیس و دبیر کو ۱۹۶۴ء میں اور سوانح مولانا روم کو ۱۹۷۱ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا۔

موازنہ انیس و دبیر پر انہوں نے ایک طویل اور مفصل تحریر بطور تقدیم لکھی ہے جو تقریباً نوے صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سے نہ صرف اردو مرثیہ نگاری، موازنہ انیس و دبیر اور متعلقات مراثی پر ان کی گہری اور تنقیدی نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ابتک موازنہ پر موافق ومخالف جو کچھ لکھا گیا ہے، ان سب پر سید عابد علی عابد کی نگاہ ہے، مگر وہ یہاں ایک محقق سے زیادہ نقاد نظر آتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ دبیر کے مداحوں میں شامل ہیں۔ایک حصہ میں انہوں نے علامہ شبلی کے حالات اور ان کے بعض افکار و نظریات پر روشنی ڈالی ہے، مگر ان کی

معلومات بہت سطحی محسوس ہوتی ہیں ۔حتیٰ کی متعدد غلط بیانیاں بھی پائی جاتی ہیں ۔تاہم سید عابد علی عابد سے یہ افتخار کہ انہوں نے سب سے طویل مقدمہ لکھا ہے بعد کے بعض اہل قلم کی کتابوں کی وجہ سے باقی نہیں رہ پاتا ۔مثلاً ڈاکٹر ارشاد نیازی [پ:۹رجنوری ۱۹۶۸ء] کی کتاب ''موازنہ انیس و دبیر: مطالعہ، محاسبہ اور تجزیہ'' ان سے بھی زیادہ مفصل مطالعہ و تجزیہ ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ یہ تجزیہ مثبت انداز کا ہے۔

سوانح مولانا روم کا محقق نسخہ راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ بلاشبہ سید عابد علی عابد نے محنت اور جی لگا کر تحقیق و تدوین کا کام کیا ہے ۔حتیٰ کہ مثنوی معنوی کے معتبر نسخہ سے ملا کر اشعار درست کئے ہیں ۔۸۷ر صفحات کے مقدمہ کے کسی ایک لفظ سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ انہوں نے کوئی تاثر لیا ہو، مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ علامہ شبلی سے متاثر تھے ۔اکثر رد عمل بھی تاثر ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، جسے عموماً متاثرین کی فہرست میں رکھا جاتا۔

---

(۹۶)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

[۱۹۰۸-۱۹۸۵ء]

مدیر ماہنامہ برہان دہلی مولانا سعید احمد اکبرآبادی بڑے نامور اہل قلم گذرے ہیں۔ انھوں نے متعدد بلند پایہ کتابیں سپرد قلم کیں ۔وہ علامہ شبلی سے ابتدائے عمر سے بہت متاثر تھے۔ خاص طور پر ان کے ادب و انشا اور طریقہ تحقیق و تصنیف سے، جس کا ذکر انھوں نے خود نوشت ''غبار کارواں'' میں کیا ہے۔

ان کی مشہور کتاب صدیق اکبر جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ میرے پیش نظر ادارہ اسلامیات لاہور کا ایڈیشن ہے، جس پر سنہ طباعت ۱۴۱۰ھ لکھا ہوا ہے ۔اصلاً یہ طبع اول کا عکس ہے ۔چونکہ علامہ شبلی نعمانی نے خلفائے راشدین میں حضرت عمرؓ کی سوانح عمری ''الفاروق'' لکھی ہے ۔صدیق اکبرؓ سے پہلے الفاروق لکھنے کا سبب بیان کرتے ہوئے مولانا اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''اردو زبان میں مولانا شبلی کی کتاب الفاروق جو خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کے سوانح حیات اور آپ کے کارناموں کا محققانہ تذکرہ ہے اردو زبان کے ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور جب تک یہ کتاب موجود ہے مولانا کا نام روشن رہے گا، اگرچہ ترتیب اور اہمیت کے اعتبار سے مولانا کو پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تذکرہ لکھنا چاہئے تھا لیکن حضرت عمرؓ کے دور میں جو عظیم الشان فتوحات ہوئیں اور پھر دہ سالہ مدت خلافت میں آپ نے سیاسی نظم ونسق، اجتماعی وتمدنی، اقتصادی اور سماجی مسائل کے حل کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ان سب کے پیش نظر مولانا نے ہیروز آف اسلام کی تاریخ کا جو پروگرام بنایا تھا اس کے لئے سب سے زیادہ کشش حضرت عمرؓ کے تذکرہ میں ہی تھی اور مولانا نئی نسل کو اسلام کی تاریخ سے متاثر کرنے کا جو جذبہ رکھتے تھے خلفائے راشدین میں اس جذبہ کی تکمیل کا سامان غالباً سب سے زیادہ الفاروق سے ہی ہوسکتا تھا۔'' (صدیق اکبر، ص:۲۲-۲۳)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے تصانیف شبلی کے اثرات کا فراخدلی سے اعتراف کیا ہے، اور لکھا ہے کہ

''مولانا شبلی کی کتابوں میں سب سے پہلے غالباً میں نے المامون اور الغزالی پڑھیں۔ مولانا کے انداز نگارش، طرز تحقیق اور طریقہ بحث نے دل پر عجیب اثر کیا اور میں مولانا کی تحریروں کا ایسا گرویدہ ہوگیا کہ میں نے آپ کی سب کتابیں خرید کیں اور پڑھیں۔ الفاروق اور سیرۃ النبیؐ جلد اول کئی بار پڑھیں اور ان دونوں کتابوں کے مقدمے تو خدا جانے کتنی مرتبہ پڑھے ہیں، ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔''

(مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص:۷۱)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم ہی نے سنجیدہ علمی ذوق کی طرح ڈالی۔ (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص:۷۲)

یہی وجہ ہے کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جب پروفیسر تھے اور طلبہ کو ریسرچ کراتے

تھے تو ریسرچ کے طلبہ کو مطالعہ وتحقیق کا مشورہ دیتے یا ان کی رہنمائی کرتے تو انہیں علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تصنیفات الفاروق، شعرالعجم اور حیات شبلی وغیرہ کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے مطالعہ سے طلبہ کو تحقیق وتجزیہ اور تصنیف وتالیف کا سلیقہ آتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی شاید قابل ذکر ہے کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی علمائے دیوبند میں پہلے ایسے اہل علم اور صاحب قلم ہیں جنہوں نے علامہ شبلی کی عظمت کا برملا اعتراف کیا ہے۔

---

(۹۷)

غلام عباس ایم اے

[***]

''کلیات شبلی'' کی تدوین واشاعت سے پہلے علامہ شبلی کے اردو کلام کے کئی مجموعے دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ اور لاہور سے شائع ہوئے۔ ان کا تعارف راقم نے ''آثار شبلی'' میں کرایا ہے۔

''آثار شبلی'' کی اشاعت کے بعد ایک اور اردو کلام کا مجموعہ دستیاب ہوا ہے جو مرغوب ایجنسی لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ چونکہ علامہ شبلی کے نام کے ساتھ مرحوم لکھا ہوا ہے اس سے واضح ہے کہ یہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس پر کسی مرتب کا نام درج نہیں ہے۔ البتہ دیباچہ غلام عباس ایم۔اے [۱۹۰۹-۱۹۸۲ء] کے قلم سے ہے۔

۱۲ر صفحے کے دیباچے میں غلام عباس نے علامہ شبلی کے اجمالی حالات اور کارناموں کا ذکر تسلسل سے کیا ہے۔ اور ان کا انداز بڑا دلآویز اور دلکش ہے۔ اس سے حیات شبلی کی بعض تاریخوں کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔

علامہ شبلی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن نامزد کیے گئے تھے۔ حیات شبلی میں اس کا ذکر رہ گیا ہے۔ سوانح مولانا روم کے سرورق پر رکن رائل ایشیاٹک سوسائٹی لکھا ہوا ہے۔ اس سے ان کی رکنیت کا پہلی بار علم ہوا۔ غلام عباس نے بصراحت لکھا ہے کہ ۱۸۹۴ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی

کے رکن نامزد ہوئے۔ (مجموعہ کلام شبلی، ص:۸)

اسی طرح ایڈمبرا اسلامک سوسائٹی لندن کی صدارت کے ذکر سے بھی ''حیات شبلی'' خالی ہے۔ راقم کو ماہنامہ الندوہ میں شائع ایک خط سے معلوم ہوا تھا کہ علامہ شبلی اس کے صدر نامزد کیے گئے تھے۔ غلام عباس نے اس کی تاریخ بھی بصراحت ۱۹۰۸ء لکھی ہے۔ (ایضاً ص:۱۰)

غلام عباس نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے علامہ شبلی کی علاحدگی کا سال ۱۸۹۴ء لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ وہ سرسید احمد خاں کی وفات ۱۸۹۸ء کے بعد اسی سنہ میں مستعفی ہوئے۔

غلام عباس نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس مختصر سے دیباچے میں علامہ کی زندگی اور خدمات کا پورا مرقع کھینچ دیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ان ایام میں ملکی معاملات میں گہری دلچسپی ظاہر کی اور ینٹل کانفرنس میں شریک ہوئے، قانون وقف علی الاولاد کے معاملہ کو پریوی کونسل تک پہنچایا۔ اشاعت اسلام کی ایک عظیم الشان اسکیم تیار کی مگر ناکام رہے۔ سلطان ترکی کی طرف سے آپ کا نام نامی مدینہ یونیورسٹی کے واضعین نصاب میں داخل کیا گیا، اسی اثنا میں کاروبار کی زیادتی سے طبیعت کسل مند ہوتی گئی۔'' (ایضاً ص:۱۰-۱۱)

غلام عباس نے اس مقدمہ میں بڑی ادبی اور انشا پردازانہ نثر لکھی ہے۔ مثلاً سیرۃ النبیؐ کی تالیف، وفات اور پھر ماتم پر ان کے قلم کی ادبیت اور انشا پردازی ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''ابھی ایک چنگاری گوشہ دل میں مستور تھی جس کی صراحت سے دردمند دل کو رشک طور ہونا تھا۔ پیارے نبیؐ کے پیارے حالات لکھنے شروع کیے اور سیرۃ نبویؐ کی پہلی جلد چھپ کر تیار ہوئی۔ ابھی مرغ جال چیدہ چیدہ ذرات زریں چن ہی رہا تھا کہ فرشتہ غیب نے آواز دی، بس شبلی۔ خرمن سے دانہ اور سمندر سے قطرہ ہی عقل مندوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔ تو بھلا ان گنت موتیوں کو کس طرح جمع کر سکتا ہے۔ جس نور کی یہ کرنیں ہیں اس نور کے دیکھنے کی تمنا ہے تو چل میرے ساتھ۔ عاشق جان روانہ ہوئی۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو دنیا چھوڑا اور بہشت کو آباد کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون.

منتظر آنکھیں سیرۃ کی تکمیل دیکھتی رہ گئیں

اشک پیہم سے دامان عالم تر ہوا۔شبلی کی وفات سے دنیا میں کہرام مچ گیا۔ ہندوستان، مصر، جرمن، انگلستان میں ماتم ہوا، کسی نے کہا تاریخ کا تنہا جوہری چل بسا۔تاریخ شاعری کا موجد کوچ کر گیا،علم کلام کا عقاب آشیان تحقیق خالی چھوڑ گیا، انشا پردازی کا شہسوار غائب ہوگیا،نہیں وہ آفتاب جو ہنگامہ مشرق کی سرخی میں نمودار ہوا تھا،محاربہ مغرب کی لالہ کاری میں غروب ہوگیا۔''

(ایضاً،ص:۱۱-۱۲)

نثر کے اس افسانوی انداز سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کہیں مشہور افسانہ نگار غلام عباس تو نہیں ہیں۔؟

---

(۹۸)

حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی

[۱۹۰۹-۲۰۰۹ء]

مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی ایک نیر تاباں تھے۔ان کی بڑی عظیم الشان خدمات ہیں۔ مدۃ العمر انتہائی خاموشی سے علم وادب کی خدمت انجام دی۔ان کے قلم سے مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زاید کتابیں نکل کر مقبول ہوئیں۔ان کی بعض تصنیفات ایسی ہیں کہ افراد نہیں ادارے مل کر تصنیف کرتے تب بھی برسوں لگ جاتے۔صحیح یہ ہے کہ حکیم صاحب خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔گراں مایہ تصنیفات کے علاوہ انہوں نے لغات پر جو کام کیا ہے، اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔اور ایک زمانہ اس سے استفادہ کرے گا۔افسوس ہم ایسے اہل علم کی ان کی زندگی میں شایان شان قدر نہیں کرتے۔راقم نے ان کی حیات وخدمات پر ایک مفصل مقالہ لکھا ہے جو مجموعہ مضامین ''مطالعات ومشاہدات'' میں شامل ہے۔

حکیم صاحب کی ایک کتاب ''مآثر امام اعظم'' ہے۔اور اچھی کتاب ہے۔اس کے

دیباچے میں انہوں نے امام اعظم پر لکھی جانے والی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کی ''سیرۃ النعمان'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مجھے اس بات کا فخر ہے کہ اردو زبان میں سب سے پہلے جو کتاب امام ابوحنیفہ پر آئی وہ علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النعمان ہے جو انیسویں صدی کے آخر میں تالیف کی گئی۔ درحقیقت یہ کتاب اردو زبان میں امام ابوحنیفہؒ کے مالہ وماعلیہ پر جس تحقیق اور جس دقت نظر سے لکھی گئی ہے اردو زبان کا پورا لٹریچر اس سے بہتر تالیف اب تک پیش نہ کرسکا۔'' (مآثر امام اعظم، ص:۲۰)

---

(۹۹)

مولانا مسعود عالم ندوی

[۱۹۱۰-۱۹۵۴ء]

مولانا مسعود عالم ندوی ندوہ کے ممتاز فرزند اور مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد تھے۔ وہ اردو اور عربی کے ادیب وانشاپرداز اور نامور مصنف تھے۔ انہوں نے متعدد کتابیں سپرد قلم کیں، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، عربوں کی قومی تحریک، اسلام اور اشتراکیت، محمد بن عبدالوہاب، محاسن سجاد، مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات وغیرہ ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی سے ان کی مراسلت تھی۔ ان کے مکاتیب کا ایک مجموعہ مکاتیب سلیمان بھی شائع کیا۔ اس کے دیباچہ میں علامہ شبلی کا ذکر ہے۔ دارالمصنفین کی مطبوعات میں ''کوما'' کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''اسی طرح علامات وقفہ میں رسالہ 'معارف' صرف کوما (،) استعمال کرتا ہے۔ اور یہ استاذ الاساتذہ مولانا شبلی کی سنت ہے۔'' (مکاتیب سلیمان، ص:۸)

پتہ نہیں اس سنت کا ذکر مولانا مسعود عالم ندوی کی تحقیق ہے یا انہیں سید صاحب سے معلوم ہوا تھا۔ ناچیز راقم کو علامہ شبلی کے مسودات اور خطوط وغیرہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ علامہ

شبلی نے کوما، فل اسٹاپ اور قوسین کا بھی استعمال کیا ہے۔

اسی مقدمہ میں انہوں نے ایک اور بات لکھی ہے کہ

''مکاتیب میں حضرۃ الاستاذ (سید صاحب) نے بار ہا استاذ الاساتذہ مولانا شبلی سے اپنی وفاداری و وفا شعاری کا تذکرہ فرمایا ہے اور واقعی یہ سید صاحب قبلہ کا ایسا وصف ہے جس میں سید رشید رضا مرحوم [ف:۱۳۵۳ھ] کے سوا کوئی ان کا مثیل نہیں۔ سید رشید رضا اور حضرۃ الاستاذ دونوں علم و فضل میں اپنے اساتذہ شیخ محمد عبدہ [ف:۱۳۲۳ھ] اور مولانا شبلی نعمانی [ف: ۱۳۳۲ء] سے کہیں بڑھے ہوئے تھے، مگر دونوں نے ان کی شخصیتوں میں اپنے فضل و کمال کو جس طرح گم کرنے کی کوشش کی، وہ وفا شعاری کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔'' (مکاتیب سلیمان، ص:۱۳)

مطالعہ شبلی کے دوران مولانا سید سلیمان ندوی کے بعض تلامذہ کی جانب سے اس نوع کی بعض باتیں نظر سے گذریں، جن سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقع پر سید صاحب نے اعتراف عظمت شبلی کے جن اسباب کا ذکر حیات شبلی میں کیا ہے وہ پیش کیا جا سکتا ہے، مگر اس بحث کو طول دینا مناسب نہیں۔

مولانا مسعود عالم ندوی کا بیان آپ کے سامنے ہے، اسی طرح سید صاحب کے ایک دوسرے شاگرد سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اپنی تحریروں میں بالقصد دارالمصنفین کا بانی علامہ شبلی کے بجائے ہر جگہ مولانا سید سلیمان ندوی کو قرار دیا ہے۔ جو صریحاً غلط ہے۔

---

(۱۰۰)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

[۱۹۱۱-۱۹۸۷ء]

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ہندوستان کی تاریخ کے بڑے واقف کا اور ایک نمایاں

مورخ تھے۔ان کے قلم سے متعدد گراں مایہ کتابیں نکلیں اور مقبول ہوئیں۔مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی[۱۹۰۴-۱۹۷۴ء] کے بعد وہ دارالمصنفین کے ناظم ہوئے۔اس حیثیت سے بھی انھوں نے علم وادب کی بڑی خدمات انجام دیں۔علامہ شبلی سے والہانہ عشق انہیں ورثہ میں ملا تھا۔چنانچہ انھوں نے ان پر کئی مقالات لکھے اور ایک مختصر کتاب ''مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر'' کے عنوان سے لکھی۔مولانا سید سلیمان ندوی کے مجموعہ مقالات ''مقالات سلیمان'' جلد اول کے دیباچے میں لکھا ہے کہ

''استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علم وفن میں بڑی بوقلمونی تھی۔وہ نہ صرف ایک عالم دین تھے بلکہ سیرت نگار بھی، مفسر بھی، محدث بھی، متکلم بھی، ادیب بھی، شاعر بھی، نقاد بھی اور مورخ بھی تھے، مگر وہ اپنے استاذ علامہ شبلی کے اس قول کو برابر نقل فرماتے تھے کہ اصلی فن تو تفسیر، حدیث اور علم کلام ہے۔ادب و تاریخ تو علمی دسترخوان کی محض چٹنی ہے جو زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے دسترخوان پر ہوتی ہے۔اسی طرح ادبی وتاریخی مضامین محض علمی ذائقہ بدلنے کے لئے لکھے جاتے ہیں، ان کا عمل اسی پر رہا۔'' (مقالات سلیمان، حصہ اول، ص:۱)

چونکہ یہ قول سید صاحب کے حوالہ سے ہے، اس لئے اس پر شبہ ظاہر کرنا بھی درست نہیں۔تاہم جب خیال آتا ہے کہ علامہ شبلی کی تمام حیثیتوں میں سب سے بڑی اور بنیادی حیثیت مورخ اسلام کی ہے تو اس قول پر خود بخود شبہ ہونے لگتا ہے۔

سید شہاب الدین دسنوی کی کتاب ''شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں'' میں ڈاکٹر خلیق انجم کے مقدمہ کے ساتھ ان کا بھی پیش لفظ شامل ہے۔ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ اعتراض کیا تھا کہ علامہ شبلی پر جو رکیک اور ناروا اعتراضات ہوئے، ان کے معتقدین اور مداحوں اور تلامذہ نے ان کا جواب نہیں دیا۔سید صباح الدین صاحب اس کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی کے عزیز شاگردوں نے ان نکتہ چینوں کی تحریری جمناسٹک کے رد میں اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ان کے سکوت سے ان نکتہ چینوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ ان کی آبروریزی کی یہ مہم کامیاب رہی اور انھیں کی تقلید میں کبھی کبھی دوسرے نکتہ

چیں بھی اپنی بدنفسی کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ انہی باتوں سے آزردہ ہوکر سید شہاب الدین دسنوی نے زیر نظر کتاب مرتب کی ہے۔ ان کے تحقیقی مواد، مدلل، مہذب، مؤثر اور مربوط انداز بیان سے ظاہر ہوگا کہ انھوں نے مایہ ناز بزرگوں کی خوبیوں کے قدردانوں، ان کے رتبے اور عظمت پر فخر کرنے والوں اور ان کی عزت وآبرو کو اپنا سرمایہ زندگی سمجھنے والوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اب تک کردار کشی کا جو زہر پھیلایا گیا ہے اس کے لئے یہ کتاب تریاق ثابت ہوگی۔" (شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، ص: ۱۲-۱۳)

جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ علامہ شبلی کے دفاع میں محض ایک کتاب لکھنے کے سبب سید شہاب الدین دسنوی کی نہ صرف تعریف وتحسین کی گئی بلکہ انہیں انتظامیہ کا رکن نامزد کیا گیا اور پھر سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد انہیں ادارہ کا سکریٹری بھی نامزد کیا گیا۔ اگر آج سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم یا مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم زندہ ہوتے تو علامہ شبلی پر ۲۷ر کتابیں لکھنے اور شبلی شناسی کو ملک وبیرون ایک مستقل موضوع قرار دینے کے سبب ناچیز کے ساتھ کیا حسن سلوک کرتے۔ علامہ شبلی پر محض چند مضامین لکھنے پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے جس محبت وشفقت کا معاملہ کیا وہ منظر آج بھی نگاہوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ دبستان شبلی کے ان بزرگوں کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے۔ مقطعے میں اس سخن گسترانہ بات کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

علامہ شبلی نعمانی نے مستشرقین کے اسلام اور مسلمانوں پر الزامات کی تردید اور ان کے جوابات لکھنے کا کام مدۃ العمر انجام دیا۔ الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین سے سیرۃ النبی تک نہ جانے کتنے الزامات کی انہوں نے تردید کی۔ دراصل وہ اسلام کی عظمت پر کوئی داغ دھبہ برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے جہاں انہیں اسلام پر کوئی حملہ نظر آیا وہ اس کے دفاع کے لئے آگے آجاتے۔

علامہ کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ بھی یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین نے اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے ایک بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا تھا، جس میں دنیا بھر کے ممتاز اہل علم وقلم نے شرکت کی اور مقالات پیش کئے۔ چنانچہ اس موضوع پر ماہنامہ

معارف میں متعدد مقالات کے علاوہ سات جلدوں میں اس موضوع پر مقالات دارالمصنفین کی جانب سے شائع کئے گئے ہیں۔ اسلام اور مستشرقین کے حوالہ سے یہ بہت بڑا علمی ذخیرہ دار المصنفین نے فراہم کیا ہے۔ اس موضوع پر علامہ شبلی نے جو کچھ لکھا تھا اس کا بھی ایک مجموعہ شائع کیا گیا ہے۔ اسے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے بانی مولوی محمد شفیع کے لائق صاحبزادے مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی سابق رفیق دارالمصنفین نے مرتب کیا ہے۔ جس کی اشاعت سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا دیباچہ دارالمصنفین کے اس وقت کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے۔ اس کے مشمولات کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اس میں مولانا کی تصنیفات کے کچھ اقتباسات ہیں اور کچھ وہ مضامین ہیں جو ان کے مقالات کے مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کو ایک علاحدہ جلد میں شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے جوابات کا یکجا مطالعہ کرنے سے مستشرقین کی گمراہ کن تحقیقات واستدلالات کا صحیح اندازہ ہو جائے گا، یہ تحریریں بہت پہلے لکھی گئی ہیں، لیکن ان کی تازگی اور شادابی میں کوئی فرق نہیں ہوا ہے۔ یہ مولانا کی زبان اور طرز ادا کی خوبی ہے۔''
>
> (اسلام اور مستشرقین، ج ۴، ص: ج)

علامہ شبلی نعمانی کو اپنے عہد میں کن مستشرقین کا سامنا رہا اور ان کی کیا حیثیت تھی؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کے زمانہ میں دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ ڈاکٹر اسپرنگر اور یوپی کے گورنر سر ولیم نے ہندوستان میں یہ مہم چلا رکھی تھی، ہندوستان سے باہر ڈاکٹر جے اے مولر، ڈاکٹر ویل، وان کریمر، برتھالمی، رینان، سینٹ بلیر، نولدیکی، ولہاؤسن، گولڈزیہر وغیرہ یورپ میں اس قسم کی فتنہ انگیزیوں میں مشغول تھے اور جب انگلستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ اٹھے تو مصر وشام کے عیسائیوں نے بھی ان کی تقلید میں اس کام کو شروع کیا۔ جس میں سب سے زیادہ بدنام الہلال کا ایڈیٹر جرجی زیدان تھا۔'' (ایضاً، ص: الف)

ان کے مقابلہ کیلئے اسلام کی صف سے علامہ شبلی نعمانی نکلے۔اور بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن:

> ''مولانا شبلی نے شیر دل بن کر مستشرقین کی تدلیسات، تلبیسات، تحریفات، دوراز قیاسات، غلط قسم کی معلومات اور غیر مستند معلومات کی پردہ دری اچھی طرح کی۔''
>
> (ایضاً)

علامہ شبلی نعمانی نے مستشرقین کی مختلف قسمیں بتائی ہیں۔صباح الدین صاحب نے انہی کی تحریروں سے ان کی نشاندہی کی ہے۔علامہ شبلی نے ان کے اعتراضات کی جو بے وقعتی بتائی تھی اور ان کی ملمع سازیوں کی جو وضاحت کی تھی اس کی تفصیل لکھی گئی ہے۔ پھر سید صباح الدین صاحب نے آخر میں لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی نے ایسے حریفوں کے اعتراضات کے جوابات دینے میں طیش و غضب سے کام نہیں لیا، بلکہ بہت ہی ٹھنڈے طریقہ سے، عالمانہ اور محققانہ انداز میں ان کی تلبیسات، تدلیسات اور اعتراضات کا رد کیا ہے، جیسا کہ اس مجموعہ کے مضامین سے ظاہر ہوگا۔'' (ایضاً ص:ج)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ایک بہت ہی عمدہ کتاب ''ہندوستان: امیر خسرو کی نظر میں''، لکھی ہے جو ۱۹۶۶ء میں دارالمصنفین سے شائع ہوئی۔اس کے دیباچے کا آغاز علامہ شبلی کے ذکر سے ہوتا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی نہ صرف امیر خسرو کی شاعری کی جہاں گیری کے بڑے مداح تھے بلکہ ان کی وطنی رواداری اور محبت کو بھی اپنے ایک مقالہ ''مسلمانوں کی علمی بے تعصبی میں'' بڑی فراخ دلی سے دکھایا ہے۔اس مضمون میں انھوں نے امیر خسرو کی مثنوی نہ سپہر سے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں، راقم نے جب ان اشعار کو دیکھا تو خیال ہوا کہ امیر خسرو کے اس قسم کے تمام اشعار ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو ان کی وطنی محبت کی اور بھی زیادہ صحیح تصویر سامنے آجائے گی۔''
>
> (ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، ص:۱)

(۱۰۱)

پروفیسر آل احمد سرور

[۱۹۱۱-۲۰۰۲ء]

نامور ادیب اور نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے علامہ شبلی پر کئی مقامات پر اظہار خیال کیا ہے۔ ایک مضمون ''شبلی میری نظر میں''، ایک تبصرہ ''حیات شبلی'' اور ایک مقدمہ عبداللطیف اعظمی کی کتاب ''مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' پر لکھا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے علامہ شبلی کے کارناموں اور ان کے افکار کا جائزہ بڑی گہرائی اور بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے اور تقریباً تمام پہلوؤں پر بڑا منصفانہ تجزیہ کیا ہے۔ طویل مقدمہ کے چند خاص پہلوؤں اور سرور صاحب کی چند منفرد رایوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ مقدمہ کا آغاز ان لفظوں سے کرتے ہیں:

> ''شبلی پر لکھنے کے لئے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں، وہ ہماری ذہنی زندگی کے معماروں میں ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کے چالیس سال علمی کاموں میں بسر کئے انھوں نے بہت سے عملی کام بھی کئے اور ان میں کامیابی بھی حاصل کی مگر وہ محض اپنے عملی کاموں کی وجہ سے شاید اتنے مشہور نہ ہوتے اگر ان کاموں کے پیچھے ایک مسلسل، اہم اور پرزور علمی و ذہنی تحریک نہ ہوتی۔ مہدی افادی نے انھیں تاریخ کا معلم اول کچھ غلط نہیں کہا ہے۔ انھوں نے اردو میں تاریخی ذوق پیدا کیا، خود بڑی اچھی سوانح عمریاں اور تاریخیں لکھیں اور تحقیق و تدقیق واقعات کی چھان بین اور ماخذ کی تلاش اور تاریخ میں ایک صاف اور واضح نقطہ نظر ان سب کی اہمیت دکھائی اور جتائی۔ انھوں نے ادب، سیاست، تعلیم، مذہب، فلسفہ سب کو متاثر کیا اور سب پر اپنا کچھ نہ کچھ نقش چھوڑا۔ وہ بڑی جامع اور ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو متن کا دامن بہت وسیع کیا اور اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نظم میں بھی اپنی رنگینی، پرجوش اور مزے دار، سیاسی اخلاقی اور تاریخی نظموں سے ایک خوش گوار اضافہ کیا۔ ان کے

اسلوب میں ایک شگفتگی، بانکپن اور چستی ملتی ہے۔شبلی کے یہاں عالمانہ شان ہے
مگر خشکی نہیں،شبلی زاہد خشک نہیں تھے وہ شاعر بھی تھے۔"

(مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں،ص:۱-۲)

ایک زمانہ میں حالی وشبلی کا موازنہ عام بات تھی اور اس پر اہل قلم نے خوب طبع آزمائی کی۔کسی نے مولانا حالی کو بڑھایا تو کسی نے علامہ شبلی کو۔کسی نے مولانا حالی کی کسی خوبی کا ذکر کیا تو کسی نے علامہ شبلی کی عظمت بیان کی۔آل احمد سرور نے اسے ناپسندیدہ طرز عمل قرار دیا ہے۔اس کا آغاز مہدی حسن افادی کے مضمون 'حالی وشبلی کی معاصرانہ چشمک' سے ہوا۔سرور صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے اور پھر اسے نہ صرف غلط طرز عمل قرار دیا ہے بلکہ علامہ شبلی کے اقتباسات اور خیالات سے ان کے دل میں مولانا حالی کی جو عظمت تھی بیان کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی نے ان کی تمام تصانیف کی تحسین وستائش کی ہے۔سوا "حیات جاوید" کے۔اس میں بھی علامہ شبلی کو مصور پسند تھا،اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر ناپسند تھی۔(ایضاً ص:۴)

شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب "یادگار شبلی" میں علامہ شبلی کو سرسید کا حریف بنا کر پیش کیا ہے۔سرور صاحب نے ان کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

"ان حوالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر چشمک تھی تو سرسید اور شبلی کی تھی۔اس پر میں ذرا تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں،کیوں کہ شیخ اکرام نے شبلی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔انھوں نے سطح پر اختلافات کو دیکھا ہے اور یہ نظر انداز کر دیا ہے کہ اس کے وجوہ کس قدر گہرے،بنیادی اور اساسی تھے۔" (ایضاً ص:۵)

پھر انھوں نے مذکورہ بنیادی اور اساسی وجوہ کو قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"شبلی کو شبلی سرسید نے بنایا۔شبلی مغرب تک سرسید کے واسطے سے پہنچے۔سرسید کے کتب خانے،ان کی صحبت،علی گڑھ کی علمی صحبتوں اور آرنلڈ کی رفاقت نے شبلی کو ایک نیا ذہن اور ایک نیا مزاج دیا۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی سخت حنفیت سرسید کے اثر سے اعتزال اور عقلیت میں تبدیل ہوگئی لیکن ایک زمانہ وہ آتا ہے جب سرسید کی ذہنی قیادت پیر تسمہ پا کا کام کرتی ہے اور شبلی اس سے آگے

بڑھ جاتے ہیں۔ شبلی نے سر سید کی تعریف میں صبح امید لکھی لیکن ان کی سوانح لکھنے سے صاف انکار کردیا۔ پھر ان کے مرنے پر صرف اردو ادب پر ان کے احسانات بیان کئے اور کچھ نہ لکھا۔ حالی بھی ایک زمانے میں ''حیات جاوید'' لکھنے کا ارادہ ترک آ چکے تھے۔'' (ایضاً،ص:۵-۶)

مولوی عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ شبلی سر سید کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ انھیں خود قیادت کی ہوس تھی۔ اس کے بارے میں سرور صاحب نے لکھا ہے کہ

''میرا خیال ہے شبلی جس دبستان کے فرد تھے وہ سر سید سے متاثر ہونے کے باوجود سر سید کی ہر معاملے میں تقلید اور ہم نوائی نہیں کر سکتا تھا۔ شبلی محسن الملک نہ تھے جو سر سید کے سجادہ نشین ہونا چاہتے ہوں۔ وہ سر سید کے جانشین ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ بات یہ تھی کہ شبلی پرانے اسکول کا وہ ستارہ تھے جو اپنی فضا سے ٹوٹ کر سر سید کی دنیا میں پہنچ گیا تھا، مگر اپنی دنیا کی چیزیں بھی ساتھ لیتا گیا تھا۔ شبلی قدیم علوم کے فاضل تھے، سر سید نہ تھے۔ شبلی نے جس گہوارے میں تربیت پائی تھی وہ کچھ زیادہ سرکار پرست نہ تھا۔ سر سید مغرب و مشرق کے ملاپ کی خاطر سرکار پرست بنے تھے۔ یہ ان کا نئی نسل پر بہت بڑا احسان ہے۔ وہ اس دور کے بانی اور راہنما ہیں۔ ان کی تحریک سے ہماری مردہ زندگی میں کتنی زندگی پیدا ہوئی۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں، لیکن ۱۸۵۷ء اور ۱۸۸۷ میں کچھ فرق ہونا چاہئے تھا۔ سر سید کی سیاسیات اس فرق کو نمایاں کرنے کے خلاف تھے۔'' (ایضاً،ص:۶-۷)

آل احمد سرور صاحب نے سر سید اور شبلی کے مزاج اور فکر و نظر کے اختلاف کے طویل تجزیے کے بعد لکھا ہے کہ

''سر سید انگریزوں کے بڑے مداح اور انگریزی طریقہ حکومت کے بہت بڑے طرفدار تھے۔ شبلی انگریز پرستی سے چڑھتے تھے۔ سر سید کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی آخر عمر کی سیاست سے جب وہ بیک صاحب کے اشاروں پر حرکت کرتے تھے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ شبلی سر سید کی لائف اس لئے نہ لکھ سکتے تھے

کہ وہ سرسید سے کچھ آگے دیکھ رہے تھے۔ سرسید کا دور علی گڑھ تحریک کا پہلا دور ہے۔ شبلی کا دوسرا۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔''

شبلی نے علی گڑھ کو چھوڑا اور ندوے کی دنیا آباد کی۔ یہ محض خودسری نہ تھی ایک سنجیدہ مقصد اس کی تہہ میں تھا۔ (ایضاً، ص: ۷)

طویل تجزیے کے بعد سرور صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

''سرسید کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ علمی جدوجہد، تصنیف وتالیف، ذہنی قیادت، تہذیبی کوششیں، نئی نسل کے مقابلے میں شبلی اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے زیادہ ہوئیں، سرسید نئی نسل کو ہندوستان کی قیادت سپرد کرنا چاہتے تھے، یہ خیال غلط نہ تھا، لیکن انھوں نے نئی نسل کی صحیح تربیت پر توجہ نہ کی اور انھیں سرکاری ملازمت کی طرف ڈھکیل دیا۔ شبلی نئی نسل (انگریزی خواں طبقہ) سے مایوس تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر علماء کو حریت پسند اور روشن خیال بنایا جائے تو قوم کی وہ بہتر قیادت کرسکیں گے، خیال برا نہ تھا، لیکن علماء کی تنگ خیالی نے ندوے میں شبلی کو کامیاب نہ ہونے دیا۔'' (ایضاً، ص: ۹)

پھر سرور صاحب نے اثرات شبلی کا ذکر کیا ہے اور صراحت سے لکھا ہے کہ

''شبلی کا اثر اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ہوا۔ حالی نے اردو ادب کی دنیا بدل دی، مگر شبلی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی زندگی پر اثر ڈالا۔ انھیں اپنی چیزوں کی قدر کرنی سکھائی۔ انھیں ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک کے مسائل کو محسوس کرنے کا عادی بنایا۔ ان میں حقوق کی طلب اور خوشامدانہ سیاست سے بلندی پیدا کی۔ سید سلیمان، ابوالکلام، عبدالسلام ندوی، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، اقبال، سب پر سرسید سے زیادہ شبلی کا اثر ہے۔ اکرام نے یہ غلط نہیں لکھا ہے کہ نئی نسل سرسید سے زیادہ شبلی سے متاثر ہے۔ یہ اثر قدرتی تھا۔'' (ایضاً، ص: ۹)

بعد ازاں سرور صاحب نے سرسید اور سرسید تحریک اور علامہ شبلی کے غور وفکر کے انداز اور

طریقہ کا موازنہ کیا ہے۔ سرسید کے دور آخر کی سیاسی فکر کی وضاحت کی ہے اور ماحصل کے طور پر لکھا ہے کہ

''غالباً اب یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ شبلی کی تحریک سرسید کی ضد نہیں تھی بلکہ اس کے ایک خاص رجحان کی اصلاح کر کے اس کی روح کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔''

(ایضاً،ص:۱۱)

سرور صاحب نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ علماء نئے مسائل کو سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے اور انھوں نے علامہ شبلی کی روشن خیالی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ البتہ وہ نئی نسل جن سے علامہ شبلی خود مایوس تھے، اس نے علامہ شبلی سے زیادہ استفادہ کیا۔ وہ نئی نسل پر علامہ شبلی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی کے اثر سے نئی نسل میں اپنی تہذیبی میراث کا احترام آیا اور سستی مغربیت سے بیزاری۔ انھیں کے اثر سے مسلمانوں کی سیاست میں ترقی پسند اور حریت پسند عناصر پیدا ہوئے۔ انھیں کے اثر سے نیا نوجوان ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت کو خون کی ہولی سمجھنے کے بجائے اسے اصلی رنگ میں دیکھنے لگا۔ ان کی علمی تصانیف سے اس کے ذہن کو جلا ہوئی۔ ان کی نظموں کی چاشنی نے غیر محسوس طور پر اسے کچھ سیاسی اور سماجی قدریں عطا کیں۔ وہ انھیں کے سہارے ترکوں کے دکھ درد میں شریک ہوا۔ اسلام کی ابتدائی سادگی، خلوص اور جوش سے آشنا ہوا اور اپنے زمانے کے ہنگاموں اور معرکوں کو ایک بڑے سانچے اور ادارے کا جز بنا کر دیکھنے لگا۔ مسجد کان پور، شہر آشوب اسلام، ڈاکٹر انصاری کی واپسی، جنگ عظیم، لیگ سے خطاب، خطاب بہ احرار میں آج بھی وہی تازگی ہے جو ان کی تصنیف کے وقت تھی۔ سرسید کے جانشین مسلمانوں کو انگریز پرست بنا رہے تھے۔ شبلی نے انھیں روکا۔ شبلی کے بعد محمد علی، ابوالکلام اور اقبال نے نظم و نثر کے ذریعہ سے انگریز پرستی کا سد باب کیا اور آج چند ارباب غرض کے سوا مسلمانوں میں انگریز پرستی عام نہیں۔'' (ایضاً،ص:۱۱-۱۲)

اس طرح سرور صاحب نے انتہائی معروضی انداز میں سرسید اور شبلی کے متعلق تمام اعتراضات اور الزامات کا تجزیہ کر کے واضح کر دیا کہ علامہ شبلی علی گڑھ تحریک کے مخالف نہیں تھے بلکہ انھوں نے ایک نئے رجحان کے ذریعہ اس تحریک کی کمیوں کا ازالہ کیا۔ خاص طور پر سرسید کے آخری دنوں میں جوان کا سیاسی نقطۂ نظر تھا اس سے علامہ شبلی نے اختلاف کر کے جو نیا نظریہ پیش کیا وہ نہ صرف نئی نسل کے لئے بلکہ قومی مفادات کے تحفظ کے لحاظ سے بھی مفید تھا۔

سرور صاحب نے حالی و شبلی کی سوانح نگاری کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

"شبلی نے سوانح نگاری کے ان اصولوں پر اعتراض کیا تھا جو حالی نے برتے، حالانکہ شبلی نے جو سوانح عمریاں لکھی ہیں ان میں قریب قریب وہی اصول مدنظر رکھے گئے ہیں۔ شبلی حالی سے زیادہ تحقیق و تلاش، واقعات کی چھان بین، مواد کی ترتیب و تہذیب پر زور دیتے ہیں۔ حالی کے نزدیک شخص اہم نہیں تھا۔ ......سوانح نگار کی حیثیت سے وہ حالی سے بلند نہیں کہے جاسکتے، وہ حالی کی طرح غیر جانب دار اور غیر شخصی بھی نہیں کہے جاسکتے، ہاں حالی سے زیادہ تفصیل پیش کر سکتے ہیں اور زیادہ وسعت پیدا کر سکتے ہیں۔" (ایضاً ص:۱۲-۱۳)

شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ

"وہ بڑے اچھے محقق تھے اور خالص ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ اگر چہ شیرانی نے ان کی شعر العجم کی بعض غلطیوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور اگر چہ موازنہ انیس و دبیر دراصل موازنہ نہیں ہے مگر پھر بھی شبلی کے فیصلے اکثر و بیشتر صحیح اور ان کی تنقیدیں زیادہ تر پاکیزہ اور اچھے ادبی ذوق کی ترجمان ہیں۔" (ایضاً ص:۱۳)

خطوط شبلی کے بارے میں لکھا ہے کہ

"شبلی کے خطوط میں ان خطوط کو خواہ مخواہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے جو انھوں نے عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کو لکھے تھے۔ دراصل "مکاتیب شبلی" ان کی علمی و ادبی زندگی کی بہتر ترجمانی کرتے ہیں۔" (ایضاً ص:۱۴)

سرور صاحب نے مقدمہ کے آغاز میں حالی وشبلی کے موازنہ کو ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے اور مہدی افادی کے مضمون حالی وشبلی کی معاصرانہ چشمک پر بھی معترض ہیں، مگر انھوں نے خود حالی وشبلی کی شاعری کا موازنہ کیا ہے اور جن نقادوں نے علامہ شبلی کی شاعری کی برتری دکھلائی ہے، ان سب پر تنقید نہیں کی ہے بلکہ ان کے نقطہ نظر کو مسترد کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ لطیف طنزیہ نظمیں لکھنے کا سہرا مولانا شبلی کے سر ہے۔ یہ بات کسی طرح مانی جا سکتی ہے کہ حالی کی شاعری شبلی کی شاعری کے مقابلہ میں پھیکی اور کم رتبہ ہے اور یہ کہنا بھی خوش فہمی ہے کہ اگر شبلی اپنی تمام تر قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری کے لئے وقف ہو جاتے تو وہ اگر دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ شبلی کی شاعری جوان کی شگفتہ، لطیف اور رسا طبیعت کا کبھی کبھی کا ابال ہے اپنے رس اور شعریت کے ساتھ ساتھ اچھی اور صالح سماجی قدروں کی بھی علم برداری کرتی ہے۔ شبلی کے یہاں تغزل ہے اور یہ تغزل محض گل وبلبل کی حکایت یا جوانی دیوانی کی داستان کے لئے نہیں، ملک وقوم کے مسائل اور تاریخ کے اوراق کی تشریح کے لئے استعمال ہوا ہے۔'' (ایضاً، ص:۱۵)

آخر میں سرور صاحب نے علامہ شبلی کی معنویت اور علماء میں روشن خیالی کے خاتمہ پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ علماء میں شبلی جیسے روشن خیال اور دور بین اشخاص کم ہوئے ہیں۔ اس سے علماء کو بھی نقصان پہنچا ہے اور ہندوستان کو بھی اور اب شاید ہمیشہ کے لئے ہندوستان کی ذہنی زندگی کی قیادت ان سے چھن گئی۔'' (ایضاً، ص:۱۶)

پروفیسر آل احمد سرور نے نسبتاً علامہ شبلی پر کم لکھا ہے، چند مضامین، چند دیباچے، مگر جس قدر لکھا ہے وہ ان کے انتہائی گہرے مطالعہ شبلی اور شبلیات کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ دراصل وہ خود افکار شبلی سے بہت متاثر تھے۔

---

(۱۰۲)

مشتاق حسین

[٭٭٭]

مشتاق حسین مرحوم سابق اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ سرسید اور علامہ شبلی کے شیدائی تھے۔ پہلے سرسید احمد خاں کے نادر خطوط یکجا کر کے شائع کرائے۔ بعدازاں ''باقیات شبلی'' مرتب کی۔ جسے آزاد کتاب گھر دہلی نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ اس کا ایک ایڈیشن مجلس ترقی ادب لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کی وہ تحریریں یکجا کی گئی ہیں جو علامہ شبلی کے مقالات، خطبات، مکاتیب شبلی وغیرہ کی ۱۱ر جلدوں کے علاوہ دریافت ہوئی ہیں۔ یقیناً یہ شبلیات میں ایک اہم اضافہ تھا۔ اس کتاب پر مشتاق حسین نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ بھی کم اہم نہیں۔ اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی کے بارے میں آج سے پچیس تیس سال قبل مولوی عبدالحق صاحب کا یہ فقرہ موضوع بحث بنا ہوا تھا کہ ان کی کتابوں کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے۔ کسے معلوم تھا کہ آنے والا زمانہ خود اس نزاع کا اس طور پر فیصلہ کرے گا کہ پرستار حالی کو اپنے اس فقرے کے لئے طرح طرح سے معذرتی انداز اختیار کرنا پڑے گا۔ اس کی تصدیق کرنی ہو تو اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں مولوی عبد الحق کا شبلی پر مضمون اور رسالہ ادیب کے شبلی نمبر میں ان کا خط ملاحظہ کیا جائے۔''
>
> (باقیات شبلی، ص:۱۱)

مشتاق حسین صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ

> ''دراصل شبلی ہماری زبان کے ان ادیبوں میں سے ہیں جن کو پسند کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے لیکن ان کی شخصیت کو نظر انداز کر کے ہماری فکری اور تہذیبی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ بقول شخصے وہ اپنی جگہ پر خود ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ان پر تحقیق وتنقید، تجزیہ ومحاکمہ، تحسین وآفرین، اور

تنقیص وتعریض کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا بلکہ ان میں اضافہ کی گنجائش باقی رہے گی۔" (ایضاً ص:۱۲)

مقدمہ لکھتے ہوئے "باقیات شبلی" کے مرتب کو احساس تھا کہ علامہ شبلی کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ

"شبلی کی شخصیت میں جامعیت ہے۔ ان کے سماجی اور ادبی کردار پہلودار ہیں اور ان میں ایک طرح کی رنگا رنگی ہے۔ ہمارے تنقید نگار در اصل ان کی اس خصوصیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اس لئے یک طرفہ نتائج نکالتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی سیرت اور ان کے تصنیفی و علمی کاموں کے ہر گوشہ کو بے نقاب کیا جائے تا کہ ان کے ساتھ صحیح معنوں میں انصاف کیا جاسکے۔"

(ایضاً ص:۱۲)

علامہ شبلی کی عظمت و مقبولیت کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"ان کی سرشت میں قدرت نے اپچھ اور انفرادیت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی اور اپنی انفرادیت کی تشکیل و تعمیر ہی ان کی زندگی کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ شبلی کے یہاں کسی مرحلہ میں جمود اور سکون نہیں ملتا۔...........

ہاں یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان تمام شکوہ سرائیوں کے باوجود جو شبلی کو ابنائے زمانہ سے رہیں وہ اپنے عہد کے خوش قسمت افراد میں سے تھے۔ شبلی کی بارگاہ میں قدیم مکتبہ خیال سے تعلق اور شفقت رکھنے والا گروہ ہو یا جدید علوم و فلسفہ کا دلدادہ طبقہ، دونوں نے خراج عقیدت پیش کیا۔ شبلی کے علمی فضل و کمال کا اعتراف کیا۔ خدمات کو سراہا اور شبلی کی ہر آواز پر لبیک کہا۔

شبلی نے ہمارے اس علمی احساس کمتری کو جو یورپ کی بدولت ہم میں پیدا ہو گیا تھا دور کیا۔ تخلیق ہو یا تنقید، تحقیق ہو یا تذکرہ، ہر ایک کا معیار بلند کیا۔ شبلی علمی معیار و مذاق کی پستی دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔" (ایضاً ص:۱۳-۱۴)

---

(۱۰۳)

سید احتشام حسین

[۱۹۱۲-۱۹۷۲ء]

اردو کے نامور ادیب اور نقاد پروفیسر سید احتشام حسین نے اپنے شاگرد شہید صفی پوری کی کتاب ''انیس کی شاعری'' پر پیش لفظ لکھا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار اکتوبر ۱۹۶۵ء میں لکھنو سے شائع ہوئی تھی۔ اسے خود مصنف نے معمولی کتاب قرار دیا ہے، لیکن یہ واقعہ نہیں کتاب اچھی ہے۔ اور میر انیس کی شاعری کی تفہیم میں معاون ہے۔

علامہ شبلی کی موازنہ انیس و دبیر کی اشاعت کے بعد جس کو دیکھئے میر انیس، مرزا دبیر یا مرثیہ نگاری پر کتاب لکھنے کا خواہاں ہے۔ اس روش سے یہ فائدہ پہنچا کہ رثائی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ ہماری زبان میں آگیا۔ متعدد نقادوں نے اس ذخیرۂ ادب کا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ علامہ شبلی نے تفہیم انیس کو جہاں تک پہنچایا تھا معاملہ اس سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا ہے۔ زیر نظر کتاب کے مصنف کا بھی یہی خیال ہے۔ اور ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جس مرتبہ کا شاعر ہو اسی مرتبہ کا نقاد ہونا چاہئے۔ اس طرح کے بے تکے خیالات سے ہمارے ذخیرۂ ادب کو نقصان پہنچا۔

ڈاکٹر سید احتشام حسین نے اس کتاب پر لکھتے ہوئے گرچہ اپنے شاگرد کی تعریف و تحسین کی ہے، مگر وہ دبے لفظوں میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مطالعہ انیس میں معاملہ ابت تک علامہ شبلی سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ادبی شعور کا تقاضا یہ ہے کہ میر انیس کی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے۔ اس کے لئے ایک دو ناقدوں کے توجہ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مختلف الخیال ادیبوں اور نقادوں کو اپنے شعور اور اپنے علم کے آئینہ میں انہیں دیکھنا چاہئے۔ اس کی ابتدا آزاد، حالی اور شبلی سے ہوگئی تھی اور سچ یہ ہے کہ انہیں بزرگوں اور خاص کر علامہ شبلی کی توجہ سے صنف مرثیہ اور انیس دونوں کو ادبی نقطہ نظر سے دیکھنے کا رجحان پیدا ہوا، لیکن اب بھی ادب المراثی پر جو کام ہوا ہے اسے

ابتدائی سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔..........

مولانا شبلی نے میر انیس کو ایک کامل شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے کوشش کی۔اور اس طرح اپنے تنقیدی شعور ہی نہیں اپنے عہد کے مذاق سخن کا ایک نادر تحفہ پیش کیا لیکن اس وقت تک مراثی کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے وہ سوالات نہیں آئے تھے جنہیں بعد کے نقادوں نے اٹھایا۔''

(انیس کی شاعری،ص:ب،ج)

دوسرے نقادوں کی طرح سید احتشام حسین نے بھی کج مج بیانی سے کام لیا ہے۔آخر کی سطریں اس کی واضح مثال ہیں۔حقیقت یہی ہے کہ انیس اور مرثیہ کو علامہ شبلی نے جو وقار بخشا،ان کے بڑے بڑے ہم نوا نہ کر سکے اور آئندہ بھی توقع کم ہی ہے کہ اس میں کوئی مثبت تغیر ہوگا۔

---

(۱۰۴)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

[۱۹۱۲-۲۰۰۵ء]

ڈاکٹر سید یحیٰ احمد ہاشمی [۱۹۲۵-۱۹۹۵ء] سابق صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی حیدر آباد سندھ علامہ شبلی کے شیدائیوں میں سے تھے۔انھوں نے ''شبلی کا ذہنی ارتقاء'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی تھی۔ان کے ادبی وتنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''ادبی آئینے'' جون ۱۹۷۴ء میں مکتبہ شاہد کراچی سے شائع ہوا ہے۔اس میں علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر وفن پر کئی اہم مقالات شامل ہیں۔اس کا دیباچہ ماہر تعلیم،ماہر لسانیات اور ۸۰ر سے زاید علمی وتحقیقی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے لکھا ہے۔وہ سید یحیٰ احمد ہاشمی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی ان کا خاص موضوع ہے اور ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ مولانا شبلی کا ذہنی ارتقا اپنی جامعیت کے لحاظ سے اس قدر اہم ہے کہ شاید ایک عرصے تک اس پر اضافہ نہ ہو سکے۔خدا کرے کہ وہ مقالہ بھی جلد شائع ہو جائے اور علمی دنیا کو اس

سے استفادے کا موقع ملے۔'' (ادبی آئینے، ص: د)

ادبی آئینے میں علامہ شبلی سے متعلق درج ذیل مضامین شامل ہیں:

(۱) حیات شبلی (۲) شبلی کے قصائد کا تاریخی جائزہ (۳) شبلی کی قومی شاعری (۴) مولانا شبلی اور ترکی (۵) شبلی ایک انگریز مخالف (۶) مولانا شبلی کا مجوزہ دار العلوم

ان کا (Ph.D) کا مقالہ ''شبلی کا ذہنی ارتقاء'' کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں بھی علامہ شبلی کے شیدائیوں میں تھے۔ ان کا جہاں ذکر کیا ہے ادب واحترام سے کیا ہے۔

---

(۱۰۵)

رئیس احمد جعفری

[۱۹۱۲-۱۹۶۸ء]

مولانا رئیس احمد جعفری ندوہ کے فاضل تھے۔ کثیر التصانیف اور انتہائی زود نویس تھے۔ بے شمار کتابیں اور مضامین ومقالات حتیٰ کہ افسانے اور متعدد ناول لکھے۔ خوارزم شاہ، احمد ایاز، احمد شاہ ابدالی، شہاب الدین غوری، تغلق، اورنگ زیب عالم گیر، چنگیز خاں، غدر، قیامت، دل، درد، عورت، نفرت، جدائی، عشق، مفرور، یورش، طوفان، فرخندہ، شکاری، ساتھی، کشکول، جال، پاگل، سوداگر، بدنام، نوشابہ، غم آرزو، دوست، رند پارسا، گناہ، سیما، رابعہ، تاجنا، ہچکولے، روسیاہ، جواری، باغی، مجاہد، حق و باطل، نازو، فاخرہ، سہیلہ، اندھا، آندھی اور چراغ، دام خیال، دل کے آنسو، اسی کا نام دنیا ہے، ان کے ناولوں کے نام ہیں۔

رئیس جعفری صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مختلف میدانوں میں ان کا قلم یکساں چلتا ہے۔ وہ عرصہ تک ماہنامہ ریاض کراچی اور ثقافت لاہور کے مدیر رہے۔ اور بڑی خوبی سے انہیں جاری رکھا۔

سیرت مولانا محمد علی، علی برادران، اقبال اپنے آئینے میں، حیات محمد علی جناح، اقبال اور

عشق رسول، گل کدہ، دید وشنید، تاریخ تصوف اسلام، مقالات محمد علی، خطبات محمد علی، مطائبات محمد علی، اوراق گم گشتہ، اسلامی جمہوریت، اقبال اور سیاست ملی، اقبال امام ادب، سیاست شرعیہ، واجد علی شاہ اوران کا عہد، انوار اولیاء، حکایات اغانی، امامت وسیاست، کاروان گم گشتہ، روایات وحکایات، تاریخ دولت فاطمیہ، اسلام کے غازی یورپ میں، ان کی بڑی عمدہ کتابیں ہیں۔ان سے ان کی متنوع فکر ونظر کا انداز لگایا جاسکتا ہے۔

ان کی ایک اور کتاب ''ائمہ اربعہ'' ہے۔ظاہر ہے اس میں ائمہ اربعہ کے حالات وسوانح اور ان کے افکار نظریات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ائمہ اربعہ پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ان میں علامہ شبلی کی مشہور زمانہ کتاب ''سیرت النعمان'' بھی شامل ہے۔اس کے بارہ میں مولانا رئیس احمد جعفری نے لکھا ہے کہ

> ''اردو زبان فرداً فرداً ان ائمہ کے حالات وسوانح سے تہی دامن نہیں ہے۔مولانا شبلی نے سیرت النعمان لکھ کر حق ادا کر دیا ہے۔اور کوئی شبہ نہیں تحقیق وتدقیق کے اعتبار سے یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔لیکن جہاں پھول ہیں وہاں کانٹے بھی ہیں۔اختلافی مباحث بھی آئے ہیں اوران میں تلخی بھی ہے۔'' (ائمہ اربعہ،ص:۵)

چنانچہ انہوں نے کتاب میں جابجا ان پھولوں اور کانٹوں کی نشاندہی کی کوشش کی ہے۔ اور تلخی تصنیف کم کرنے کے بجائے بعض مقامات پر بڑھادی ہے۔مگر ہمارا وہ موضوع نہیں۔ہم تو بس یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ برصغیر کا کوئی بڑے سے بڑا اہل قلم ایسا نہیں جس کی گردن شبلی کے بار احسان سے دبی نہ ہو۔انہیں میں ایک مولانا رئیس احمد جعفری ندوی بھی ہیں۔

عطیہ فیضی نے ''شبلی اور خاندان فیضی'' کے عنوان سے انگریزی میں جو مضمون Mirur میں لکھا تھا اس کا اردو ترجمہ مولانا رئیس احمد جعفری ہی نے کیا تھا اور جو ان کے مجموعہ مضامین ''گل کدہ'' میں شامل ہے۔

لکھنو سے مولانا حامد علی ندوی نے جو ماہنامہ ''خضرراہ'' جاری کیا تھا مولانا رئیس احمد جعفری بھی اس کی ادارت میں شامل تھے اور علامہ شبلی پر مضمون بھی لکھا تھا۔

کتابیات

کتب

- آپ بیتی۔ خواجہ حسن نظامی، حلقۂ نظام المشائخ دہلی، ۱۹۲۲ء
- آپ بیتی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، مکتبہ فردوس لکھنؤ، ۱۹۷۹ء
- آثار شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
- آسودگان ڈھاکہ۔ حکیم حبیب الرحمٰن۔ ڈھاکہ۔ ۱۹۴۶ء
- آغاز اسلام۔ (ترجمہ بدء الاسلام) میمونہ سلطان شاہ بانو، مطبع سلطانی بھوپال، ۱۹۱۵ء
- ابن رشد۔ مولانا محمد یونس فرنگی محلی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۲۴ء
- ابوبکر شبلی۔ مولوی عبدالحلیم شرر، دلگداز پریس، لکھنو ۱۹۲۶ء
- اتالیق خطوط نویسی حصہ دوم۔ خواجہ حسن نظامی، درویش پریس دہلی، ۱۹۱۶ء
- اختر اقبال۔ بیگم سلطان جہاں، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۱۴ء
- ادب اور حقیقت۔ انجم اعظمی، کراچی اشاعت گھر، ۱۹۷۹ء
- ادبی آئینے۔ ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی، مکتبہ شاہد کراچی، ۱۹۷۴ء
- اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ، حصہ اول۔ عبدالشکور، شاہ اینڈ کمپنی آگرہ، ۱۹۵۱ء
- اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ، حصہ دوم۔ عبدالشکور، ادارہ فروغ اردو لکھنو، ۱۹۵۶ء
- اردو میں تحقیق۔ مالک رام، جمال پرنٹنگ پریس دہلی
- اردو نثر کے نمونے۔ محمد طاہر فاروقی، آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ، ۱۹۴۷ء
- ارمغان حرم۔ اقبال احمد خاں سہیل، مرکز ادب جہاں گیر آباد پیلس لکھنو، ۱۹۶۰ء
- اسلام اور عربی تمدن۔ شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۲ء

- اسلام اور مستشرقین جلد چہارم، عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء
- اسلام اور مستشرقین جلد ہفتم، مولانا محمد عارف عمری، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۸ء
- اسلامی کتب خانے۔ مترجمہ اختر جونا گڑھی، الناظر پریس لکھنو۔۱۹۳۲ء
- اسلامی نظام تعلیم۔ سید ریاست علی ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء
- اسوۂ صحابہ (اول و دوم) مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳۔۱۹۹۰ء
- اشاریہ معارف۔ محمد سہیل شفیق، قرطاس کراچی، ۲۰۰۶ء
- اصح السیر۔ مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری، مطبع ستارۂ ہند کلکتہ، ۱۳۵۱ء
- اصلاحات غالب۔ مولوی حیدر علی نظم طباطبائی، مرتبہ مولانا محمد عبدالرزاق راشد، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد، ۱۹۶۶ء
- افادات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۲۲ء
- افادات مہدی۔ بیگم مہدی افادی، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع سوم، ۱۹۳۹ء
- اقبال اور دبستان شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، 2015ء
- اقبال یار جنگ علمی و سماجی خدمات حصہ اول، نواب سید تاج الدین، حیدرآباد، ۱۹۷۰ء
- الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی۔ علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۱۴ء
- البرامکہ۔ عبدالرزاق کان پوری، نامی پریس کان پور
- التربیۃ الاستقلالیہ۔ مولانا عبدالسلام ندوی، مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۲۶ء
- الجزیہ۔ مولانا سعید انصاری، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
- الفاروق۔ علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء
- الفہرست۔ محمد سجاد مرزا بیگ، نظام دکن پریس حیدرآباد
- القول الاظہر ترجمہ الفوز الاصغر۔ حکیم محمد محسن فاروقی، مطبع مسلم یونیورسٹی پریس، ۱۹۱۹ء
- المامون۔ علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء
- المیزان۔ سید نظیر الحسن فوق، مطبع فیض عام علی گڑھ، ۱۹۱۴ء
- امام رازی۔ مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء

- انتخابات شبلی۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ،طبع جدید ۲۰۰۷ء
- انتخاب مکاتیب سرسید۔شبلی اور اقبال، شیخ عطاء اللہ، قومی کتب خانہ لاہور، ۱۹۵۸ء
- انشائے ماجدی۔مولانا عبدالماجد دریابادی، ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ، ۱۹۹۱ء
- انیس کی شاعری، شہید صفی پوری، سرفراز قومی پریس لکھنو، ۱۹۶۵ء
- اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر۔علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء
- اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر۔علامہ شبلی نعمانی، مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور
- ائمہ اربعہ۔رئیس احمد جعفری، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۸ء
- ایشیائی شاعری۔مولوی امجد علی اشہری، مطبع آگرہ اخبار، آگرہ، طبع دوم
- باقیات شبلی۔مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر دلی، ۱۹۶۴ء
- برید فرنگ۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء
- بزم تیموریہ۔سید صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء
- پیام کیف۔مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۴۰ء
- تابش سہیل۔افتخار اعظمی۔مرکز ادب، جہاں گیر آباد، لکھنو۔۱۹۵۸ء
- تاثرات۔ملا واحدی، ہمدرد اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء
- تاریخ التاریخ۔مولوی سید محمد مرتضی، وکیل ٹریڈنگ کمپنی، امرت سر، ۱۹۱۱ء
- تاریخ التمدن الاسلامی (اول تا سوم)۔جرجی زیدان، الہلال مصر، ۱۹۰۴ء
- تاریخ فقہ اسلامی۔مترجم مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۱ء
- تجلیات۔پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، مرتبہ ظہیر احمد صدیقی، آزاد کتاب گھر دہلی
- تذکرہ گلشن ہند۔مرزا علی طلف، علامہ شبلی نعمانی، رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور، ۱۹۰۶ء
- تذکرہ گلشن ہند۔مرزا علی طلف، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۶ء
- تذکرہ مولوی محمد مرتضی صاحب، نصیرالدین ہاشمی، حیدرآباد
- تصانیف شبلی کے تراجم۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۲۱ء
- تمدن عرب۔مترجمہ سید علی بلگرامی، اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد، طبع دوم

- تنقید شعر العجم۔ حافظ محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۴۲ء
- ثلاثہ غسالہ۔ حکیم حبیب الرحمٰن، مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا، ۲۰۱۹ء
- چمنستان ادب۔ حامد حسن قادری و محمد طاہر فاروقی، خواجہ الطاف حسین اینڈ کمپنی آگرہ
- چند تنقیدیں۔ مولانا ریاست علی ندوی، بہار اردو اکادمی پٹنہ، ۱۹۸۸ء
- چند ہم عصر۔ مولوی عبد الحق، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۲۰۱۵ء
- حرف واثر۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۲۲ء
- حضرت خواجہ حسن نظامی۔ ملا واحدی، نظام المشائخ دہلی۔
- حواشی ابوالکلام آزاد۔ سید مسیح الحسن، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۸ء
- حیات انیس۔ مولوی سید امجد علی اشہری، آگرہ اخبار آگرہ، ۱۹۰۷ء
- حیات النذیر۔ سید افتخار عالم مارہروی، شمسی پریس دہلی ۱۹۱۲ء
- حیات سلیمان۔ شاہ معین الدین احمد ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء
- حیات شبلی۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء
- حیات مالک۔ مولانا سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۱۷
- خان بہادر سید اولاد حیدر فوق بلگرامی۔ سید مہدی رضا بلگرامی، حرا پبلی کیشنز دہلی
- خطبات شبلی نو دریافت۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۲۱ء
- خطوط شبلی۔ امین زبیری، ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال
- خیالات عزیز۔ دیانراین نگم، زمانہ پریس کان پور، ۱۹۱۲ء
- دار المصنفین کی تاریخی خدمات۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، خدابخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۱ء
- دعوت اسلامی۔ پروفیسر آرنلڈ، مترجم محمد عنایت اللہ، پنجاب، ۱۹۷۲ء
- دیوان محوی۔ مولوی مسعود علی محوی، مرتبہ رشید احمد، سجاد پریس حیدر آباد، ۱۹۴۷ء
- دیوان نوشاد۔ راجہ نوشاد علی خاں، مرتبہ راجہ محمد اعجاز رسول، نامی پریس لکھنو، ۱۹۲۰ء
- رقعات عبد الحق۔ بدر منیر الدین، خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۰۴ء
- روح تنقید۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد، ۱۹۳۱ء

- سفینہ شیخ علی حزیں۔ بہ نشر و تہذیب مولوی مسعود علی محوی، دار الطبع جامعہ عثمانیہ، ۱۹۳۰ء
- سوانح ابن تیمیہ۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، مکتبہ اردو، لاہور
- سوانح عمری خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی، ۱۹۵۷ء
- سوانح عمری شہزادی زیب النساء۔ مفتی انتظام اللہ شہابی، مرتضائی پریس آگرہ
- سیاحت قسطنطنیہ۔ مسز جیار جینا مکس ملر، مترجمہ خواجہ سید رشید الدین مودودی، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۰۲ء
- سید احمد مرتضیٰ نظر۔ ڈاکٹر لبنیٰ ادریس، بھوپال، ۲۰۱۵ء
- سیرۃ العباس حصہ اول۔ مولوی سید فرید عباسی، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۲ء
- سیرۃ النبیؐ (اول تا ششم)، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء
- سیرت عمر بن عبد العزیز۔ مولانا عبد السلام ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء
- سیرت مصطفےٰ۔ سلطان جہاں بیگم، مطبع سلطانی بھوپال، ۱۹۱۹ء
- شاہ معین الدین احمد ندوی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء
- شبلی اور جہان شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء
- شبلی بحیثیت سیاست داں۔ اختر وقار عظیم، سنگ میل پبلی کیشن لاہور، ۲۰۱۶ء
- شبلی بحیثیت مورخ۔ اختر وقار عظیم، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۹ء
- شبلی خود نوشتوں میں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۸ء
- شبلی شناسی کے اولین نقوش۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء
- شبلی شناسی کے سو سال۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
- شبلی کے مکتوب الیہ۔ اکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۲۲ء
- شبلی کے نام اہل علم کے خطوط۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
- شبلی مکاتیب شبلی کی روشنی میں۔ معین الدین انصاری، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۷ء
- شذرات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
- شعر العجم (اول تا پنجم) علامہ شبلی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۸ء

- شعر العجم فی الہند۔ شیخ اکرام الحق، شعبہ اشاعت الاکرام ملتان، ۱۹۶۱ء
- شعر الہند اول۔ مولانا عبد السلام ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء
- شعر الہند دوم۔ مولانا عبد السلام ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۷ء
- صاحب المثنوی۔ قاضی تلمذ حسین، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء
- صحیفہ محبت۔ پروفیسر محمود الٰہی، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۶۴ء
- صدیق اکبر۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ندوۃ المصنفین دہلی۔
- صولت شیر شاہی۔ سید احمد مرتضیٰ نظر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۳۴ء
- عطر سخن۔ سید یوسف حسین، چھپرا ضلع سارن، بہار ۱۹۳۰ء
- عظمت رفتہ۔ ضیاء الدین احمد برنی، ادارۂ علم وفن کراچی، ۲۰۰۰ء
- عظمت کے نشاں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، طبع دوم ۲۰۱۰ء
- عفت المسلمات۔ بیگم سلطان جہاں، مفید عام اسٹیم پریس آگرہ، ۱۹۱۸ء
- عکس واثر۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
- علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا، ۲۰۲۱
- علم الاقتصاد۔ علامہ اقبال، اقبال اکادمی کراچی، طبع دوم
- علم الکلام اور الکلام۔ علامہ شبلی نعمانی، دوست ایسوسی ایٹس اردو بازار لاہور، ۲۰۰۳ء
- غبار خاطر۔ مولانا ابو الکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۱۹۹۹ء
- فہرست مخطوطات اردو جلد اول، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، رضا لائبریری رامپور، ۲۰۱۳ء
- کارنامہ پہلوی۔ سید محمد حسن بلگرامی، نظامی پریس لکھنو
- کاروان حسرت۔ حسرت شروانی، ادارہ علمیہ علی گڑھ ۱۹۴۳ء
- کتابیات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۱
- کلیات شبلی اردو۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۷ء
- کلیات شبلی فارسی۔ علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء
- کلیات عزیز، خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی، نامی پریس لکھنو، ۱۹۳۱ء

- گلدستہ ادب۔ منوہر لال زتشی، انڈین پریس الہ آباد، ۱۹۳۳ء
- گلہائے داغ۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، مکتبہ عارفین ڈھاکہ، ۱۹۵۷ء
- مآثر امام اعظم۔ حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی، مکتبہ مدینۃ العلم بدر الاسلام، شاہ گنج، ۱۹۹۳ء
- مآثر صدیقی (اول تا چہارم)۔ نواب سید علی حسن خاں، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۲۴ء
- مآل ومشیت۔ صاحبزادہ ظفر حسین خاں، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۳ء
- متعلقات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء
- مجموعہ کلام اردو حضرت مسعود علی محوی۔ حبیب احمد صدیقی، کاشانہ حمیدہ، کراچی، ۲۰۰۳ء
- مجموعہ کلام شبلی۔ ظفر الملک علوی، الناظر پریس لکھنؤ، ۱۹۱۸ء
- مجموعۂ کلام شبلی۔ مرغوب ایجنسی لاہور۔
- مجموعۂ نظم شبلی۔ قربان علی بسمل دہلوی، شاہ جہانی پریس دہلی، ۱۳۴۸ھ
- مراسلات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء
- مرقع ادب، حصہ دوم۔ صفدر مرزاپوری، صدیق بک ڈپو لکھنو، ۱۹۲۷ء
- مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین ۲۰۲۱
- مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، مولانا محمد عمران خاں، لکھنو ۱۹۴۶ء
- مشاہیر نسواں۔ مولوی محمد عباس، کارخانہ پیسہ اخبار لاہور ۱۹۰۲ء
- مصباح القواعد۔ مولوی فتح محمد خاں جالندھری، عطر چند کپور اینڈ سنس لاہو، ۱۹۲۹ء
- مطالعات ومشاہدات۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۰
- معارف شبلی۔ ڈاکٹر سہیل شفیق، قرطاس کراچی، ۲۰۱۶ء
- مقالات سلیمان اول۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء
- مقالات شبلی اول تا ہشتم۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ
- مقامہ روسو۔ صاحبزادہ ظفر حسین خاں، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۲۴ء
- مقدمات عبد الحق۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، دپبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۳ء
- مکاتیب امیر مینائی۔ احسن اللہ خاں ثاقب، مکتبہ ادبیہ لکھنو، ۱۹۲۴ء

- مکاتیب جمیل۔ ربیعہ سلطانہ، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۶ء
- مکاتیب سلیمان۔ مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبہ چراغ لاہور، مئی ۱۹۵۴ء
- مکاتیب شبلی (اول ودوم) مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰۔۲۰۱۲
- مکاتیب مہدی افادی۔ مہدی بیگم، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو۔۱۹۸۲ء
- مکتوبات امجد۔ نصیر الدین ہاشمی، شمس المطابع حیدرآ دکن، ۱۹۶۷ء
- مکتوبات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۲۱ء
- موازنہ انیس ودبیر۔ علامہ شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء
- موازنہ انیس ودبیر۔ علامہ شبلی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۲ء
- موازنہ انیس ودبیر۔ مطالعہ، محاسبہ، تقابل، ڈاکٹر ارشاد نیازی، دہلی، ۲۰۰۰
- مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، دارالنوادر لاہور، ۲۰۰۵ء
- مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ عبداللطیف اعظمی، شبلی اکادمی دہلی، ۱۹۴۵ء
- مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عہد حاضر۔ ہارون اعظمی، مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی، ۲۰۰۹ء
- مولوی عبدالحق کی ادبی ولسانی خدمات، ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۹۲ء
- مہدی حسن افادی، عبدالقوی دسنوی، نسیم بک ڈپو لکھنو۔ جنوری ۱۹۷۷ء
- میخانہ۔ عطر کپور اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۲۶ء
- نالہ شبلی۔ محمود احمد عباسی، مطبع احمدی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۱۳ء
- نذر عقیدت۔ مولوی مسعود علی محوی، حیدرآباد
- نظام الملک طوسی۔ عبدالرزاق کان پوری، نامی پریس کان پور۔
- نقد الادب۔ حامد اللہ افسر۔ نول کشور پریس لکھنو، ۱۹۳۳ء
- نقوش زندگی۔ مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اعظم گڑھ
- نقوش شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۲۰ء
- نقوش وافکار۔ مجنوں گورکھپوری، ادارہ فروغ اردو لکھنو، ۱۹۵۵ء

- نواب زیب النساء بیگم، حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی، ہندوستانی اسٹیم پریس لاہور، ۱۹۱۳ء
- نوائے حیات۔ یحییٰ اعظمی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء
- نوائے عصر۔ یحییٰ اعظمی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء
- واقعات انیس۔ احسن لکھنوی، اردو پبلشرز لکھنو، ۱۹۷۵ء
- وقائع عالم گیر۔ چودھری نبی احمد سندیلوی، نیشنل پریس الہ آباد،
- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۷ء
- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین اعظم گڑھ
- ہندوستان کی قدیم اصلامی درس گاہیں۔ مولوی ابوالحسنات ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع اول۔ ۱۹۲۲ء
- یادایام۔ مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی، ادارہ انیس اردو الہ آباد، ۱۹۵۹ء
- یادایام۔ عبدالرزاق کانپوری، حالی اکیڈمی حیدرآباد، ۱۹۴۶ء
- یادرفتگاں۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء
- یگانۂ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

رسائل:

- البصیر۔ چنیوٹ (شبلی نمبر) مدیر عبیداللہ خاں، ۱۹۵۷ء
- ادیب۔ علی گڑھ (شبلی نمبر) مدیر ڈاکٹر ابن فرید، ستمبر ۱۹۶۰ء
- اسلام اور عصر جدید۔ دہلی (شبلی نمبر) مدیر پروفیسر اختر الواسع، جولائی ۲۰۰۸ء
- صبا، حیدرآباد۔ (شبلی نمبر) مدیر سلیمان اریب، ۱۹۵۸ء
- بازیافت لاہور (۲۷) شبلی نمبر ۲۰۱۵ء مدیر: ڈاکٹر محمد کامران
- صحیفہ لاہور (شبلی نمبر)۔ مدیر افضل حق قرشی، ۲۰۱۴ء
- ماہنامہ دلگداز لکھنو، دسمبر ۱۹۱۶ء
- ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء، اکتوبر ۱۹۳۴ء

•••

ASRAT-E-SHIBLI

Vol. 1

Dr. Mohammad Ilyas Azmi

ADBI DAIRA
AZAMGARH
E-mail: azmi408@gmail.com
Mob.: +91-9838573645

Price : 400/-